اونچی اڑان

قاسم علی شاہ


انتساب
ای جی کے نام

فہرست مضامین

عرضِ مصنف

اقبال نے اونچی اُڑان کی بات کی ہے۔ اڑان کا مطلب ہے، آگے بڑھنا، ترقی کرنا، کامیابی پانا۔ انگریزی کا مقولہ ہے، .Sky is the limit یعنی آسمان تک جانا ہے، صرف زمین پر رہنا کیا کمال ہے۔ یہاں آسمان پر جانے سے مراد اپنے کام میں جو بھی آپ کرتے ہیں، جو آپ کے اندر کی آواز ہے، جس مقصد کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے آپ کو پیدا کیا ہے، اسے اس کی آخری حد تک لے جانا۔ تو پھر، ہم جب زندگی میں کامیابی کی بات کرتے ہیں تو ہمارے لیے اُڑان کوئی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ اونچی سے اونچی اڑان ہونی چاہیے، حتیٰ کہ ہم اپنے کام کی معراج کو پہنچ جائیں۔

میں جب اس بات پر غور کرتا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھ میں اتنی اہلیت نہ ہونے کے باوجود کیوں اونچی بلکہ انتہائی اونچی اُڑان عطا فرمائی تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے میرے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تین سنتوں کی برکت وفیض ہے۔ میں نے جو بھی کام کیا، اس میں ان تین باتوں کا خیال ضرور رکھا۔

اول، ہمیشہ سچ بولا۔ میرے بڑے مجھے ہمیشہ یہ نصیحت کرتے تھے کہ ہمیشہ سچ بولنا۔ میں نے اس نصیحت پر ہمیشہ عمل کیا۔ آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم ہے، ''انسان سچ بولتا رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں 'صدیق' (سچا) لکھ دیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ بولتا رہتا ہے، حتیٰ کہ اسے 'کذاب' (جھوٹا) لکھ دیا جاتا ہے۔''

دوم، میں نے ہمیشہ دیانت اختیار کی۔ جو کام کیا، اسے پوری خلوص اور دیانت کے ساتھ۔ کاموں کو انجام دینے میں پوری کوشش صرف کی۔ اور تیسرا نکتہ خوش اخلاقی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش اخلاق انسان کے بارے میں فرمایا کہ جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں، وہ تم میں سب سے اچھا ہے۔ میں جس سے بھی ملتا ہوں، اس سے اس طرح ملنے کی کوشش کرتا ہوں، گویا برسوں کے یارانے ہیں۔ خدا کرے، یہ اُڑان پائندہ و تابندہ رہے اور میرے ملک و مذہب کے نوجوان اس اُڑان سے اپنی اڑان کیلئے بھی کچھ رہنمائی لے لیں۔ یہ کتاب، اس جانب چھوٹی سی کاوش ہے۔

قاسم علی شاہ

عرضِ ناشر

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "خیر الناس من ینفع الناس" لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جس سے لوگوں کو نفع اور فائدہ پہنچے۔ دنیا میں کسی کو فائدہ پہنچانے کی بہت سی شکلیں ہیں جن میں علم، شعور، بصیرت، مال و متاع، کرنسی، زمین، پلاٹ، کپڑے اور غذائی اشیاء سرفہرست ہیں۔

آپ میری اس بات کی تصدیق کریں گے کہ نفع اور فائدے کی ان سب شکلوں میں علم، حکمت، شعور و بصیرت سب سے زیادہ اہم ہے۔ اور یہ آج ہمارے معاشرے کی ضرورت بھی ہے۔ قاسم علی شاہ صاحب نے یہی بیڑا اٹھایا ہوا ہے کہ وہ قوم کے نوجوانوں کے لیے اس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ تعلیم کے جس شعبے کو لے کر چل رہے ہیں اس کا تعلق انسانوں کی مہارتوں اور سکلز سے ہے کہ اس میں جہاں نوجوان فہم و فراست سے مالا مال ہوتے ہیں وہیں وہ اپنی معاشی اور انتظامی صلاحیتوں کو پروان چڑھا کر خوشحال بھی ہو رہے ہیں۔ گویا فائدے اور نفع کی کئی ایک شکلیں ان کے کام کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔

شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ جو کہتے ہیں، کرتے بھی ہیں وہ جن اصولوں کے داعی ہیں ان پر عمل پیرا بھی ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت ان تضادات سے پاک ہے عموماً ہمارے ہاں جس کا شکار بہت سی مشہور اور نامور شخصیات ہوتی ہیں۔ آپ میری بات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن میرا مشاہدہ اور تجربہ یہی ہے۔

ان کی تعلیمی و تربیتی سرگرمیاں ایک ایسا چراغ بن چکی ہیں جو ہر سو روشنی پھیلا رہی ہیں۔ ان کی تحریریں، تقریریں اور کتابیں اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں موجود ان کی یہ کتاب ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس کے بارے میں اصل فیصلہ تو آپ ہی کا حق ہے لیکن میری رائے ان کے ان مضامین کے متعلق یہ ہے کہ ان کے ذریعے آپ کا ظاہر و باطن دونوں ہی متاثر ہوتے ہیں اور آپ "خیر الناس من ینفع الناس" کی ایک عملی تصویر بن جاتے ہیں۔

محمد عباس شاد

یونیورسٹی سے قاسم علی شاہ اکیڈمی تک

''جہاں مشقت نہیں، وہاں کامیابی نہیں!''
فریڈرک ڈگلس

جن دنوں میں پری انجینئرنگ کا طالب علم تھا، امتحانات سے تقریباً چھے ماہ پہلے اکتوبر کے مہینے میں میرے پاس ایک اسٹوڈنٹ آیا جس کا نام خرم شہزاد تھا (جو اس وقت پنجاب یونیورسٹی، کیمیکل انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں پروفیسر ہیں)۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ قاسم صاحب، مجھے آپ سے فرسٹ ایئر کا میتھ پڑھنا ہے۔ کیا آپ مجھے یہ پڑھا دیں گے؟ میں ان دنوں فارغ تھا، میں نے ہامی بھرلی۔ پھر ان سے کہا کہ میں خود بھی اکیڈمی جاتا ہوں، اکیڈمی جانے سے پہلے آپ میرے پاس آجایا کریں۔ یوں وہ اسٹوڈنٹ میرے پاس پڑھنے لگا۔ ایک مہینہ گزرنے کے بعد اس نے کہا کہ مجھے مزید پڑھا دیں۔ میں نے مزید ایک ماہ پڑھا دیا۔ تیسرے ماہ اس نے کہا، آپ کے سمجھانے کا انداز بہت اچھا ہے اور مجھے بہت اچھا سمجھ آرہا ہے، اس لیے آپ مجھے مزید پڑھا دیں۔ یوں، میں نے خرم شہزاد کو سالانہ امتحان تک پڑھایا۔

جب میں سیکنڈ ایئر میں تھا تو ایک دن خرم شہزاد دو تین اسٹوڈنٹس کو لے کر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ آپ کے پڑھانے کا انداز بہت اچھا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں پڑھا دیں۔ میرے ساتھ یہ مسئلہ تھا کہ میرے گھر میں جگہ نہیں تھی۔ گھر کا گیراج تھا جس میں تھوڑی سی جگہ تھی۔ میں نے اسی جگہ پر گھر کی دو تین کرسیاں رکھ کر انھیں پڑھانا شروع کر دیا اور یوں باقاعدہ تدریس کا سلسلہ چل نکلا۔ آہستہ آہستہ طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی۔ ڈیڑھ سال کے اندر اندر پچاس کے قریب طلبہ ہو گئے۔ میں صرف ایک

مضمون ''میتھ'' پڑھاتا تھا۔ میرا پڑھانے کا طریقہ کار یہ تھا کہ میں پانچ یا چھے شیٹیں لگاتا اور ان کے درمیان کاربن پیپر رکھ لیتا اور انھیں سمجھاتا۔ پھر وہ شیٹیں طلبہ آپس میں تقسیم کر لیتے۔

گیراج میں کلاس

لیکن جب طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تو کاربن پیپر والے طریقہ کار کا چلنا مشکل ہو گیا۔ تب میں نے طلبہ کو گروپس میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروپ کو پڑھاتا، جبکہ دوسرا گروپ انتظار کرتا۔ اس سے یہ مسئلہ ہوا کہ مجھے ایک ہی سوال کو کئی دفعہ کرانا پڑتا تھا جس کی وجہ سے میرا بہت زیادہ وقت لگتا۔ میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ میں نے دو بائی تین سائز کا ایک وائٹ بورڈ خریدا (جو آج بھی میرے پاس موجود ہے)۔ اسے گیراج کے دروازے کے ساتھ لٹکا کر پڑھانا شروع کر دیا۔ تمام طلبہ گروپ کی شکل میں آتے اور پڑھتے جاتے۔ اس طرح یہ سلسلہ تین یا چار سال چلتا رہا۔

جب طلبہ کی تعداد اور زیادہ ہو گئی تو مجھے جگہ کا مسئلہ درپیش ہوا۔ میں نے گھر والوں سے بات کی کہ طلبہ کیلئے جگہ ناکافی ہے اور مجھے ٹیوشن سے خاصی آمدن ہونے لگی ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ڈرائنگ روم دے دیں۔ میری والدہ کا مزاج کچھ سخت ہے۔ انھوں نے مجھے ڈرائنگ روم کے استعمال کی اجازت دے تو دی لیکن ساتھ ہی کہہ دیا کہ یہ یاد رہے، مجھے شام کو ڈرائنگ روم ویسے ہی چاہیے، جیسے صبح تھا۔ میں نے ان کا یہ فیصلہ قبول کر لیا اور پھر طویل عرصہ یہاں ٹیوشن پڑھاتا اور روزانہ شام کو ڈرائنگ روم صاف کر کے اپنے گھر والوں کو دیا کرتا۔

2003ء کی بات ہے کہ میں نے گھر والوں سے درخواست کی کہ اس گھر میں میرا سسٹم چل پڑا ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ پورے گھر کو اکیڈمی کے طور پر استعمال کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ کرائے کے گھر میں چلے جائیں۔ یہ بات سن کر سارے گھر والے آگ بگولہ ہو گئے اور میرے خلاف ہو گئے۔ دراصل، وہ سمجھ رہے تھے کہ میں انھیں گھر سے نکال رہا ہوں۔ خیر، میں نے ان سے کہا کہ گھر کا کرایہ، ہر طرح

کے بلز اور اس کے علاوہ ہر ماہ پانچ سے دس ہزار روپے بھی دیا کروں گا۔ یہ بات سن کر گھر والے مان گئے۔

گھر کو اکیڈمی میں بدلنے کی وجہ سے کام تو اچھا چلنے لگا، لیکن میری پڑھائی متاثر ہونا شروع ہو گئی۔ تاہم چونکہ مجھے اس کے رزلٹ اچھے مل رہے تھے، اس لیے میں زیادہ فکرمند نہیں تھا۔

ایک اور مسئلہ آ دھمکا

جب اکیڈمی کامیابی کے ساتھ چلنا شروع ہو گئی تو مجھے ایک اور مسئلہ درپیش ہوا۔ وہ یہ تھا کہ میں چونکہ اکیلا ہی سارے طلبہ کو پڑھا رہا تھا، اس لیے مجھے اکیڈمی کے پورے نظام کو منظم کرنا مشکل ہو گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ اور ٹیچرز کہاں سے لاؤں؟ یہ وہ وقت تھا کہ جب میرے اندر ''لیڈرشپ'' جاگی۔ میرے مطابق، استاد بن جانا اہم نہیں ہوتا بلکہ اہم یہ ہوتا ہے کہ کام کو کس طرح manage کیا جائے۔ بعض لوگ اچھے استاد ہوتے ہیں، لیکن وہ ادارہ نہیں بنا سکتے۔ بعض ادارہ بنا سکتے ہیں، لیکن استاد اچھے نہیں ہوتے۔ ان دونوں میں فرق ہے۔ اس مسئلے کا حل میں نے یہ نکالا کہ جو طلبہ مجھ سے پڑھ چکے تھے اور ان میں جو سمجھدار تھے، انھیں بات کرنی اور سمجھانی بھی آتی تھی، ان کی شخصیت بھی اچھی تھی، وہ کام کرنا چاہتے تھے اور انھیں پیسوں کی بھی ضرورت تھی، ایک دن ان سب کو میں نے اکٹھا کیا، انھیں چائے پلائی اور ان سے کہا کہ میں ایک ادارہ بنانا چاہتا ہوں، کیا آپ میرے ساتھ چلیں گے؟ وہ سب راضی ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ چونکہ میرے شاگرد ہیں اور ادب کی وجہ سے ہاں کہہ رہے ہیں، لیکن یاد رکھو، جب ادارہ بن جائے گا اور کام چلنے لگے گا تو آپ کو مجھے پرنسپل کی صورت میں برداشت کرنا پڑے گا۔ اور یہ بہت مشکل ہے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے میرے ساتھ کام کرنے کی ہامی بھر لی۔

جب دو افراد کا بطور استاد اور شاگرد کا تعلق ہوتا ہے تو طالب علم کی استاد کے ساتھ عقیدت ہوتی ہے اور یہی عقیدت اس کے علم حاصل کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ لیکن جب

استاد پرنسپل کے روپ میں آتا ہے تو رویے میں تبدیلی آجاتی ہے۔ ٹیم بنانے کے بعد میں نے یہ اصول بنایا کہ ادارہ چلے یا نہ چلے، ٹیم کو تنخواہ ملتی رہے گی۔ لوگوں کی اکثریت یہ غلطی کرتی ہے کہ ادارہ چلنے پر تنخواہ دی جاتی ہے۔ جب ادارہ نہیں چلتا تو تنخواہ بند کردی جاتی ہے۔ اس وجہ سے وہ لوگ اپنا ادارہ چلا نہیں پاتے۔ آج بھی میرے ادارے میں تنخواہیں ہر حال میں پہلی تاریخ کو ملازمین کو مل جاتی ہیں۔

ایک لیڈر کو اپنا ادارہ چلانے اور اسے کامیاب کرنے کیلئے اپنی ٹیم پر اعتماد ہونا بہت ضروری ہے۔ اعتماد کے بغیر ادارہ نہیں بن سکتا۔ اگر بن بھی گیا تو وہ چل نہیں سکے گا۔ اگر چل گیا تو دردِ سر بن جائے گا۔

خدشہ کا ٹیکس

جو شخص لیڈر کی حیثیت سے کام کرنا چاہتا ہے، اسے سب سے پہلے اپنے خدشے کا ٹیکس دینا ہوگا۔ مثال کے طور پر، مجھے خدشہ ہے کہ ٹیچر چھوڑ جائے گا تو میں اس کے متبادل کے طور ایک اور ٹیچر رکھ لوں گا۔ اس کو تنخواہ دینا خدشے کا ٹیکس ہوگا۔ اس سے یہ بھی ہوگا کہ ٹیچر کو بھی پتا رہے گا کہ میرے چھوڑنے سے ادارے کو کسی قسم کا نقصان نہیں ہوگا۔

ہزاروں طلبہ مجھ سے پڑھ چکے ہیں۔ ان میں اکثر مجھے یاد ہیں، لیکن جو پہلے ڈیڑھ سو طلبہ ہیں، میں ان سب کو جانتا ہوں۔ مجھے ان کا، ان کے بہن بھائیوں کا اور ان کے خاندان تک کا پتا تھا۔ جن لوگوں کا پڑھانے سے تعلق ہے، انھیں معلوم ہوگا کہ ان میں اکثر کے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کو پڑھاتے تو ضرور ہیں، لیکن ان کو جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر طالب علم، طالب علم نہیں رہتا، وہ گاہک بن جاتا ہے۔

میرا پڑھانے کا انداز یہ ہے کہ میں پڑھانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتا تھا کہ وہ سوچتا کیسے ہے اور اس کے کیا مسائل ہیں۔ میں اس کی اجازت سے اس کے مسائل کو دیکھتا تھا۔ شاید طلبہ کے بڑھنے کی ایک وجہ یہی تھی کہ طلبہ کو میتھ، فزکس اور کیمسٹری کے

علاوہ لائف کو چینج مل جاتی تھی۔ اگر طالب علم کو پڑھائی کے ساتھ ساتھ زندگی گزارنے کا سبق بھی دے دیا جائے تو وہ طالب علم آپ کو زندگی بھر یاد رکھے گا۔

ایک ایسا خاندان جس کی پشتوں میں کبھی کسی نے نہ اپنا کام کیا ہو اور نہ کوئی ادارہ بنایا ہو، اس خاندان میں ایک بائیس سال کا لڑکا اٹھے اور وہ ایسا ادارہ بنا دے جس میں چار سو سے زائد طلبہ ہوں اور آمدن بھی لاکھوں میں ہو تو یہ اچھنبے کی بات لگتی ہے۔ چونکہ میری پشتوں میں کسی نے یہ کام نہیں کیا تھا، اس لیے میرے گھر والوں کو ڈر تھا کہ کہیں میں ناکام نہ ہو جاؤں۔ مجھ سے کئی لوگ کاروبار کے متعلق پوچھتے ہیں کہ ہم اپنا کاروبار کیسے چلائیں؟ میں انھیں جواب دیتا ہوں: ایک عمارت لیں اور شروع کر دیں۔ وہ سن تو لیتے ہیں، لیکن عمل نہیں کرتے۔ وجہ یہ ہے کہ کاروبار چلانے کیلئے جو توانائی اور خطرات لینے چاہئیں، وہ صلاحیت ان میں نہیں ہوتی۔

طویل عرصہ میرے گھر والے مجھ سے یہ باتیں کرتے رہے کہ جو تم کماتے ہو، وہ لگا دیتے ہو۔ میں انھیں جواب دیتا کہ پڑھانے سے کمانا میری ترجیح نہیں ہے۔ یہ میرا شوق ہے۔ آج بھی بے شمار لوگ مجھے کہتے ہیں کہ آپ پیسے کما کر مزید ترقی کیوں نہیں کرتے۔ میں انھیں جواب دیتا ہوں کہ یہ میرے ویژن میں شامل نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں، پھر آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ میں ان سے کہتا ہوں کہ تعلیمی ادارہ ایک ٹول ہوتا ہے جس کے ذریعے آپ کو کچھ کام کر کے دکھانا ہوتے ہیں۔ اگر آپ اس ٹول کو صحیح استعمال نہیں کر رہے تو پھر وہ چاہے یونیورسٹی بھی بن جائے، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اسٹریس کا دور

جیسے جیسے ادارہ بڑا ہونے لگا، مجھے اسٹریس (Stress) ہونا شروع ہو گیا۔ میرے لیے یہ سب سے بڑا چیلنج تھا۔ تقریباً ایک سال میں اس اسٹریس میں رہا۔ ہر روز مجھے کوئی نہ کوئی صحت کا مسئلہ رہنے لگا۔ کبھی پیٹ خراب ہو جاتا تو کبھی زکام اور کبھی نیند نہ آتی۔ بہت جگہ چیک اپ کرایا، مگر بات نہ بنی۔ آخر کار مجھے بہت اچھے فزیشن ملے۔ انھوں نے میرے والد صاحب کو کہا کہ اپنے بیٹے کو کہیں کہ یا تو اپنی ہمت کو بڑا کرلے

یا پھر اپنے کام کو چھوٹا کر لے۔ یہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی اور میں نے فیصلہ کیا کہ میں کبھی اپنی ہمت کو کم نہیں ہونے دوں گا۔ وہ دن اور آج کا دن... حالات جس طرح کے بھی ہوں، میں نے کبھی اپنی ہمت کم نہیں ہونے دی۔

میں نے اپنے ادارے کی سب سیٹوں پر کام کیا۔ مثال کے طور پر، استقبالیہ۔ استقبالیہ پر وقت گزارنے سے پتا چلا کہ وہاں کس طرح کے مسائل ہوتے ہیں، کالیں کیسے آتی ہیں، کیا سوالات ہوتے ہیں، لوگ کیا پوچھتے ہیں، کون سے جواب دینے سے تسلی ہوتی ہے۔

جنوری 2006ء میں طالب علموں کو آفر کی کہ آپ اتوار کے دن اکیڈمی آئیں گے تو آپ کو مفت پڑھایا جائے گا۔ اتوار والے دن پڑھانے کیلئے میں ٹیچرز کو الگ سے پیسے دیتا تھا۔ پڑھانے کے دوران مجھے یہ بات سمجھ آئی کہ صرف نمبر دلانا کافی نہیں ہے، بلکہ طلبہ میں لائف اسکلز پیدا کر دی جائیں تو انھیں زندگی کے ہر معاملے میں آسانی پیدا ہو جائے گی اور ساتھ ہی ادارہ بھی دوسروں سے منفرد ہو جائے گا۔ طلبہ میں صلاحیتیں پیدا کرنا ایسا کام ہے جس پر لوگوں نے بہت کم کام کیا ہے، خاص کر اسکولوں نے جس کی وجہ سے خاطر خواہ کامیابی ملی اور یہی سے ٹرینر بننے کا سفر شروع ہوا۔

ادارے میں ایک اور نئی چیز کا یہ اضافہ کیا کہ اتوار کے دن سیمینار کرانا شروع کر دیے۔ شروع میں، میں نے غزالہ موسیٰ کی کتاب "تعلیمی راز" پڑھی اور اس کتاب میں سے سیمینار بنائے۔ اسی طرح اور بہت سی کتابوں میں دی گئی معلومات کی بنیاد پر سیمینار کیے۔ پھر وہی سیمینار تعلیم سے ہوتے ہوئے کامیابی کی طرف چلے گئے اور کامیابی کے موضوعات پر بھی لیکچر دینا شروع کر دیے۔ پھر ان سیمینارز میں بڑے بڑے ناموں کو بھی بلانا شروع کر دیا۔ جیسے جاوید چوہدری، بلال قطب، اختر عباس وغیرہ وغیرہ۔ اچھا کام یہ کیا کہ ہم نے ان سیمینارز کی ویڈیوز بھی بنانا شروع کر دی۔ اس حوالے سے ہم نے "علم کی دنیا" والوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ یہی چیزیں اکیڈمی کی کامیابی کا باعث بنیں۔ ان سیمینارز میں بچوں کے ساتھ ساتھ ان کے والدین بھی آنے لگے۔ یوں، بچوں کے گھر والوں سے تعلقات بننا شروع ہو گئے۔ بچوں کے گھر والوں کو باشعور

کرنے کیلئے ہم نے بے شمار مواد رسالوں کی شکل میں، کتابچوں کی شکل میں، پمفلٹ کی شکل میں، کارڈز اور کوٹیشن کی شکل میں بچوں کے گھروں پر پہنچانا شروع کردیا۔ 2011ء میں ہم نے ایک چھوٹا سا سروے کیا تو پتا چلا کہ جتنی کتابیں ایک نہم دہم کے بچے کی ہوتی ہیں، اتنا ہی میٹریل ہم بچوں کے گھروں تک بجھوا چکے ہیں۔

کیا آپ فیس کا نعم البدل دیتے ہیں؟

میرے مطابق مارکیٹنگ کا سب سے بہترین ٹول کوالٹی ہے۔ ہم لوگ بینرز، پوسٹرز جیسی چیزوں پر اکتفا کرتے ہیں، مگر اس سے اتنا رزلٹ نہیں ملتا۔ یہ یاد رہے کہ چھ سال تک میرے ادارے کے باہر کوئی بورڈ نہیں لگا تھا۔ اکیڈمی کے باہر جو دوسو کے قریب سائیکلیں کھڑی ہوتی تھیں، وہی ہمارا بورڈ تھا۔ گلی سے ہر گزرنے والا سوچتا تھا کہ یہاں پر کیا ہو رہا ہے۔ میرے نزدیک باہر کا بورڈ اہم نہیں ہوتا، جتنا اہم کام ہوتا ہے۔ ہماری بہترین مارکیٹنگ ہمارا پروڈکٹ تھا۔ بچہ پڑھتا تھا، بچے کی فیملی مطمئن ہوتی تھی، لوگ خوشی سے فیس دیتے تھے۔ جبکہ آپ دوسرے اداروں میں جا کر دیکھیں کہ لوگ فیس بڑی تکلیف سے دیتے ہیں۔ اس کے برعکس، بچہ ہمارے پاس اپنے شوق سے آتا تھا۔

جب میں نے انجینئرنگ یونیورسٹی چھوڑی تو یونیورسٹی کے دوستوں نے باتیں کرنا شروع کردیں۔ میں نے ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، کیونکہ میرے نزدیک میرا کام ان کو جواب دے گا۔ ایک دفعہ ہم نے اپنے ادارے کا آڈٹ کیا تو پتا چلا کہ دو سو تیس طالب علم ایسے تھے جنہوں نے انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہ انجینئر بنے۔ پچپن طلبہ ایسے تھے جنھوں نے ایم بی بی ایس کیا اور اٹھارہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنے۔ یہ اُن باتوں کا جواب تھا جو میرے دوستوں نے میرے بارے میں کی تھیں۔ میرے مطابق، آدمی کے پاس جب خطرہ لینے کی جرات زیادہ ہو تو اسی وقت اسے فیصلہ کرلینا چاہیے۔

محنت کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ اس کا مجھے بہت جلد ہی پتا چل گیا تھا۔ کامیابی کیلئے

محنت کے ساتھ ساتھ صبر بہت ضروری چیز ہے۔ مجھے یہ کام کرتے ہوئے سولہ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے۔ کسی بھی چیز کو بننے کیلئے پندرہ برس سے زائد کا عرصہ لگ جاتا ہے۔

تعلیمی نظام جان دار بنائیے

تعلیم کے کام کا بنیادی وصف دیانت داری ہے۔ اگر کوئی شخص استاد ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنا ادارہ چلا رہا ہے، لیکن وہ بد دیانت ہے تو ادارہ ناکام ہو جائے گا۔ آج بھی ہمارے ادارے میں کوئی پندرہ تاریخ کو کوئی چھوڑنا چاہتا ہے تو اس کو آدھی فیس واپس مل جاتی ہے۔ دس تاریخ کو فارم دیں تو فیس بیس دن کی لی جائے گی۔ ہم نے کبھی پورے مہینے کی فیس نہیں چارج کی۔ اس کے علاوہ کوئی بھی آ کر کہے کہ میں فیس ادا نہیں کر سکتا اور اس کا ہمیں اس بات کی شہادت مل جائے کہ وہ سچ کہہ رہا ہے تو ہم اس طالبعلم سے فیس نہیں لیتے۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ اس سے کتنی برکت ہوتی ہے۔ جب کسی کو آسانی ملتی ہے تو اس سے اللہ تعالیٰ آپ کے کام میں آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔ ہم ایسے بچے کا رول نمبر بھی سب کے درمیان رکھتے ہیں اور اس سے فیس کے متعلق پوچھا بھی نہیں جاتا، تاکہ اس کی عزت نفس مجروح نہ ہو۔ آج بھی جتنے بچے میرے ادارے میں پڑھ رہے ہیں، ان کے پاس میرا موبائل نمبر موجود ہے۔ کوئی بھی بچہ مجھے نام بتائے بغیر میسج کر سکتا ہے اور میں اس کلاس کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

ہم جیسے ہی سسٹم سے باہر آتے ہیں تو بچوں سے دور ہو جاتے ہیں۔ لیڈر ہونے کے ناتے بچوں سے رابطہ اور تعلق رہنا چاہیے۔

اخلاق بہت اہم چیز ہے۔ اگر آپ استاد ہیں، پرنسپل ہیں تو اخلاق بھی استاد والا ہونا چاہیے۔ اگر چہرے پر مسکراہٹ نہیں ہے، گرم جوشی نہیں ہے تو پھر مطلوبہ نتائج نہیں مل سکتے۔ مثال کے طور پر، یہ بہت اہم ہے کہ آپ خود بچوں کو سلام کریں۔ اس سے ان میں خود اعتمادی آتی ہے۔ اگر آپ لیڈر ہیں اور ادارہ چلا رہے ہیں اور اسٹریس کا بھی

شکار ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ لیڈر نہیں ہیں، کیونکہ لیڈر خود کو سنبھالنا جانتا ہے۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ ایسا تو ہونا ہی ہے اور مجھے ہر حال میں ان حالات کا سامنا کرنا ہے۔

جب میں اکیڈمی بنا رہا تھا تو اس وقت مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ اس وجہ سے بہت غلطیاں ہوئیں۔ لیکن میں نے ان غلطیوں سے بہت کچھ سیکھا۔ اکیڈمی میں چھٹی کا ایک طریقہ کار ہے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے نکلنے کا وقت مقرر ہے۔ اکیڈمی صبح سے شام تک کھلی ہوتی ہے۔ کوئی لڑکی کسی لڑکے کو نہیں دیکھ سکتی اور کوئی لڑکا کسی لڑکی کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس میں سختی نہیں ہے۔ ایک دن ہم نے چیک کرنے کیلئے سیکیورٹی والے لوگ ہٹا دیے، تب بھی کسی لڑکے اور لڑکی نے ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھا۔ پھر ہمیں یہ بات سمجھ آئی کہ ایسا سسٹم کی وجہ سے ہے۔

مستقل بہتری لائیے

ابتدا کے آٹھ سال اکیڈمی میں، میں نے صرف میتھ، فزکس اور کیمسٹری پڑھائی، لیکن میرے اندر ایک احساس تھا کہ مجھ میں کوئی کمی ہے۔ میری کمیونیکیشن ٹھیک نہیں ہے۔ میرے دوست علی عباس نے مجھ سے کہا کہ قاسم صاحب، آپ یونیورسٹی میں پڑھائیں۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے کہا کہ جب تم ان لوگوں کا سامنا کرو گے جو آزاد ہیں، آوازے کسنے والے ہیں تو تم میں برداشت پیدا ہوگی۔ لہٰذا، میں نے یونیورسٹی میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ میرے اندر برداشت آ گئی۔ اس کے علاوہ ڈاریکٹوریٹ اسٹاف کو پڑھانے سے میری کمیونیکیشن اچھی ہوگئی۔

جب آپ دنیا کا سامنا کرتے ہیں تو آپ کو بھانت بھانت کے لوگ ملتے ہیں۔ آپ ان کے رویوں پر اپنے ردِعمل کا اظہار نہیں کرتے جس سے آپ کے اندر بہتری آتی ہے۔ اگر آپ کے پاس یہ آرٹ ہے تو پھر آپ کلاس کو اپنی مرضی کے مطابق چلائیں گے۔ اگر یہ آرٹ نہیں ہے تو پھر کلاس آپ کو چلائے گی۔ کیمونیکیشن کی انتہا یہ ہے کہ لوگ کچھ بھی چاہ رہے ہوں، آپ ان کو اپنی مرضی کے مطابق لے کر چلیں گے۔

آپ کتنے مخلص ہیں؟

مجھے رقارم کا شوق ہمیشہ سے رہا ہے۔ میرے اندر یہ جذبہ فطری ہے۔ اسٹیفن کوے کے مطابق، ''اپنا ایریا آف انٹرسٹ تلاش کیجیے۔'' میں نے اپنا ایریا آف انٹرسٹ تلاش کیا ہوا ہے۔ میں اس سے باہر نہیں سوچتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کو اپنے کام کے ساتھ مخلص ہونا چاہیے۔ اگر آپ اپنے کام کے ساتھ، اپنے ادارے کے ساتھ مخلص نہیں ہیں تو پھر آپ پاکستان کے ساتھ بھی مخلص نہیں ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی وطن کے ساتھ غداری ہے۔

کام سے اعتماد ملتا ہے۔ آپ کبھی اسپورٹس مین سے ملیں، اس میں اعتماد نظر آئے گا۔ آپ کسی مقابلے کے امتحان پاس کرنے والے سے ملیں، اس میں اعتماد ہوتا ہے۔ یہی اعتماد ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ جس فرد میں اعتماد کی کمی ہوتی ہے، اصل میں وہ اپنے کام میں کمزور ہوتا ہے۔ اگر آپ کو اپنے کام پر پورا اعتماد ہے تو پھر تاثیر پیدا ہوگی۔ پھر لوگ مثال دیں گے، عزت کریں گے اور نیٹ ورک بھی بڑھے گا۔ زندگی میں جو کام بھی کریں، اس میں رنگ بھریے۔ رنگ بھرنے کا مطلب ہے کہ وہ کام لوگوں کو کشش کرے۔ اگر آپ ایسا کرلیتے ہیں تو خود بہ خود اعتماد آنا شروع ہو جائے گا۔

لوگوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کرنا اہم نہیں ہے، اہم یہ ہے کہ میں کیوں کھڑا کر رہا ہوں۔ عمارتیں بنا لینا، پیسہ کما لینا، خوشحال ہو جانا کامیابی نہیں ہے۔ اصل کامیابی وہ قابلیت ہے جو آدمی کے اندر ہوتی ہے۔ کامیابی چھونے والی چیز نہیں ہے، چیزیں جمع کرلینے کا نام نہیں ہے بلکہ اعتماد کے آنے کا نام کامیابی ہے۔ ویژن آنے کا نام کامیابی ہے۔ کامیابی آگے بڑھنے کا نام ہے۔



لمبا راستہ

"آگے بڑھنے کے کئی طریقے ہیں، مگر سیدھا کھڑا ہونے کا ایک ہی طریقہ ہے!"

فرینکلن ڈی روزویلٹ

کوئی نیا مقام تلاش کرنے کیلئے وہاں کے مقامی افراد سے پوچھنا پڑتا ہے، مدد لینا پڑتی ہے۔ اس سے منزل پر پہنچنے میں آسانی ہوتی ہے۔ لیکن جب راستے کا پتا نہ ہو تو اس کیلئے تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ بعض اوقات انسان اس راستے پر چل رہا ہوتا ہے جو منزل کی طرف نہیں جا رہا ہوتا یا اس راستے پر چل پڑتا ہے جو بہت لمبا ہوتا ہے۔ جب ایسی صورتِ حال ہو تو جذبات، توقع اور امید پر فرق پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔

زندگی میں کئی بار ایسا ہوتا ہے کہ بعض طالب علم یہ گمان کرتے ہیں کہ میری تیاری اتنی ہے کہ میں آسانی سے ٹاپ کر جاؤں گا۔ لیکن وہ ٹاپ نہیں کر پاتے۔ ان کی توقع کچھ اور ہوتی ہے اور نتیجہ کچھ اور نکلتا ہے۔ انسان زندگی میں بے شمار پلان بناتا ہے، لیکن وہ پلان دھرے رہ جاتے ہیں جس کی وجہ سے اس کا سفر خراب ہو جاتا ہے۔ پھر اسے پتا چلتا ہے کہ میں نے جتنی توانائی اور وسائل لگائے ہیں، وہ غلط لگے ہیں اور میں نے اپنے سفر کی زیادہ قیمت ادا کر دی ہے۔

ہر شے کی قیمت ہے

بچپن میں ہر بچہ اپنا کھلونا ٹوٹنے پر روتا ہے اور پھر اپنی ضد کو منوا کر دوبارہ نیا کھلونا لینا چاہتا ہے۔ کھلونے کیلئے "ضد کرنا" قیمت ہے جو بچہ ادا کرتا ہے۔ آپ اپنی زندگی پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ جو خواہشیں پوری ہوئیں، اُس کی کتنی قیمت آپ نے ادا

کی۔ آیا یہ قیمت زیادہ تھی یا کم۔

بہت سے لوگ اپنی خواہشیں پورا کرنے کیلئے لمبے راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ کئی لوگ پیسہ بنانے کیلئے صحت گنوا دیتے ہیں۔ کئی لوگ پیسے کیلئے اپنی صحت خراب کر لیتے ہیں۔ پھر اس پیسے کو دوبارہ صحت ٹھیک کرنے کیلئے خرچ کر ڈالتے ہیں۔ زندگی میں یہ طے کرنا ضروری ہے کہ آپ کو لمبا راستہ کس چیز کیلئے طے کرنا ہے۔ مثال کے طور پر، آپ کو جو شے جان کے بل بوتے پر حاصل کرنا ہے، عین ممکن ہے وہ کسی کو ویسے ہی مل گئی ہو۔ ہم پیسہ اس لیے کماتے ہیں کہ ہماری زندگی میں سکون آجائے۔ پیسہ تو آجاتا ہے، لیکن سکون نہیں آتا۔ آج ماہر نفسیات کے پاس جانے والوں کی زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کے پاس بہت زیادہ پیسہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس پیسہ تو ہے، لیکن سکون نہیں ہے۔

لمبے راستے کا انتخاب ہمارا مزاج بن چکا ہے۔ یہ غلط فہمی عام ہے کہ مختصر راستے سے ہم کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر کسی کو لمبے راستے پر ڈال دیا جائے وہ بہت خوش ہوگا۔ مثلاً، جب ہم بیمار ہوتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ مہنگی فیس والے ڈاکٹر کے پاس جا کر مہنگی دوا خرید کر کھائیں گے تو ہمیں شفا ملے گی۔ حالانکہ بہت سی بیماریاں ایسی ہیں جو مفت کے گھریلو ٹوٹکوں سے دور ہو سکتی ہیں۔ لیکن لوگ ان کیلئے بھی لمبے چوڑے نسخہ جات کا استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ڈاکٹر انھیں یہ کہہ دے کہ اگر تم روزانہ پندرہ منٹ دھوپ میں بیٹھو تو تمہارا مسئلہ حل ہو سکتا ہے، تو وہ کہیں گے، یہ ڈاکٹر ٹھیک نہیں ہے، ہمیں کوئی مشکل سا عمل چاہیے۔ ہم لمبے راستے کی وجہ سے دوسروں کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ زندگی میں ہمیں بے شمار لوگ ایسے ملتے ہیں جو دوسروں کی باتوں میں آنے کی وجہ لمبے راستے پر پڑے ہوتے ہیں اور پھر اپنی منزل پر نہیں پہنچ پاتے۔

حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں

"یہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات"

ایک سجدہ ایسا تلاش کیجیے کہ ہزار سجدوں سے نجات مل جائے۔ بہت سے لوگوں

کے پاس مقبول حج کرنے کا موقع ہوتا ہے، لیکن وہ یہ حج نہیں ادا کر پاتے (مقبول حج کا مطلب اپنے والدین کو مسکرا کر دیکھنا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے کہ "خاک میں ملے اس کا سر جس نے والدین کو بوڑھا دیکھا اور جنت حاصل نہ کی اور بدبختی اس کیلئے ہے جس نے والدین کو بوڑھا دیکھا، لیکن ان کی خدمت نہ کی۔" اگر حج کے لوازمات پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ اس میں کتنی مشقت ہے۔ لوگ اس مشقت کا انتخاب کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حج صرف اہل استطاعت پر فرض ہے، مگر وہ لوگ جن کے والدین ان کے پاس ہیں وہ ان پر توجہ ہی نہیں دیتے اور لمبے راستے کا انتخاب کرتے ہیں۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ زکام کا بھی اپریشن ہونا چاہیے۔ اس میں کوئی تکلیف ہونی چاہیے۔ آسان اور مختصر راستے پر چلنا دشوار لگتا ہے۔

ان چیزوں کی فہرست بنائیے جن کی وجہ سے لمبے راستے کا انتخاب کرنا پڑا۔ اپنے آپ سے سوال پوچھئے کہ کیا میرا لمبا راستہ طے کرنا ضروری تھا؟ کیا اتنی تگ ودو کی ضرورت تھی؟ کیا اتنی توانائی لگانی چاہیے تھی؟ کیا اتنا وقت صرف کرنا چاہیے تھا؟

غفلت کی زندگی؛ زیاں کا احساس

زندگی میں سنجیدگی اس وقت آتی ہے کہ جب یہ احساس ہونے لگے کہ میرا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ جب وقت ضائع ہونے پر تکلیف ہونے لگے تو اس وقت شکر ادا کیجیے، کیونکہ آپ کا شمار دنیا کے خوش قسمت ترین انسانوں میں ہونے لگا ہے۔ جس انسان کو اپنے وقت کی قدر ہو، وہ بہت ہی خوش قسمت انسان ہے۔ اس بات کا شکر ادا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو زندگی کی قدر مناسب وقت میں دے دی، کیونکہ اکثر لوگوں میں یہ احساس عمر کے آخری حصے میں پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت احساس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، "غافل کی آنکھ تب کھلتی ہے جب بند ہوتی ہے۔" اگر آپ کی آنکھ ابھی سے کھل گئی ہے تو پھر آپ خوش قسمت ہیں اور آپ لمبے راستے سے بچ گئے ہیں۔

لمبا راستہ اس وقت اختیار کیجیے کہ جب اسے اختیار کرنا ضروری

ہو جائے۔ یہ طے کیجیے کہ اپنے وسائل کہاں کہاں استعمال میں لاتا ہیں۔ طے کیجیے کہ میرا کریئر کیا ہے۔ طے کیجیے کہ میرا مستقبل کیا ہونا چاہیے۔ طے کیجیے کہ میرا ویژن کیا ہے۔ جو آدمی اپنی زندگی کے معاملے میں صاف گو ہو جاتا ہے، اس کیلئے زندگی کے اہم فیصلے کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ وقت ضائع کرنے والا اصل میں اپنی زندگی ضائع کرتا ہے۔ ''مجھے کیا کرنا ہے؟'' اس کا تعین جتنی جلد ممکن ہو سکے، کر لینا چاہیے تا کہ زندگی آسان ہو جائے۔ آپ جو لینے جا رہے ہیں، یہ دیکھیے کہ آنے والی چیز اس سے مطابقت رکھتی ہے یا نہیں۔ جب انسان کو پتا ہوتا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے تو بہت سے غیر ضروری کاموں سے وہ بچ جاتا ہے۔ بڑے لوگ ایسے ہیں جنھوں نے اپنی ضرورت سے زیادہ پیسہ بنا لیا، حالانکہ انھیں اتنے پیسے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ پھر وہ اس مال کی حفاظت میں لگے رہتے ہیں۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''کنجوس اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مر جاتا ہے۔''

ہر شخص نے اپنی اپنی کمیٹی ڈالی ہوئی ہے۔ کمیٹی کا مطلب ہے کہ چپکے چپکے محنت کر رہا ہے، جیسے پڑھائی کی کمیٹی، نوکری کی کمیٹی، کاروبار کی کمیٹی، تعلقات کی کمیٹی، محنت کی کمیٹی۔ ان کمیٹیوں کی فہرست بنائیے اور طے کیجیے کہ وہ کمیٹیاں ٹھیک ہیں کہ نہیں۔ ایسی لاشعوری، لاحاصل اور بے وجہ کوشش جس کے انجام کا نہیں پتا، اس سے ہاتھ اٹھا لیں، اسے ترک کر دیجیے۔ آپ کی محنت سے اگر کسی کو فائدہ ہو رہا ہے تو پھر بہت اچھی بات ہے، لیکن اگر کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تو پھر اس محنت سے پیچھے ہٹ جائیے۔ جب رات کو سونے لگیں تو دیکھیں کہ آج میں نے اپنے مقصد سے جڑے ہوئے کتنے کام کیے۔ روزانہ یہ مشق کیجیے کہ آج میں نے ایسے کون سے پانچ کام کیے ہیں جن کا تعلق میرے مقصد سے ہے۔ جب یہ مشق روزانہ ہو گی تو پھر ذہن میں ہو گا کہ مجھے جواب دینا ہے۔ پھر لمبے اور غیر ضروری راستے سے بچنا آسان ہو جائے گا۔

زندگی واحد ڈیل ہے جس میں وقت پر طے کرنا پڑتا ہے کہ کرنا کیا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ اگر وقت پر طے کر لیا تو پھر زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ اگر طے نہیں کیا تو پھر زندگی مشکل ہو جائے گی۔ پھر جو چاہیں گے، وہ نہیں ملے گا۔ ایک گورے نے کتاب

لکھی جس کا نام ہے، ''زندگی کیا ہے؟'' اس نے سو کامیاب لوگوں کو خط لکھے۔ ان میں کئی لوگوں نے اس کے خط کا جواب نہیں دیا۔ کئی لوگوں نے معذرت کرلی۔ اس نے یہ تمام باتیں اپنی کتاب میں لکھ لیں اور کہا کہ کتنی عجیب بات ہے کہ دنیا میں اتنے لوگ ہیں، مگر کسی کو بھی نہیں پتا کہ زندگی کیا ہے۔ اس نے جیل کے قیدی کو بھی خط لکھا۔ اس نے جواب دیا کہ آزادی کا نام، زندگی ہے۔ ''جو چیز نہ ہو، وہ زندگی ہوتی ہے۔'' جب تک کوئی چیز چھن نہ جائے، تب تک زندگی کی سمجھ نہیں آتی، چھننے کے بعد پتا چلتا ہے کہ میں نے کتنا لمبا راستہ طے کیا ہے۔ کاش میں یہ لمبا راستہ طے نہ کرتا۔ کاش میں اپنی توانائی ضائع نہ کرتا۔ کاش، میں اپنے وقت کو ضائع نہ کرتا۔ جب یہ طے ہو جاتا ہے کہ زندگی سے کیا چاہنا ہے تو پھر آدمی مسافر کی طرح زندگی گزارنا شروع کرتا ہے۔

جوازِ ہستی

زندگی کی سب سے اعلا تعریف یہ ہے کہ زندگی کا جواز مل جائے۔ جب جوازِ ہستی پاس ہو تو پھر زندگی گزارنا اور اگلی منزل پر جانا آسان ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، موبائل ہو لیکن اس کے فنکشنز کا پتا ہی نہ ہو اور صرف یہی سمجھا ہو کہ اسے صرف جیب میں ہی ڈالا جاتا ہے تو پھر اس سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ زندگی بھی اس طرح ہوتی ہے۔ اکثر لوگوں کو اس کے فنکشنز کا پتا ہی نہیں ہوتا۔ جب یہ جانے لگتی ہے، تب اس کے فنکشنز کا پتا چلتا ہے۔ لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ زندگی کا سراغ تلاش کیجیے۔ اس کا جواب باہر سے نہیں ملے گا، اس کا جواب صرف اندر سے ملے گا، اپنے اندر سے جواب آئے گا۔ یہ جواب، جیسا بھی ہو، سننے کیلئے ہمیشہ تیار رہیے۔ خبر نہیں کہ کب اندر کا سچا انسان خیال کی شکل میں بول پڑے۔

جس دن جوازِ ہستی مل جائے، زندگی اسی دن شروع ہو جاتی ہے۔ زندگی اس دن کا نام ہے جس دن یہ احساس آئے کہ یہ زندگی ہے۔ اس سے پہلے زندگی نہیں تھی، دن تھے جو گزارے جاتے تھے۔ جس دن احساس آجائے تو سمجھ جائے کہ آپ کو جوازِ ہستی مل گیا۔ جب جوازِ ہستی مل جاتا ہے پھر انسان بامقصد چیزوں کے قریب جانے لگتا ہے

اور اسے اپنی منزل سامنے نظر آنے لگتی ہے۔

آج سے اپنا سب سے اچھا کام تلاش کیجیے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ مالک، میرے سب سے اچھے کام کو اپنی راہ میں لگا۔ میرا بولنا، میرا سننا، میرا لکھنا، میرا پڑھنا، میری توانائی، میرا مال، میرے تمام تر وسائل میرے مقصد حیات پر لگ جائیں۔ یہ بھی شعور ہے کہ اپنے ساتھ جڑی ہوئی زندگیوں کی قدر کرنے لگیں۔ انھیں شعور دینے لگیں۔ فہم دینے لگیں۔ اس سے بڑا مقصد اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ اللہ کا بندہ نقصان دہ نہ رہے، بلکہ فائدہ مند ہو جائے۔ اگر آدمی نے دوسروں کو نقصان پہنچانا بند کر دیا اور فائدہ پہنچانا شروع کر دیا تو سمجھئے کہ وہ مقصد حیات کی طرف چل پڑا ہے۔ یہ سب سے بڑی علامت ہے۔ پھر وہ اگر سائنسدان ہے تو وہ کوئی دریافت کرے گا، استاد ہے تو نسلیں سنوارے گا، قلم کار ہے تو لوگوں کیلئے ہدایت لکھے گا۔ پھر ہر فن کا ماہر اپنے فن کے ذریعے معاشرے کی اصلاح کا کام کرے گا۔

معمولی واقعات غیر معمولی نہیں

جس مالک نے آپ کو تخلیق کیا ہے، اس مالک نے آپ کے مقصد کی بھی تخلیق کی ہے۔ قدرت اتنی مہربان ہے کہ وہ کسی نہ کسی کی زبان سے بولتی ہے اور آپ کو پیغام دیتی رہتی ہے۔ کہیں خیال ڈال دیتی ہے تو کہیں کوئی کتاب کھل جاتی ہے۔ کہیں ریڈیو غلطی سے لگ جاتا ہے، کہیں حادثہ ہو جاتا ہے۔ کہیں کوئی کسی کو سمجھا رہا ہوتا ہے۔ البتہ، قدرت کے ان پیغامات کو چند ہی سمجھ پاتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں، "دے کر احساس زیاں تیرا لہو گرما دے" احساسِ زیاں کا مطلب ہے کہ آپ کے اندر یہ احساس کہ زندگی ضائع ہو رہی ہے، میں ڈوب رہا ہوں، میں کام کی تکمیل کے بغیر جا رہا ہوں۔ جب آنکھوں سے بے سبب آنسو آنا شروع ہو جائیں تو وہ دعا مانگنے کا بہترین وقت ہوتا ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو یاد کیا ہوتا ہے۔ اس وقت جو بھی دعا مانگی جائے، وہ جوازِ ہستی بن جاتی ہے۔

لمبے راستے کا اندازہ انسان کو اس راستے پر چلنے سے ہی محسوس ہو جاتا

ہے۔ آدمی کوئی کام غلط کر رہا ہو، اسے پتا بھی ہو لیکن پھر بھی کرتا جائے تو یہ بہت زیادتی ہے۔ لمبے راستے کے ساتھی بھی بولنے لگتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ تم غلط راستے پر ہو۔ جگہ جگہ پر نشانیاں محسوس کراتی ہیں کہ تم غلط کر رہے ہو۔ چیزوں میں سے آوازیں آتی ہیں۔ آدمی اپنے راستے اور اپنی منزل پر جتنا آسانی سے جاتا ہے، کسی اور راستے پر نہیں جا سکتا، کیونکہ اس میں سرشاری ہوتی ہے۔ اس راستے کی تکالیف میں بھی راحت محسوس ہوتی ہے۔

کچھ لمبے راستے ایسے ہوتے ہیں جن پر چلنا چاہیے جیسے بے غرض تعلقات جس کے بارے میں حکم ہے کہ انھیں ماننا ہے، جیسے والدین، دوست احباب وغیرہ۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''دوست کے ساتھ صرف ایک ہی سلوک روا ہے، اور وہ وفا ہے۔'' وفا کا مطلب ہے کہ اس کی بے وفائی اور آپ کی وفا۔ سچی دوستی میں دوست کی خوشی آپ کی خوشی ہوتی ہے، دوست کا غم آپ کا غم ہوتا ہے۔ دوسرا لمبا راستہ اللہ تعالیٰ کیلئے کاٹنا چاہیے۔ تیسرا لمبا راستہ جس کے بارے میں فیض حسن سیال صاحب کہتے کہ ''دنیا کا سب طویل سفر خود شناسی کا سفر ہے۔'' اس کیلئے لمبا راستہ جائز ہے۔ جیسے جیسے میں اپنی ذات میں اترا، حیران ہوتا گیا کہ مالک یہ تیرا ہی کارخانہ ہے، تو نے مجھے کیا سے کیا بنا دیا، میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بندہ جب خود کو تلاش کر لیتا ہے تو پھر وہ گنگ ہو جاتا ہے۔

اس دنیا میں آپ کا منفرد کردار

ہم سب ایک جیسے نہیں ہیں۔ ہماری نفسیات، ہماری چاہتیں، ہماری تلاش، ہمارے راستے، ہمارے انداز، ہمارے مزاج، ہماری انسپائریشن اور ہم سب کا پس منظر مختلف ہے۔ جب سب کچھ مختلف ہے تو پھر سب کا مقصد بھی ایک نہیں ہو سکتا۔ سب کی چوائس ایک نہیں ہو سکتی۔ کائنات میں ہر انسان کا مختلف ہونا خالق کا بہت بڑا حسن ہے۔ ہر شخص اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ کبھی معاشرے کے ایک کردار کو نکال کر دیکھیے، سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ مثلاً، صرف ایک ماہ کیلئے دنیا سے حجام نکل جائے تو

لوگوں کے حلیے بدل جائیں گے۔

اس دنیا میں کس نے پربت نباہی
اپنی ذات میں گم ہیں سارے، کیا بربت کیا رائی

پہاڑ بھی اپنی ذات میں گم ہے اور ریت کا ذرا بھی اپنی ذات میں گم ہے۔ دنیا کی ایک ایک چیز اپنے وجود کے بارے میں بتا رہی ہے کہ میں ہوں۔ آپ بھی اپنے وجود کو تلاش کیجیے کہ یہ وجود کیوں ہے، اس کے ہونے کا جواز کیا ہے، کیا ہمارا دنیا میں آنا ضروری تھا اور کیا جانا ضروری ہے؟ تکمیل کا نہ ہونا ہی ہمیں لگا رہنے دیتا ہے۔ جس فرد کو یہ احساس ہو جائے کہ مجھے سب کچھ مل گیا ہے تو وہ فارغ ہو جاتا ہے۔ اس کے برخلاف، اگر بہت کچھ کر کے لگتا ہے کہ ابھی تو کچھ بھی نہیں کیا تو یہ خوش قسمتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو آپ سے کوئی بڑا کام لینا ہے۔ خوب علم کے بعد محسوس ہو کہ ابھی بھی لاعلم ہوں تو یہ احساس "علم" کی علامت ہے۔

جس سفر سے کوئی کمائی کی ہے، اس سفر کو سلام کیجیے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، "اس گناہ کا شکریہ ادا کیجیے جس گناہ نے توبہ کرادی۔" ایک ایسی ڈیل جس کے بعد پتا لگ جائے کہ زندگی میں یہ ڈیل کبھی نہیں کرنی تو اس ڈیل کا شکریہ ادا کیجیے۔

زندگی میں ایک مقام وہ بھی آتا ہے کہ جب آدمی ان لوگوں کیلئے بھی دعا کرتا ہے جنھوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہوتی ہے۔ بعض اوقات انسان کو کسی سے ایسا درد ملتا ہے کہ وہ واقعہ محو ہو جاتا ہے، مگر اس تجربہ کا درد باقی رہتا ہے۔ یہ درد دعا میں کام آتا ہے اور اس کی قبولیت کا ذریعہ بنتا ہے۔ کسی کی زیادتی کے باوجود بھی معافی دے رہے ہیں تو پھر آپ چھوٹے انسان نہیں ہیں، عظیم انسان ہیں۔ کوئی بھی شخص اپنا حساب کرانا نہیں چاہتا، اس لیے آپ کو دوسروں کا حساب بھی نہیں کرنا چاہیے۔ آنے والی زندگی پچھلی زندگی سے بہتر ہونی چاہیے۔ آنے والی زندگی ذوقِ سفر کے ساتھ ہونی چاہیے۔ آنے والی زندگی بے ضرر ہونی چاہیے۔ آنے والی زندگی فائدہ رساں ہونی چاہیے۔

ایک دعا، خلوص کے ساتھ

کم از کم ایک خواہش تو ایسی رکھیے کہ جس میں آدمی سچا ہو، مخلص ہو۔ وہ کہے کہ مالک، میری یہ دعا سچی دعا ہے۔ اس میں میرا کوئی لالچ نہیں ہے۔ مجھے اپنے آپ سے ملوا دے۔ میرا اپنے آپ سے رابطہ نہیں ہوا، میں اپنے من میں نہیں ڈوبا۔ مجھے توفیق دے کہ میں اپنے آپ کو تلاش کرلوں۔ جب آدمی اپنے آپ کو تلاش کر لیتا ہے تو اس کی زندگی اللہ کی مخلوق کیلئے مفید بن جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ اور زبان سے انسانوں کو فائدہ پہنچنا شروع ہو جاتا ہے۔

فیض پہنچایئے

زندگی میں کلیہ بنا لیجیے کہ سب کچھ بن جائیں گے، بے فیض انسان نہیں بنیں گے۔ درخت جب بے فیض ہو جاتا ہے اس کو بھی چولھے میں ڈال کر جلا دیا جاتا ہے۔ ہماری زندگی بے فیض نہیں ہونی چاہیے۔ یہ سودمند ہونی چاہیے، بے غرض ہونی چاہیے ،ہم سے جڑے لوگوں کیلئے آسانی ہونی چاہیے۔ اپنی زندگی میں ایک کام سو فیصد اس لیے کریں کہ مالک، یہ کام میں اس لیے کر رہا ہوں کہ مجھے میرا مقصد مل جائے۔ وہ چاہے روٹی کھلانا ہی کیوں نہ ہو، وہ راستہ بتانا ہی کیوں نہ ہو، کسی غریب کی مدد کرنا ہی کیوں نہ ہو، خاص کر ایسے شخص کی مدد جس سے شکریہ بھی نہیں مل سکتا۔

مقصد کی تلاش ایک ایسا سوال ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے ہاں ''ناں'' نہیں ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے حضور یہ سوال ضرور رکھیے۔ اس کا جواب آنا ہی آنا ہے۔ یہ واحد سوال ہے جس کا جواب فوراً آتا ہے۔ بعض اوقات لگتا نہیں ہے کہ فوری جواب آگیا ہے، لیکن زندگی میں کہیں آگے جا کر جب کسی لمحے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو یاد آتا ہے کہ سفر وہیں سے شروع ہوا ہے جس رات میں نے دعا مانگی تھی۔



کل کا انتظار نہ کیجیے

"جب ہماری زندگی میں سانحات و حادثات ہوتے ہیں تو ہم دو طرح اُن پر ردِعمل کرسکتے ہیں: یا تو امید چھوڑ دیں اور بری عادات میں گرفتار ہو جائیں؛ یا انھیں چیلنج سمجھتے ہوئے خود کو قوی کریں!"

دلائی لاما

جب میں کالج میں پڑھتا تھا تو میرے کچھ دوست دوسرے شہروں سے آئے ہوئے تھے۔ ان میں ایک کا تعلق گاؤں سے تھا۔ اسے یہ خوف بہت زیادہ رہتا تھا کہ اگر میں ہوسٹل سے نکل کر شہر میں جاؤں گا تو گم ہو جاؤں گا، کہیں کوئی مجھے اغوا نہ کرلے۔ وہ اکثر مجھے کہا کرتا کہ میں لاہور میں نیا ہوں، آپ مجھے لاہور کی سیر کرا دیں۔ میں اس کے ساتھ وعدہ کرتا کہ ایک دن میں تمھیں ضرور لاہور دکھاؤں گا۔ لیکن وہ وعدہ وعدہ ہی رہتا۔

ایک دفعہ ہم سب دوستوں نے اس کے ساتھ پکا وعدہ کرلیا کہ جب چھٹیاں ختم ہوں گی تو ہم لاہور شہر دیکھنے چلیں گے۔ چھٹیاں ہوئیں، ختم ہوگئیں، کالج کی کلاسیں شروع ہوگئیں، لیکن وہ کلاس سے غیر حاضر تھا۔ ہم بڑے حیران ہوئے کہ وہ کہاں چلا گیا۔ اسی کالج میں اسی کے گاؤں کا ایک سینئر کلاس فیلو تھا۔ ہم تمام دوست مل کر اس کے پاس گئے اور اسے کہا کہ ہمارا دوست کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ چھٹی کے تیسرے دن اس کا انتقال ہوگیا۔ ہم سب بہت حیران ہوئے اور پوچھا، وہ کیسے۔ اس

نے کہا کہ چھٹی کے تیسرے دن وہ سڑک کراس کر رہا تھا کہ ایک بس سے اس کی ٹکر ہوئی اور وہ فوت ہو گیا۔ یہ سن کر ہم سب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ہمیں اس کی موت کا بہت دکھ ہوا، مگر ہمیں اس سے بھی زیادہ دکھ اس بات کا ہوا کہ ہم اس کی خواہش پوری نہ کر سکے۔ ہمارے پاس پچھتاوے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس طرح کے واقعات زندگی میں ایک دفعہ نہیں ہوتے، کئی دفعہ ہوتے ہیں۔

ایسے طلبہ کثیر تعداد میں ہیں جو کہتے ہیں کہ جب اگلی کلاس میں جائیں گے تو پھر محنت کریں گے۔ لیکن جب وہ اگلی کلاس میں جاتے ہیں تو پھر یہی کہتے ہیں کہ اگلی کلاس میں جا کر پھر محنت کریں گے۔ اسی طرح، بڑی عمر کے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم جلد نماز پڑھنا شروع کریں گے، لیکن اُن کی نمازیں شروع نہیں ہوتیں۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم نیک ہو جائیں گے، لیکن وقت گزرتا رہتا ہے اور وہ نیکیاں نہیں کما پاتے۔ ہم زندگی میں بے شمار مرتبہ پلان کرتے ہیں کہ ہم یہ کریں گے، ہم وہ کریں گے، لیکن نہیں کرتے۔ جب وقت گزرتا ہے تو پھر پچھتاوا بن جاتا ہے۔

وقتی موٹیویشن

ہم جب کبھی کوئی تقریر یا لیکچر سنتے ہیں تو اس وقت ہماری موٹیویشن کا گراف بہت اونچا ہو جاتا ہے، لیکن جیسے ہی اگلا دن آتا ہے، وہی روٹین شروع ہو جاتی ہے۔ یاد رہے کہ موٹیویشن کا مطلب ہوتا ہے کہ انتظار نہیں کرنا، ابھی فیصلہ کرنا اور شروع کر دینا ہے۔ اکثر لوگ اپنے والدین کا ادب نہیں کرتے۔ جب وہ دنیا سے چلے جاتے ہیں تو پھر وہ برسی مناتے ہیں، قبر پر پھول چڑھاتے ہیں، ان کیلئے قرآن خوانی کراتے ہیں، لیکن یہ سب کچھ کرنے سے والدین واپس نہیں آسکتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اُن کیلئے ثواب کی محفلیں ہونی چاہئیں، مگر اُن کے ہوتے ہوئے ان کی بات نہیں مانی، ان کا کہنا نہیں مانا، ان کو راضی نہیں کیا، انھیں خوش نہیں کیا، ان کے دل کو ٹھنڈک نہیں پہنچائی تو پھر اُن کے جانے کے بعد ان چیزوں کی اتنی اہمیت نہیں رہتی۔ دنیا میں تو آپ اُن کا دل دکھا چکے۔ جب دل میں یہ بات آئے کہ میں تھوڑی دیر تک کام کروں گا تو فوری طور پر اپنے

سینے پر ہاتھ رکھیں اور اپنے آپ سے کہیے ابھی شروع کرنا ہے۔ حضرت شیخ سعدی فرماتے ہیں، ''جو کہتا ہے کہ میں کل سے شروع کروں گا، اس کا کل کبھی نہیں آتا'' کیونکہ جنھیں کرنا ہوتا ہے، وہ کل کا انتظار نہیں کرتے۔ اپنے ہر دن کو نئی زندگی سمجھے، کیونکہ جو بھی دن شروع ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے لیے نعمت ہوتا ہے۔ اس دن کی ہر شے ہمارے نام ہوتی ہے۔

دس کام

دس کام سوچ لیجیے جیسے پڑھنا، اچھا انسان بننا، والدین کا احترام کرنا، نماز پڑھنا، کسی کے کام آنا، اخلاق بہتر بنانا، مسکرانا، سلام کرنا، کسی کا دل نہ دکھانا اور اپنی زندگی کو نئی زندگی بنانا وغیرہ وغیرہ۔ ان کاموں کے بارے میں فوری فیصلہ کیجیے اور شروع کر دیجیے۔ کسی کام کی شروعات میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ کام کو شروع تو ایک فرد کرتا ہے، لیکن اس کے دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی یہ کام شروع کر دیتے ہیں۔ نصیحت کرنے سے تبدیلی نہیں آتی، عمل کرنے سے تبدیلی آتی ہے۔ آپ اگر محنتی ہیں تو کچھ عرصہ بعد آپ مثال بن جائیں گے۔

بعض اوقات فیصلہ چھوٹا لگتا ہے، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ فیصلہ چھوٹا نہیں تھا بلکہ بہت بڑا فیصلہ تھا۔ دنیا میں جتنے بھی رفاہی کام ہیں، وہ چھوٹے سے عمل سے شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت بڑے بن گئے۔ جیسے عبدالستار ایدھی جنھوں نے اپنے کام کا آغاز ایک ریڑھی سے کیا، آج گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں ان کا نام شامل ہو گیا۔

کوئی بھی کام شروع کریں تو پہلے دو نفل ضرور پڑھیں اور اللہ تعالیٰ سے اس کام کی کامیابی کی دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگیں کہ اے اللہ مجھے استقامت دے اور میری ہمت بڑی کر دے، کیونکہ ہمت بڑھنے سے مسئلے چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ جب دل میں اپنے آپ کو بدلنے کا سوال اٹھے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیجیے۔ اپنی موجودہ زندگی کے احساسِ زیاں کا پیدا ہونا بہت بڑی نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو یہ احساس دے دیتا

ہے، وہ فوری طور پر اپنے آپ پر غور کرتے ہیں اور پھر عمل کا فیصلہ کرتے ہیں اور کام شروع کردیتے ہیں۔



شکر گزاری سے زندگی بدلیے

''جب ہم شکر گزاری کی بات کرتے ہیں تو یہ سمجھ لیجیے کہ شکر گزاری الفاظ کی ادائیگی نہیں، طرزِ حیات کا نام ہے!''

جان ایف کینیڈی

انسان کی اصل کمائی اس کے وہ دوست ہوتے ہیں جو مشکل وقت میں اس کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ آخر اس کے پیچھے کیا راز ہے؟ اس کا جواب ایک جادو ہے جسے سیکھے بغیر حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ سوشل سرکل کا ٹارگٹ بڑھانے کیلئے یہ جادو سیکھنا پڑتا ہے اور اس جادو کا نام ہے، شکر گزاری۔

شکر گزاری کے دو حصے ہیں: ایک اظہار کرنا اور دوسرا محسوس کرنا۔ ہر شخص کے ساتھ کچھ لوگ جڑے ہوتے ہیں جن میں کچھ کام کے ہوتے ہیں۔ اور جو کام کے ہوتے ہیں، ان کے ساتھ بھی کچھ لوگ جڑے ہوتے ہیں اور وہ بھی آپ کے کام کے ہوتے ہیں۔ یوں، آپ کا نیٹ ورک بنتا ہے اور انسانوں کے ساتھ مل کر زندگی کا سفر مکمل ہوتا ہے۔

میں ایک سیمینار میں ٹکٹ لے کر بیٹھ گیا۔ مجھے لیکچر بہت پسند آیا۔ باتیں بہت شاندار تھیں۔ اس لیکچر سے مجھے بہت موٹیویشن ملی۔ بیٹھے بیٹھے میں نے اس ٹیچر کو اپنا استاد تسلیم کر لیا، لیکن میرے دل میں خیال آیا کہ میں نے تو ان کو ٹیچر تسلیم کر لیا ہے، لیکن انھیں کیسے پتا چلے گا کہ میں اُن کا شاگرد بن گیا ہوں۔ پرانے زمانے میں رواج تھا کہ جس کو استاد مانا جاتا تھا، اس کیلئے کپڑوں کے دو جوڑے اور مٹھائی کا ڈبا لے کر اس کے

پاس جایا جاتا تھا۔ آج بھی جو لوگ موسیقی سیکھتے ہیں، وہ ایسا ہی کرتے ہیں۔ دیکھا جائے تو درحقیقت انھیں مٹھائی کا ڈبا اور کپڑے دینے نہیں جاتے بلکہ وہ شکر گزاری کا اظہار ہوتا ہے۔ میں نے لیکچر کے دوران چیزوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ ان میں کچھ ایسی چیزیں تھیں جن میں بہتری کی گنجائش تھی۔ میں نے دیکھا کہ شرکا جو کارڈ اپنے سینے پر لگائے ہوئے تھے، وہ خوبصورت نہیں تھے۔ ان پر ہاتھ سے نام لکھا ہوا تھا اور ان کا کور بھی اچھا نہیں تھا۔ میں وہاں سے اٹھا اور پرنٹنگ پریس چلا گیا۔ وہاں سے شان دار کارڈ بنوائے۔ اس کے بعد اُردو بازار سے کارڈ جیکٹس لیں۔ اگلے دن میں نے سر کو کال کی اور کہا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا، ٹھیک ہے۔ میں ان کے دفتر چلا گیا اور ان سے کہا کہ سر میں آپ کیلئے ایک چھوٹا سا تحفہ لایا ہوں۔ انہوں نے کہا، جی ضرور پیش کریں۔ میں نے وہ کارڈ اُن کے سامنے رکھ دیے۔ انہوں نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ میں نے عرض کیا، سر، آپ کا سیشن زبردست رہا، میرا جی چاہا کہ اس میں کچھ نیا ایڈ ہو جائے لہٰذا مجھے اس کیلئے اور تو کچھ نہیں ملا، میرا پرنٹنگ اور اسٹیشنری کی چیزوں سے شغف ہے تو سوچا کہ میں یہ چیزیں آپ کیلئے لیتا چلوں۔

اس ملاقات سے میرا اور استاد کے ساتھ تعلق بن گیا۔ پھر یہ تعلق اور آگے بڑھا تو پتا چلا کہ سر کا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ سر نے مجھے بیٹا بنالیا۔ ان کی کئی کتابیں ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں کے شروع میں میرے متعلق لکھا، ”میرا بیٹا قاسم علی شاہ“۔ یہ تعلق آخری نہیں تھا۔ اس کے بعد میری زندگی میں جتنے بڑے لوگ آئے، وہ انھی استاد محترم کے ذریعے آئے۔ وہ جاوید چوہدری ہوں، وہ بلال قطب ہوں، وہ پروفیسر احمد رفیق اختر ہوں، سب کے سب جتنے بڑے لوگ کہ جن سے میں نے سیکھا، اس عظیم استاد کی وجہ سے تھے جن کا نام پروفیسر ارشد جاوید ہے۔

اگر میں شکرگزاری کا احساس نہ دلاتا تو وہ سارے راستے نہ کھلتے جو شکر گزاری میں چھپے ہوئے تھے۔

شکر گزاری کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ”جو شخص انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا، وہ خدا کا شکریہ بھی ادا نہیں کرتا۔“ انسان کی

زندگی میں آنے والا شخص اگر اچھا ہے تو وہ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ اگر اس نعمت کا بار بار انکار ہوگا تو پھر زندگی میں اچھے لوگ آنا بند ہو جائیں گے۔ شکر گزاری صرف زبان، صرف شکریہ کہنے سے، صرف تھینک یو سے نہیں ہوتی، بلکہ یہ تو احساس کا نام ہے۔ زبان سے شکر چاہے سو بار کرلیا جائے، اور دل میں احساسِ شکر نہ ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن جب احساس میں شکر گزاری ہو تو اس فرد میں سے شعاعیں نکلنا شروع ہو جاتی ہیں اور وہ شعاعیں مواقع لے کر آتی ہیں۔ آدمی جتنا مثبت ہوگا، اتنی ہی مثبت چیزیں اس کی طرف آئیں گی۔

جب انسان اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے کہ ''اے میرے رب'' تو پھر یقین بھی رکھنا چاہیے کہ وہ سن رہا ہے، کیونکہ ''میرا'' تو اپنے کو ہی کہا جاتا ہے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی اپنا ہو اور وہ بات نہ سنے۔ اللہ تعالیٰ کو پکارنے کے بعد اس سے اچھی امید لگانی چاہیے، کیونکہ جب اچھی امید ہوگی تو پھر حادثوں اور برے لوگوں سے نجات مل جائے گی۔

شکر گزاری کے اظہار کا ایک طریقہ یہ ہے کہ وہ چیز جس کا شکر ادا کرنا ہو، اسے اہمیت دیجیے۔ مثال کے طور پر، اللہ تعالیٰ نے گاڑی دی ہے تو اس کی حفاظت شکر گزاری ہے۔ اسے احتیاط سے چلانا شکر گزاری ہے۔ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے دی ہے، اس کا صحیح استعمال شکر گزاری ہے۔ جس بندے کے شکر گزار ہیں، اس کے کام آئیں۔ جس درخت کے نیچے بیٹھ کر چھاؤں لیتے اور پھل کھاتے ہیں، اس کو پانی دیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو کرنے سے کائنات سے تعلق بنے گا جو نئے مواقعوں کا باعث بنے گا۔

ایک آدمی کو ٹیٹوز (Tattoo) بنوانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دفعہ وہ ٹیٹو بنانے والے کے پاس گیا اور اسے کہا کہ شیر بنا دو۔ اس نے کہا کہ کہاں بنانا ہے؟ اس نے کہا کہ میری کمر پر شیر بنا دو۔ شیر بنانا شروع کر دیا گیا۔ جب ٹیٹوز بنانے والا آلہ اس کے جسم کو چھوا تو وہ گرم تھا۔ اس آدمی نے کہا، کیا کر رہے ہو؟ ٹیٹو بنانے والے نے کہا کہ شیر کا چہرہ بنا رہا ہوں۔ آدمی بولا، اس کا چہرہ چھوڑ دو، مجھے تکلیف ہوتی ہے، کچھ اور جگہ۔ کاری گر نے چہرہ چھوڑ دیا اور شیر کی ٹانگیں بنانا شروع کر دیں۔ آدمی کو پھر تکلیف ہوئی تو اس نے پھر پوچھا کہ کیا بنا رہے ہو؟ اس نے جواب دیا، شیر کی ٹانگیں بنا رہا

ہوں۔ آدمی نے کہا، ٹانگیں نہ بناؤ، باقی بنا دو۔ کاری گر نے ٹانگیں چھوڑیں اور شیر کا پیٹ بنانا شروع کر دیا۔ اس نے پھر پوچھا، کیا بنا رہے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ میں شیر کا پیٹ بنا رہا ہوں۔ آدمی تکلیف کے باعث بولا، یہ پیٹ رہنے دو، باقی بنا دو۔ کاری گر نے اپنا اوزار زمین پر دے مارا اور کہا کہ شیر نہیں بن سکتا۔ یعنی تھوڑی سی تکلیف برداشت کیے بغیر شیر نہیں بنوایا جا سکتا۔ ہمارا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ بعض اوقات ہماری زندگی میں جو فرد آتا ہے، وہ ہمیں بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ لیکن جب اپنا زاویہ نظر بدلتے ہیں اور قدرت کی جگہ پر جا کر سوچتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ کیوں میری زندگی میں داخل ہوا۔ مثال کے طور پر، زندگی کی قدر نہیں تھی، سنجیدگی نہیں تھی۔ ایک فرد آپ کی زندگی میں ایسا آیا کہ اس نے آپ کو کچھ ہی عرصہ میں پاؤں کے نیچے رکھ کر روند ڈالا۔ تب جا کر آپ کو ہوش آیا، زندگی کی اہمیت پتا چلی اور غیر سنجیدگی ختم ہوگئی۔

حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''اس گناہ کا بھی شکریہ ادا کرو جس نے تمہیں توبہ پر مجبور کر دیا۔'' ہم سوچیں کہ ہم توبہ کس سے کر رہے ہیں۔ توبہ تو ہم اللہ تعالیٰ سے کر رہے ہیں۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ ہم اُس کے دروازے پر چلے گئے۔ بعض اوقات ایک گناہ ایسا رلاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو رحم آجاتا ہے۔

کبھی پیچھے مڑ کر اپنی زندگی میں دیکھئے، کتنے لوگ آپ کی بہتری کیلئے آپ کی زندگی میں داخل ہوئے۔ آدمی ایک جگہ جامد کھڑا ہوتا ہے اور پھر ایک ایسا فرد زندگی میں داخل ہوتا ہے جو اس کو موٹیویٹ کر دیتا ہے اور پھر زندگی کی گاڑی کا رخ ہی بدل جاتا ہے۔ البتہ یہ آپ پر ہے کہ آپ اپنی زندگی میں آنے والے افراد سے کیوں کر سیکھتے ہیں۔ حتیٰ کہ آپ اپنے گرد موجود منفی فرد سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ اس منفی فرد کو دیکھ کر تجزیہ کیجیے کہ اس میں کیا کیا خامیاں ہیں، اور پھر تہیہ کیجیے کہ آپ یہ خامیاں اپنے اندر پیدا ہونے نہیں دیں گے۔

شکر گزار انسان جس جگہ ہوتا ہے، وہ اس جگہ کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ وہ جس چھت کے نیچے بیٹھتا ہے، وہ اس چھت کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ سخت سردی میں اللہ کا ایک بندہ کسی بزرگ کے پاس پہنچا اور کہا، باباجی مجھے کچھ نصیحت کیجیے۔ بزرگ نے کہا کہ بیٹا،

پہلا سبق یہ ہے کہ تم نے جو کوٹ پہنا ہوا ہے وہ اتار دو۔ اس نے وہ کوٹ اتار کر رکھ دیا۔ بزرگ نے کہا کہ اگلے دو دن ایسے ہی رہنا ہے۔ شروع میں تو اسے کچھ نہ ہوا، مگر جیسے ہی رات ہوئی تو سردی کی وجہ سے اس کا جسم جمنا شروع ہو گیا اور اگلے دن اس کو نمونیا ہو گیا۔ دوسرے دن بزرگ نے کوٹ واپس کر کے کہا کہ بیٹا یہ اس لیے کیا ہے کہ اگر کسی کو سردی لگ رہی ہو تو اپنا کوٹ اتار کر اس کو دے دینا۔ شکر گزاری کا تب پتا لگتا ہے کہ جب چیز چھن جائے۔ بزرگ نے اگلا سبق یہ دیا کہ آج کھانا نہیں کھانا۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے۔ اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اگلا دن آنے تک اس کا بلڈ پریشر کم ہو چکا تھا۔ جب مرنے کو ہو گیا تو بزرگ نے کہا کہ کھانا کھا لو اور ساتھ ہی کہا کہ میری بات یاد رکھنا کہ بھوکا ملے تو اسے کھانا ضرور دینا۔ جب اپنے اندر کمی ہوتی ہے تو پھر دوسرے کی مجبوری کا بھی احساس ہوتا ہے۔

خوش نصیب ہے وہ اولاد جو اپنے والدین کی خدمت کرتی ہے اور خدمت بھی وہی کرتی ہے جس میں شکر گزاری ہوتی ہے۔ فہرست بنائیے اور اس میں ان لوگوں اور ان چیزوں کے نام لکھیے جن کا شکریہ ادا کرنا آپ کے ذمے ضروری ہے۔ لکھیے کہ ان کا شکریہ کس طرح ادا کرنا ہے۔ جب اس طرح شکر گزاری ہو گی تو اللہ تعالیٰ خوش ہو گا اور بدلے میں مزید نعمتوں کی بارش ہو گی۔



مثبت برتاؤ کیسے اپنایا جائے

''مثبت تبدیلی کی بنیاد اپنے سے نیچے والوں کی خدمت میں ہے!''

لی لاکوکا

ہم اپنی زندگی میں ہونے والے واقعات کو نہیں بدل سکتے، لیکن ان واقعات کے ردِعمل کو بدل سکتے ہیں۔ برتاؤ (Behavior) درحقیقت وہ ردِعمل ہوتا ہے جو آدمی کسی واقعے پر ظاہر کرتا ہے۔ اہم یہ ہے کہ اپنے ردِعمل کو اس وقت تک تبدیل نہیں کیا جاسکتا جب تک یہ فیصلہ نہیں ہوتا کہ کون کون سی صورتِ حال میں اپنے ردِعمل کی وجہ سے نقصان اٹھایا۔ جب پتا چلا کہ میں نے جو نقصان اٹھایا، اس میں ردِعمل منفی تھا یا اس طرح کا برتاؤ ظاہر نہیں کرنا چاہیے تھا یا اس طرح نہیں سوچنا چاہیے تھا یا برتاؤ کا انتخاب غلط تھا... تو پھر خود کو بدلنا آسان ہوجاتا ہے۔

ہم جس طرح کا ردِعمل دیتے ہیں، ان میں زیادہ تر کو ہم لاشعوری طور پر منتخب کرتے ہیں۔ ہم نے کبھی شعوری طور پر جانچا ہی نہیں ہوتا کہ کیا فلاں واقعہ کے نتیجے میں ہمارا عمل درست تھا یا غلط۔

برتاؤ وقت کے ساتھ بنتا ہے۔ زندگی میں آنے والے تجربات اور مشاہدات سے جو تربیت ہوتی ہے، وہ ردِعمل کی تشکیل کرتی ہے۔ مثال کے طور پر، مشکل حالات میں یہ کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ بہت ظلم ہوا۔ جب اس طرح کے حالات دوبارہ دیکھتے ہیں تو پھر اسی کا اظہار ہوتا ہے کہ جو کچھ سیکھا ہے۔ اس برتاؤ کو شعوری طور پر بدلنا پڑتا ہے۔ اور یہ تبھی ہوسکتا ہے کہ جب زندگی میں انسپائریشن ہوگی، تحریک ملے گی۔ اگر انسپائریشن منفی ہو تو بدلنا مشکل ہوجاتا ہے۔ اگر انسپائریشن مثبت ہو تو پھر تبدیلی بہت آسان

ہو جاتی ہے۔

ایک تحقیق کے مطابق، وہ تمام لوگ جن کا رجحان جرائم کی طرف ہوتا ہے یا جن کے اندر لڑنے مرنے کا جذبہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنھوں نے کسی دور میں ایسی خبریں پڑھی یا دیکھی ہوتی ہیں جن میں مار دھاڑ کا ذکر ہو۔ اس وجہ سے ان کے لاشعور میں مار دھاڑ اور تشدد کا ڈیٹا جمع ہوتا ہے۔ انھیں پتا ہی نہیں چلتا کہ ان کے اندر کتنی منفیت داخل ہو چکی ہے۔ جب اتنی منفیت ہوتی ہے تو پھر ان میں عدم برداشت زیادہ ہو جاتی ہے اور ان کا ردِعمل بھی منفی ہو جاتا ہے۔

نیوز چینل، ایکشن موویز اور گیمز

وہ بچے جنھوں نے بچپن میں تشدد دیکھا ہو وہ چاہے گھر میں ہو یا باہر، ایسے بچے جب بڑے ہوتے ہیں تو ان کا برتاؤ منفی ہوتا ہے۔ گھروں میں جب نیوز چینل پر خبریں دیکھی جاتی ہیں یا ایکشن موویز دیکھی جاتی ہیں تو بچوں کے ذہنوں اور کردار پر جو ان کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، وہ پوشیدہ نہیں۔ اب تو بچوں کے گیم بھی تشدد اور مار دھاڑ سے بھرپور ہوتے ہیں۔ آپ بہ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ بچے بڑے ہو کر کیا بنیں گے۔ برتن سے نکلنا وہی ہے جو اس میں ڈالا گیا ہو۔ اگر ذہن کے برتن میں منفی ہے تو پھر ردِعمل بھی منفی ہوگا۔ ہمارا برتاؤ لاشعوری طور پر بنتا ہے۔ جیسے جیسے ہم پختہ ہوتے ہیں، ویسے ویسے برتاؤ بھی پختہ ہو جاتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسے بدلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

زندگی کے ابتدائی ایام میں ہر چیز میں انسپائریشن ہوتی ہے۔ بچہ ہر چیز کو حیرت سے دیکھتا ہے۔ یوں، لاشعوری سطح پر رول ماڈل بننا شروع ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے رویے بھی بنتے ہیں۔ پھر وہی رویے شخصیت اور کردار کی تشکیل کرتے ہیں۔

دس ایسی صورت ہائے حال کی فہرست بنائیے جن میں آپ کو آپ کے رویے کی وجہ سے نقصان ہوا ہو۔ مثلاً، کسی اپنے سے جھگڑا ہو گیا ہو، کسی سے دوری ہو گئی ہو، کوئی کاروبار کی ڈیل خراب ہو گئی ہو، نوکری چلی گئی ہو، کوئی موقع کھو دیا ہو، زندگی میں اچھے

لوگ کم ہو گئے ہوں یا پھر گھر میں اہمیت کم ہو گئی ہو۔ ان تمام صورتوں کے اسباب نکالیے۔ پھر ان کے نتائج دیکھیے۔ اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ کہاں کہاں خود سے غلطی ہوئی اور کہاں کہاں میں صحیح تھا۔“

فائدے اور نقصان کو ماپنے سے تبدیلی آسان ہو جاتی ہے۔ ہم نے کبھی رسک مینجمنٹ سیکھی ہی نہیں ہوتی تو ہمیں پتا ہی نہیں ہوتا کہ زندگی میں آنے والے خطرات و خدشات سے کیسے نمٹنا ہے۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ان جانے میں اٹھایا گیا ایک قدم کتنی پستی میں لے جا سکتا ہے۔ ہمیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ ہمارا رویہ ہمیں فائدہ دے گا یا نقصان پہنچائے گا۔

محض ورکشاپس کافی نہیں

آج کل ہمارے ہاں سیلف امپروومنٹ کے متعلق بہت زیادہ ٹریننگ ہو رہی ہیں۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور اس کلچر کو پروان چڑھایا جانا چاہیے۔ لیکن اگر ایک ٹرینر صرف سلائیڈیں چلا کر ڈیٹا بتا کر چلا جاتا ہے تو اس سے رویوں اور برتاؤ میں تبدیلی نہیں آئے گی۔ رویوں کے متعلق پڑھانا ایک کمزور عمل ہے جبکہ رویے کو سیکھنے کا سب سے طاقتور اوزار خود آپ کا اپنا رویہ ہے۔ کسی کا اچھا کردار کسی کو اچھا بنا سکتا ہے۔ کسی کا اچھا اخلاق کسی میں اچھا اخلاق پیدا کر سکتا ہے۔ کسی کے ساتھ شائستگی سے اور بہتر انداز میں کی گئی بات مخالف کے رویے کو بدل دیتی ہے۔

اگر ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ دیکھیں کہ جب آپؐ پر کوڑا پھینکا گیا تو آپؐ نے اس بڑھیا کے برتاؤ کی طرح جواب نہیں دیا۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے معاف فرما دیا۔ جب بڑھیا نے کوڑا نہیں پھینکا تو آپؐ اس کی عیادت کیلئے اس کے گھر چلے گئے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ردِعمل تھا۔

جینا سیکھنا اہم تر ہے

تعلیمی اداروں میں بچوں کو جی پی اے لینا سکھایا جاتا ہے جس سے ان کی

یادداشت اچھی ہو جاتی ہے۔ بچے کتابوں کے حافظ بن جاتے ہیں، لیکن جینا نہیں سیکھتے۔ کسی کو کھانا کھاتے دیکھیں تو ایسا لگے گا جیسے اس کو بہت جلدی ہے، اس کی گاڑی چھوٹے جا رہی ہے۔ کسی کو کام کرتے دیکھیں تو لگے گا کہ وہ بہت جلدی میں ہے۔ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو دیکھیں تو وہ لوگ جلدی میں نظر آئیں گے۔ کسی کو گاڑی چلاتے دیکھیں تو لگے گا کہ وہ بڑی جلدی میں ہے۔ ہم زندگی کے ہر کام کو اتنی تیزی سے کرتے ہیں کہ اپنی شخصیت کی طرف دھیان ہی نہیں رہتا۔ اسی تیزی کی وجہ سے آج کا انسان دن، ہفتے، مہینے اور سال کو گزارنے کا عادی ہو چکا ہے۔ وہ زندگی گزارتا ہے، جیتا نہیں ہے۔

کسی بھی صورتِ حال میں برتاؤ مثبت رکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ جینا آ جائے۔ دن کو دن بنانا آئے، وقت کو مزے کا وقت بنانا آئے۔ اگر یہ یقین ہے کہ آج کا دن گزر جائے گا، کل کا دن اس سے بہتر آ سکتا ہے تو آپ اس امید کے چراغ کو بجھنے نہیں دیتے تو پھر سکون آنا شروع ہو جائے گا۔ اگر آپ کچھ سوشل ہیں تو دوستوں کا ایک ایسا حلقہ بنائیے جس میں آپ شیئر کر سکیں، کیونکہ مسئلے ان کے زیادہ بڑے ہوتے ہیں جن کے پاس اپنا سر رکھنے کو کندھا نہیں ہوتا۔ بابا جی اشفاق احمدؒ فرمایا کرتے تھے کہ ''ہماری قوم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس کندھا نہیں ہے اور ہر شخص کو کندھے کی ضرورت ہے۔''

اگر آپ کے پاس کندھا ہے، آپ شیئرنگ کر لیتے ہیں تو شاید مسئلے تو حل نہ ہوں، لیکن آپ کے مسئلے چھوٹے ضرور ہو جائیں گے۔ اپنے مسائل پر غور و فکر کیجیے اور ان کی حقیقت کو جانئے، کیونکہ زندگی کے نوے فیصد مسئلے اپنی ذات میں خامی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ ذات میں کوئی نہ کوئی خامی ایسی ضرور ہوتی ہے جسے صحیح نہیں کیا گیا ہوتا۔ اس خامی کے باعث مسئلہ یا مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس خامی کو دور کرنے کی پوری کوشش کیجیے۔

اچھا اخلاق ہی اچھا انسان بناتا ہے

اگر آپ یہ ارادہ کر لیتے ہیں کہ مجھے ہر مہینے اپنے ایک برتاؤ کو بہتر کرنا ہے اور اس کے اوپر کام کرنا ہے تو پھر یہ دور نہیں ہے کہ سال گزرے اور آپ سال کے بارہ مہینوں میں بارہ مثبت برتاؤ اختیار کر چکے ہوں۔ حدیث کا مفہوم ہے کہ جس کا اخلاق اچھا ہے، وہ خوش قسمت ہے؛ اور جس کا اخلاق برا ہے، وہ بدقسمت ہے۔ اس سے بڑی خوش قسمتی کوئی نہیں کہ اچھا اخلاق سیکھ لیا جائے۔ کسی بھی صورت حال میں مثبت رہنا سیکھ لیا جائے۔ اگر ہر مہینے ایک برتاؤ ٹھیک ہوتا ہے تو پھر آنے والے دنوں میں وہ ایک برتاؤ بھی آپ کی زندگی کی کامیابیوں میں اہم کردار ادا کرے گا۔

❁

خود اور خود شناسی

''کسی دوسرے سے محبت میں سب سے تکلیف دہ مرحلہ وہ ہوتا ہے کہ جب آدمی یہ بھول جاتا ہے کہ اس کی سب سے زیادہ محبت اور عزت کا مستحق وہ خود ہے!''

ارنسٹ ہیمنگوے

ہماری ذات خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جو خوبی ہماری شناخت بنتی ہے، اس سے دوام ملتا ہے۔ یہ قدرت کا انعام ہوتا ہے۔ اس خوبی کو ہمیں لے کر چلنا ہوتا ہے۔ قدرت اپنے کارخانے کو چلانے کیلئے ہر انسان میں کچھ ایسی صفات رکھ دیتی ہے کہ کائنات میں جو کمی ہوتی ہے، وہ اس سے پوری ہو جاتی ہے۔ کائنات کا یہ نظام چلتا آرہا ہے اور چلتا رہے گا۔ ہم نے پچھلے لوگوں کی جگہ لی، پھر ہماری جگہ اور لوگ لے لیں گے۔ لیکن آج کے وقت میں ہمارا موجود ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اس نظام میں ہماری ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ہمیں یہ زندگی عطا کی گئی ہے۔

انسان میں یہ تجسس رہتا ہے کہ میں خود کو جانوں، مجھے جانا جائے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ مجھ میں ابھی جو کمی ہے، ابھی جو کچھ باقی ہے اسے مکمل کرنا ہے۔ یہ تجسس ''خودشناسی'' کہلاتا ہے۔ یہ تجسس عمر کے کسی بھی حصے میں کسی کے دل میں بھی سما سکتا ہے۔ یہ سوال کبھی بھی اٹھ سکتا ہے کہ میں کون ہوں، میں کدھر جا رہا ہوں اور مجھے جانا کہاں ہے۔ تاریخ میں جن لوگوں نے خود کو جانا، وہ صوفیائے کرام ہو سکتے ہیں، وہ

اولیائے کرام ہو سکتے ہیں، وہ نیک لوگ ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جنھوں نے معاشرے کیلئے کوئی کام کیا۔ مثال کے طور پر، اگر آئن سٹائن کا نام لیا جائے تو اس کی دریافتیں معاشرے کیلئے بہت فائدہ مند ثابت ہوئیں۔ اس کی شناخت علم سے جڑی ہے۔ یہ اُس کے اندر کی خودی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میری دریافت کا عمل اس طرح ہے کہ جب میں کسی چیز کی دریافت کے پیچھے پڑ جاتا ہوں اور وہ ہو جاتی ہے تو اگلے کام کی طرح پچھلا کام بھول جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں سوچتا بھی نہیں ہوں کہ اس سے پہلے میں نے کوئی کام کیا تھا۔ میں جو کام کر رہا ہوتا ہوں، وہ میرے لیے نیا کام ہوتا ہے۔ میں اپنی پوری توانائی اس میں لگا دیتا ہوں۔

مشکلات و مصائب نعمت ہیں

جن لوگوں کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے خود کو جان لیا، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے خود کو جان لینے کے بعد وہ کام کیا جس کیلئے وہ پیدا کیے گئے تھے۔ عام طور پر خود کو جاننے والا شخص خود کو اس وقت جانتا ہے کہ جب وہ مصیبت و آلام میں مبتلا ہوتا ہے۔ جتنی خود شناسی انسان کو تکلیف میں ہوتی ہے، اتنی خوشی اور راحت میں نہیں ہوتی۔ غم، تکلیف اور مشکلات کا دَور انسان کو اپنے آپ سے آگاہ کرتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''جس کی آنکھ میں آنسو ہیں وہ خدا کہ راہ میں رحمت سے محروم نہیں ہو سکتا۔'' خدا کی رحمت سب سے پہلے اس شخص کیلئے ہوتی ہے جس کی آنکھ میں آنسو ہوں، کیونکہ اس وقت دل شکستہ اور ٹوٹا ہوا ہوتا ہے اور شکستہ دل نرم ہوتا ہے۔

عبدالستار ایدھی جب پیدا ہوئے تو ابتدائی ایام ہی میں ان کی والدہ کو طلاق ہوگئی جس کی وجہ سے اُن پر غربت اور غم کے سائے رہتے تھے۔ اسی کسمپرسی کی حالت میں وہ والدہ کے ساتھ پاکستان آگئے اور کراچی میں گولیاں ٹافیاں بیچنا شروع کر دیں۔ لیکن اندر یہ جذبہ تھا کہ جس محرومی کا مجھے سامنا رہا، اس کا ازالہ مجھے دوسروں کیلئے کرنا ہے۔ لہٰذا، انھوں نے اپنی ریڑھی سے کام شروع کر دیا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کا نام

گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج ہوا۔ ان کے بچپن کی محرومی ان کی طاقت بن گئی۔ انھوں نے خود کو جان لیا کہ میں دوسروں کی خدمت کیلئے پیدا ہوا ہوں۔

جو خود کو جان لیتا ہے، اس سے معاشرے کو فائدہ ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے لیے نہیں جیتا، بلکہ وہ دوسروں کیلئے جیتا ہے۔

حقیقی محبت

بعض لوگ مجازی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں، لیکن وہ محبت انھیں نہیں ملتی۔ البتہ اس محبت کی دوری میں وہ خود کو تلاش کر لیتے ہیں۔ خواجہ غلام فرید کو پڑھا جائے یا حضرت داتا گنج بخش کو پڑھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان لوگوں کی خودشناسی کا سفر عشق مجازی سے شروع ہوا تھا۔ تاریخ میں بے شمار ایسے صوفیا کرام ملتے ہیں جن کا مجاز، حقیقت میں بدل گیا۔ انھوں نے ماسوا سے ماورا کی محبت کر لی۔ وہ ایک سے کل کی محبت پر چلے گئے۔

انسان جب اپنا آپ کسی کو دیتا ہے تو اس کو سمجھ آتا ہے کہ اصل زندگی تو یہ زندگی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بیچ دیتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ اب میرا دام انسان نہیں لگا سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ کسی انسان کیلئے فنا ہونے سے بدرجہا بہتر ہے کہ میں مالک کائنات کیلئے فنا ہو جاؤں۔

بے شمار لوگ ایسے ہیں جنھوں نے خود کو تب جانا کہ جب ان کو نیک لوگوں کی صحبت ملی۔ اس کی بہترین مثال اگر کوئی ہے تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دورِ نبوت ہے جس کے فیض یافتہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب منبر پر بیٹھے تھے تو اپنی داڑھی کو پکڑ کر کہتے تھے کہ میں وہ شخص ہوں جو بکریاں اور اونٹ نہیں چرا سکتا تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تھی جس نے مجھے اس قابل بنایا۔

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کی جماعت تھی۔ یہ بہ ظاہر عام لوگ تھے جن میں تہذیب کی بھی کمی تھی، تمیز کی بھی کمی تھی اور علم کی بھی کمی تھی، مگر کمال یہ ہوا کہ انھیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کی صحبت میسر آگئی۔ بعض اوقات تاریخ نے کچھ

لوگوں کو ایک ایسا آئینہ دیا کہ ان لوگوں نے اپنی شناخت اس کے ذریعے کر لی اور ان کے اندر کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کا اظہار ہونے لگا۔ وہ تلوار جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ لے کر نکلے، وہ تہذیب جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم لے کر نکل رہے ہیں، وہ سخاوت جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ لے کر نکلے اور وہ علم جو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ لے کر نکلے، اس سے پوری دنیا کو فیض ملا۔ یہ سب اس وجہ سے ممکن ہوا کہ ان شخصیات کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسر آئی۔

بہتر شخصیت

کہا جاتا ہے کہ خودشناسی تب بھی ممکن ہوتی ہے اگر اپنے سے بہتر شخصیت مل جائے۔ کیونکہ اپنے سے بہتر کا ساتھ سب سے پہلے یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ میں اپنی ذات کی نفی کر رہا ہوں، مجھ سے بہتر بھی کوئی ہے، مجھ میں بہتری کی گنجائش موجود ہے۔ حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ایک شیر کا بچہ گھومتے گھومتے بھیڑوں کے ریوڑ میں چلا گیا اور وہاں پر رہنے لگا۔ ان میں رہتے رہتے اس نے زندگی گزار دی۔ وہ بھول گیا کہ میں شیر ہوں۔ وقت گزرا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ شیروں کا لشکر جا رہا ہے۔ جیسے ہی اس نے شیروں کے لشکر کو دیکھا تو اسے خیال آیا کہ یہ تو مجھ سے ملتے جلتے لگتے ہیں۔ ان کے انداز، ان کے اطوار، ان کا طور طریقہ، ان کے اندر جھلک میری ہے۔ اس نے دیکھا کہ شیر نے ایک دم بھیڑ کو شکار کر لیا اور کھا گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے اندر کا شیر جاگ گیا۔ انسان کا اندر تب جاگتا ہے کہ جب وہ اپنے جیسے کو دیکھتا ہے۔ اگر کوئی درندگی کر رہا ہے اور اگر اس کے اندر درندگی ہے تو وہ اس کو اچھا لگے گا۔ جس کے اندر گناہ ہے اور وہ کسی کو گناہ کرتے دیکھے گا تو اسے ترغیب ملے گی۔ اور اگر اندر نیکی ہے تو پھر نیکی کی ترغیب اندر کی سوئی ہوئی نیکی کو جگا دیتی ہے۔

جب حق جاگتا ہے

پرانے وقتوں میں شالامار باغ کے علاقے میں زیادہ تر ہندو اور سکھ لوگ رہا کرتے تھے۔ شام کے کسی پہر میں شالامار باغ میں ایک اللہ کے نیک بندے ٹہل رہے

تھے۔ ان کے ساتھ ان کا مرید تھا۔ مغرب کا وقت ہو گیا۔ انھوں نے مرید سے اذان دینے کو کہا۔ مرید نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کہا کہ اذان کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے وجہ پوچھی تو مرید نے جواب دیا کہ میں جدھر دیکھتا ہوں، مجھے سکھوں کی پگڑیاں نظر آتی ہیں یا ہندوؤں کی کلنگ نظر آتی ہیں، اس لیے یہاں پر اذان دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ کے ولی نے کہا، بیٹا آپ اذان دے دیجیے۔ جب اذان دی اور پیر و مرید نے نماز شروع کی تو پیچھے تین صفیں بن چکی تھیں۔ مرید نے پوچھا، حضور یہ کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا، حق کی بات کرنے سے سویا ہوا حق خود جاگ جاتا ہے۔ ایک کا حق بولنا بہت سوں کے سوئے ہوئے ''حق'' کو جگا دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ان ایام میں جن لوگوں کی خودی بیدار ہوئی انھیں تاریخ نے سقراط اور ارسطو کہا تو بعض لوگ درویش ہوئے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو انسان کے مقصد حیات کو جگا دیتے ہیں کہ جس مقصد کیلئے اللہ تعالیٰ نے انھیں بھیجا ہے۔ ان کی حق کی پکار اندر کے حق کو جگا دیتی ہے۔ اُن کی باتیں اگرچہ عام باتیں ہوتی ہیں، لیکن اپنی ذات کی گہرائی سے نکلنے کے باعث دوسروں کے دلوں میں گھر کر جاتی ہیں۔ بعض اوقات کسی کا گناہ بھی اس کو خودی سے آشنا کر دیتا ہے، کیونکہ گناہ گار جب توبہ کی طرف جاتا ہے تو سب سے بڑا انعام یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسی سے آشنا کر دے۔ گناہ گار کے آنسوؤں میں اتنی عاجزی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

محرومی کا احساس

وہ نیکی جو آپ کو سلا دے، اس سے بہتر وہ گناہ ہے جو جگا دے۔ جاگنے کے بعد گناہ نہیں ہوتا، توبہ ہو سکتی ہے۔ یہ شعور کہ میں بیدار ہوں، میرا خیال کس طرف جا رہا ہے، اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ ہمیشہ انسان کو غم نے، صالح صحبت نے، توبہ نے یا نیک شخص کی صحبت نے بیدار کیا ہے۔ انسان کی محرومی اس کی طاقت بنتی ہے، بشرطیکہ محرومی کا احساس ہو جائے۔ اگر محرومی کا احساس ہی نہ ہو تو محرومی کو دور نہیں کیا جا سکتا۔ کینسر،

ہارٹ اٹیک اور ہیپاٹائٹس سی بہت خطرناک بیماریاں ہیں۔ یہ اس لیے خطرناک ہیں، کیونکہ ان کا پتا اس وقت لگتا ہے کہ جب وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی خطرناک بات یہ ہوتی ہے کہ آدمی کو پتا ہی نہ ہو کہ میں زندگی میں کس طرف جا رہا ہوں۔ انسان پر سب سے بڑی رحمت یہ ہے کہ انسان کی آنکھ کھل جائے اور اسے پتا چل جائے کہ وہ کہاں ہے، کہاں جا رہا ہے۔ جب اپنی آنکھ خود پر کھلتی ہے تو اپنی غلطیاں، اپنی کوتاہیاں، اپنے اندر کے موسیٰ اور اپنے اندر کے فرعون کا پتا لگ جاتا ہے۔ سب سے زیادہ خطرے والی بات تب ہوتی ہے کہ جب غلطیوں کا پتا نہ لگے۔ آدمی کو یہ شعور اور احساس ہی نہ ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کس لیے جی رہا ہے۔

اس کا بہترین حل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ اے میرے مالک، مجھے میری غلطیوں سے آشنا کر دے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے اندر کینسر پلتے رہیں... نفرت کا کینسر، بغض کا کینسر، لالچ اور حرص کا کینسر، خودستائشی کا کینسر وغیرہ وغیرہ۔

انسان دو تاریخیں کبھی نہیں بھولتا۔ ایک اُس کی تاریخ پیدائش (اگر اسے معلوم ہو) اور دوسری جس دن اس کو یہ پتا لگتا ہے کہ مجھے مالک نے کیوں پیدا کیا۔ اگر یہ پتا لگ جائے کہ مجھے کیوں پیدا کیا گیا ہے، میرا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے تو پھر سمجھئے کہ خودستائشی کی بجائے خودشناسی کا سفر شروع ہو گیا ہے۔

خودی کا احساس

آج بھی بے شمار نوجوانوں میں خودی کا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ وہ نوجوان ہیں جن سے معاشرے کو فائدہ ہو رہا ہے۔ آج فلاح و بہبود کے کاموں میں جتنے نوجوان نظر آتے ہیں، پہلے اتنے نہیں ہوتے تھے۔ آج بے شمار تحریکیں نوجوانوں کی وجہ سے چل رہی ہیں۔ کتنے ہی نوجوان پاکستان پر مر مٹنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔

ہم یہ گلہ کرتے رہتے ہیں کہ نیکی کا زمانہ نہیں ہے، لیکن یہ حقیقت بھی یاد رکھیے کہ ایک ہی وقت میں دونوں چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ نہ کسی دور میں نیکی مری ہے اور نہ کسی دور میں بدی ختم ہوئی ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ ہم کس صف میں کھڑے ہیں۔ ہماری

لائن کون سی ہے۔ ہمارے عمل سے کتنے لوگ متاثر ہو رہے ہیں۔ اگر واقعی ہمارا خلوص ہے تو پھر بے شمار لوگوں کو اس سے راستہ مل جائے گا۔ بعض اوقات ہماری نصیحتیں دوسروں کو تبدیل نہیں کرتیں، معاملہ فہمی یا حسن اخلاق تبدیل کر دیتا ہے۔ حدیث کا مفہوم ہے کہ" مومن کے نامہ اعمال میں قیامت کے روز سب سے وزنی شے اس کے اخلاق حسنہ ہوں گے۔" کیونکہ حسن اخلاق سب سے زیادہ متاثر کرنے والی شے ہے، دوسروں کے دلوں کو بدلنے والی چیز ہے۔



فیض والا

''دینا ایک مسلسل عمل ہے۔ جب آپ کسی کیلئے چیک کاٹتے ہیں تو یہ کاغذ کا پُرزہ نہیں ہوتا، آپ دوسرے کی زندگی کو چھوتے ہیں!''

اوپرا ونفری

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی پڑھائی سے بدظن ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی کچھ معاملہ میرے ساتھ ایف ایس سی میں ہوا۔ میں یہ سوچنے لگا کہ پڑھائی کا کوئی فائدہ نہیں، اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ اس سے تو بہتر ہے، کوئی کام کرلیا جائے۔ ان دنوں میں ایک ٹیچر کے پاس فزکس پڑھنے جایا کرتا تھا۔ اس زمانے میں بچے گروپ کی شکل میں پڑھتے تھے۔ ان ٹیچر کے پاس بارہ سے زائد گروپ تھے جن میں سے ایک گروپ میں، میں تھا۔ استاد محترم پڑھانے کے بعد ٹیسٹ لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ٹیسٹ ہوا۔ سر نے ٹیسٹ چیک کرنے کے بعد مجھے پاس بلایا، کندھے پر ہاتھ رکھا اور ٹیسٹ کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ قاسم بیٹا، یہ ٹیسٹ بتاتا ہے کہ آپ کا داخلہ یو ای ٹی میں ہو جائے گا۔ مجھ میں ایک خوبی یہ پائی جاتی ہے کہ اپنے اساتذہ کا ادب بہت کرتا ہوں۔ اس ادب کی وجہ سے یہ جملہ میرے لیے بڑا محترم تھا۔ سر کا یہ جملہ میرے دماغ میں بیٹھ گیا۔ اس رات مجھے نیند ہی نہ آئی۔ میں ساری رات میں کتابیں کھول کر بیٹھا رہا۔ جملہ چونکہ دماغ میں بیٹھا ہوا تھا، اس لیے میں نے محنت کرنا شروع کردی۔

اگلے سال رزلٹ آیا تو میرے فزکس میں 150 میں سے 149 نمبر تھے اور یوں میرا داخلہ یو ای ٹی میں ہوگیا۔ میں مٹھائی کا ڈبا لے کر اپنے استاد کے پاس گیا اور مٹھائی دینے کے بعد کہا، سر آپ کی وجہ سے میرا داخلہ یو ای ٹی میں ہوگیا ہے۔ انھوں نے

پوچھا، کون سی وجہ؟ میں نے انھیں اپنے ٹیسٹ کا حوالہ دیا تو انھوں نے جواب میں کہا کہ یہ بات تو میں نے بہت سے طلبہ سے کہی ہے۔ میں گھر آیا۔ میں نے اپنا ٹیسٹ تلاش کیا۔ جب میں نے اس ٹیسٹ کو دیکھا تو وہ بہت بے کار ٹیسٹ تھا۔ مجھے اس دن یہ بات سمجھ آئی کہ پڑھائی سے بھی اگر کوئی بڑی چیز ہے تو وہ "یقین" ہے۔

آپ کیلئے کون اہم ہے؟

آدمی جس کو اہم سمجھتا ہے، وہ اس کی بات کو بھی اہم سمجھتا ہے۔ چنانچہ جو صاحب یقین ہوتا ہے، وہ آگے نکل جاتا ہے۔ آگے نکلنے کیلئے یقین بہت بڑی شے ہے۔ میں نے اس فارمولے کو پکڑ لیا اور اس فارمولے کو بے شمار شاگردوں پر اپلائی کیا جس سے مجھے بہت شاندار نتائج ملے۔ البتہ اس فارمولے سے تب ہی نتائج لیے جاسکتے ہیں کہ جب اسے اہمیت دی جائے، یعنی اس پر یقین کیا جائے۔

انسان کو فیض اس سے ملتا ہے جس کی تقدیس دل میں ہوتی ہے۔ اگر تقدیس نہیں ہے تو پھر چاہے جتنی مرضی باتیں بتادی جائیں، سننے والے کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ صرف ذہن میں رہیں گی۔ اس بات کو فائدہ مند بنانے کیلئے سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ جس کی بات ہو، اس پر اعتماد ہو، پورا یقین ہو اور یہ ذہن میں ہو کہ اگر اس نے کہا ہے تو بے وجہ نہیں کہا۔

مستقبل کا ادب

ہم بچوں کو مثبت تحریک (انسپائریشن) نہیں دیتے، متاثر ہونا نہیں سکھاتے، احترام کرنا نہیں سکھاتے۔ یہ نہیں سکھاتے کہ دوسرا تم سے بہتر ہوسکتا ہے۔ یہ وہم کہ میں ہی میں ہوں، تباہ کردیتا ہے۔ یہ "میں" یقین سے دور لے جاتی ہے۔ اصل میں انسان جب اپنے استاد کا ادب کرتا ہے تو وہ اپنے مستقبل کا ادب کرتا ہے۔ اگر آدمی کو اپنے مستقبل سے پیار نہیں ہے تو اسے راستہ بتانے والے سے بھی پیار نہیں ہوگا۔ راستہ بتانے والے سے پیار کا مطلب کہیں پہنچنا ہے اور اگر کہیں پہنچنا ہی نہیں ہے تو پھر بتانے والا برا لگتا ہے۔ اگر کہیں جانا ہے، کسی کی تلاش ہے اور راستہ بتانے والا مل جائے تو پھر

ہاتھ بھی چومیں گے اور ادب بھی ہوگا۔

استاد اور شاگرد کی حدود

اس کے علاوہ، یہ بھی اہم ہے کہ استاد بھی استاد ہی رہے۔ اگر وہ دوست بن جائے تو پھر اس کی باتوں پر عمل کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور استاد کی باتوں کی اہمیت نہیں رہتی۔

تقدیس بڑی اہم چیز ہے۔ جس کے پاس قرآن پاک کی تقدیس ہے، اسے قرآن پاک سے راستہ مل جائے گا۔ سب سے اعلیٰ راستہ بھی قرآن پاک کا راستہ ہے، لیکن جس کے پاس تقدیس نہیں ہے، اسے ہدایت نہیں ملے گی۔ سب سے زیادہ قابل تقدیس شخصیت خاتم الانبیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ہے۔ جو مسلمان آپ کی باتوں سے بہتر بات کرنے کا دعویٰ کرتا ہے، وہ مسلمان ہی نہیں ہے۔ وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس سے تعلق رکھا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سے بہتر بات ہو ہی نہیں سکتی۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ اس سے بہتر بات کی جا سکتی ہے (نعوذ باللہ) تو وہ بڑے مغالطے میں ہے۔

فیض اس کیلئے ہے جس کے پاس احترام ہے۔ ہم بچوں کو سکھاتے ہیں کہ بیٹا استاد کا احترام کرو۔ درحقیقت، ہم یوں اسے مستقبل کا احترام سکھاتے ہیں، کیوں کہ اگر اسے اپنی منزل اور مستقبل سے محبت ہوگی تو پھر سے اس منزل تک پہنچانے والے، رہ نمائی کرنے والے سے بھی محبت ہوگی۔ استاد کا درجہ اس ضمن میں سب سے بڑا اس لیے کہ وہ آدمی کے سب سے بڑے اور سب سے عظیم مستقبل کی طرف نہ صرف رہ نمائی کرتا ہے، بلکہ اسے وہاں تک جانے کے قابل بھی کرتا ہے۔

احترام کیا ہے، کیا نہیں ہے؟ دل کا معاملہ

ہمارے ہاں احترام کا مطلب ہے کہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے، ہاتھ چوم لیا، ادب سے سلام کر دیا۔ یہ سب ٹھیک اور ادب کے زمرے میں آتا ہے، لیکن اس احترام سے پہلے بھی ایک احترام ہے۔ وہ ہے، ذہنی اور قلبی طور پر قبول کرنا۔ حضرت واصف علی

واصفؒ فرماتے ہیں، ''بیعت تو دل کی بیعت ہوتی ہے۔ اگر دل کی بیعت نہیں ہے تو پھر ہاتھ کی بیعت منافقت بن سکتی ہے۔'' ہاتھ کی بیعت صرف رسم نہیں ہونی چاہیے۔ کتنی خوف ناک بات ہے کہ کسی نے رسم ادا کی ہو، لیکن دل سے قبول ہی نہ کیا ہو۔

اچھا استاد وہ ہوتا ہے جو اپنے شاگردوں کے درمیان فاصلہ رکھتا ہے۔ ہم اگر بہتر ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے اندر کوئی نہ کوئی ردوبدل ہونا ضروری ہے۔ یہ بہتری اور ردوبدل احترام اور تقدس کے ساتھ جڑا ہے۔ ہمارے ہاں فیض کا مفہوم بہت عجیب ہے۔ ناجائز کمائی سے گھر بنایا جاتا ہے اور دروازے پر لکھا جاتا ہے، ''یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہے۔'' اسی طرح، اپنے نام کے ساتھ الحاج لکھا جاتا ہے۔ بھلے ناجائز کمائی سے ہی حج کیوں نہ کیا ہو۔

ایک نوجوان کو حج کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ ایک شخص کے پاس چلا گیا جس نے کئی دفعہ حج کیا تھا۔ اس نوجوان نے اس شخص سے کہا کہ میرے لیے بھی دعا کریں کہ مجھے بھی حج کی سعادت نصیب ہو جائے۔ اس شخص نے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی کہ اس کو حج کی سعادت نصیب نہ ہو۔ نوجوان بڑا حیران ہوا۔ اس نے پھر درخواست کی۔ اس نے پھر وہی دعا کی کہ اس کو حج کی سعادت نصیب نہ ہو۔ جب یہ معاملہ تین دفعہ ہوا تو نوجوان نے پوچھا کہ آپ کیوں ایسی دعا مانگ رہے ہیں؟ اس شخص نے جواب دیا کہ جو درد اور تڑپ تمہارے پاس ہے، میں اس سے محروم ہوں۔ میں اس لیے یہ دعا مانگ رہا ہوں کہ تم وہ تڑپ مجھے دے دو، میرے جتنے حج ہیں، اس کا ثواب تم لے لو۔ تڑپ کا مقام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عبادت سے زیادہ ہے۔ یہ وہ ایک سجدہ ہے جو ہزار سجدوں سے نجات دیتا ہے۔ ہم اس ایک سجدے کو تلاش نہیں کرتے۔

اللہ تعالیٰ کا فضل خیالات و افکار کے بدل جانے کا نام ہے۔ اگر فیض ملا ہے تو پھر سوچ میں تبدیلی آئے گی۔ فضل یہ نشانی ہے کہ عقائد بدلنا شروع ہو جائیں۔ فضل کی علامت ہے کہ آدمی معاف کرنے والا بن جائے۔ فضل کی علامت ہے کہ خواہشیں ختم ہو جائیں۔ غور کیجیے کہ کیا آپ کی خواہشیں بدلی ہیں؟ کیا آپ کے تقاضے بدلے ہیں؟ جب آدمی کو اللہ کا فضل مل جاتا ہے تو اس کا نفع و نقصان کا معیار بدل جاتا ہے۔ دنیا

جسے فائدہ کہتی ہے، وہ اسے نقصان ہے۔ وہ یہ حقیقت سمجھتا ہے کہ حقیقتاً فائدہ کیا ہے اور نقصان کیا ہے؟ اکثر، دنیا جس شے کو نقصان کہتی ہے، وہ اس کیلئے فائدہ ہوتا ہے۔

فیض کی بڑی علامت یہ ہے کہ خوشیوں اور غموں کو منظم کرنا آ جائے۔ ایسے فرد کو جب خوشی ملتی ہے تو وہ آپے سے باہر نہیں ہوتا اور غم سے واسطہ پڑتا ہے تو بے خود نہیں ہوتا۔ غم کو سنبھال لینا، غم کو سجدے میں بدل لینا، غم کو آنسوؤں میں بدل لینا، فیض ہے۔

زندگی میں تبدیلی

ہمیں ایسے فیض کی ضرورت ہے جس سے زندگی کی سمت بدل جائے، جس سے ہمارا دین اور دنیا دونوں بہتر ہو جائیں، جس سے ہمارا رب راضی ہو جائے۔ فیض وہ مانگنا چاہیے جو اندر تبدیلی لائے۔ ہم وہ فیض مانگتے ہیں جو باہر تبدیلی لاتا ہے۔ فیض داخلی دنیا کا سوال ہے، خارجی دنیا کا سوال نہیں ہے۔ اندر کی دنیا بدلنے سے باہر کی دنیا خود بہ خود بدل جاتی ہے۔ کم از کم ہم میں یہ تبدیلی آنی چاہیے کہ ہم فیض کو سمجھیں کہ فیض تقدس کا، احترام کا، جھک جانے کا، خیالات کے بدلنے کا، زندگی میں مقصد اختیار کرنے کا نام ہے۔

زندگی میں ان لوگوں کی قدر کیجیے جن سے لینا ہو اور نہ دینا ہو، لیکن وہ آپ کو متحرک کر دیں۔ وہ بہ ظاہر اور تو کچھ کریں نہ کریں، لیکن اندر ایسی طلب ڈال دیں کہ جس سے آپ مقصد کی طرف چل پڑیں۔ آپ کا فوکس اُن کاموں کیلئے ہو جائے جو آپ کیلئے زندگی میں سب سے اہم ہیں۔ آپ کے منتشر افکار ایک جگہ پر آ جائیں۔ اس کا آسان سا طریقہ یہ ہے کہ جہاں پر اپنے سے بہتر انسان ملے، اس کا دل سے ادب کیجیے۔ استاد ملا ہے تو دل سے ادب کیجیے۔ دعا کیلئے درخواست کرنے سے بہتر ہے کہ اسے ایسا کام کر کے دکھائیں کہ وہ آپ کیلئے خود دعا کرے۔

حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''جس کیلئے زبان سے اچھا کہہ رہے ہیں پھر اسی زبان سے برا نہیں کہنا۔'' یہ اس لیے ہے کہ آپ نے اس سے مدد لی ہے، پھر اس کیلئے برا سوچنا اور کہنا بھی نہیں چاہیے۔

ایک وقت میں ایک استاد

کبھی آپ بیمار تو پڑے ہوں گے؟ کیا آپ نے ایک ہی بیماری کیلئے ایک وقت میں تین یا زائد ڈاکٹروں کا علاج کرایا ہے؟ یقیناً نہیں۔ ایک ہی بیماری کیلئے تین ڈاکٹروں سے دوا لینا شروع کر دیں تو دوا کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ چنانچہ اگر آپ ایک سے زیادہ کام کرنے کی کوشش کریں گے تو ایک بھی کام نہیں کر پائیں گے۔ اگر آپ ایک ریکارڈ کیپر ہیں تو اچھے ریکارڈ کیپر بنیں۔ مثال کے طور پر، میں صرف دانشوروں کی نصیحتیں سنتا رہتا ہوں۔ اس سے یہ ہوگا کہ ڈائریاں بھر جائیں گی، لیکن عمل نہیں ہوگا اور زندگی عمل سے دور ہوتی جائے گی۔ پھر ایک وقت ایسا آئے گا کہ جرات بالکل ہی ختم ہو جائے گی۔ یہی وہ جرات ہے جو آدمی کو آگے بڑھنے پر اکساتی ہے۔ وہ شخص زیادہ بڑا ہوتا ہے جو ایک کام کو پکڑے اور نکل جائے۔ پھر وہ پلٹ کر نہ دیکھے۔ جو آدمی جگہ جگہ بیٹھا رہے وہ خطرے میں ہے۔ جہاں سے بات لے لیں، خاموش ہو کر وہاں سے غائب ہو جائیں اور اس پر عمل کریں تاکہ ایک دن یہ کہہ سکیں کہ میں نے یہ بات سنی، اس پر عمل کیا اور آج یہاں پہنچ گیا ہوں۔

کل کریں گے؟

دنیا کے بڑے انسانی المیوں میں سے ایک المیہ یہ ہے کہ انسان کہتا ہے کہ میں کل کروں گا اور کل کے انتظار میں مال اکٹھا کرتا رہتا ہے لیکن وہ کل نہیں آتا بلکہ وہ کل آ کر چلا جاتا ہے۔ اگر بے شمار دوائیوں کے باوجود اندر وسعت قلب نہیں آ رہی تو پھر مہربانی کر کے ساری دوائیں کو چھوڑ کر ایک ہی دوا کھانا شروع کر دیں، یعنی ایک دانش ور کی باتیں سنیں اور انھی پر عمل کریں تاکہ کوئی رنگ تو چڑھ سکے۔ وہ جگہ تلاش کیجیے جہاں پر آنکھیں بند کر کے چل سکیں۔ اپنے لیے چلیں استاد کیلئے نہ چلیں۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''اگر آپ کو کوئی سچا نہیں ملا تو پھر آپ سے بڑا جھوٹا کوئی نہیں ہے۔'' اس کا مطلب ہے کہ آپ کا جو پیمانہ ہے، وہ آپ نے خود پر نہیں لگایا۔

ایک شخص بنارس چلا گیا۔ اس نے سنا تھا کہ وہاں کے ٹھگ بڑے مشہور ہیں۔ پورا دن ایک کھوٹا سکہ جیب میں ڈال کر پورا شہر پھرتا رہا۔ شام کو ایک جگہ پر بیٹھا، سکہ نکالا، پاس بیٹھے بوڑھے شخص سے کہا، میں نے یہاں کے ٹھگوں کی بڑی تعریف سنی تھی لیکن میں پورا دن شہر پھرا ہوں، کسی نے میری جیب نہیں تراشی۔ اب اس بوڑھے شخص نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ میں نے تین بار تیرا سکہ نکالا ہے۔ یہ کھوٹا ہے۔ یہ کون نکالے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم کھوٹے بن کر سچے کی تلاش کرتے ہیں۔ یاد رکھیے، جو خود کھوٹا ہے، وہ سچے کی تلاش نہیں کر سکتا، جو خود دو نمبر ہے، اسے ایک نمبر نہیں مل سکتا۔ زندگی میں سچ ضرور برتیے، خاص کر اپنے مستقبل کے ساتھ۔ آپ کی اپنے سے سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ آپ خود سے سچے ہو جائیں، دنیا آپ کے ساتھ مخلص ہو جائے گی۔

ایک فیض یہ بھی کہ آدمی کو آزادی کا احساس ہو جائے۔ یہ آزادی بہت بڑی نعمت ہے۔ اپنی نوکری کے غلام نہ بنیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر ملازم غلام ہی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ نوکری تو ہو لیکن ادراک ہو کہ میں اس کا غلام نہیں ہوں۔ لوگوں کے ساتھ چل رہا ہوں۔ یہ شعور ہو کہ میری غلامی صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ آزادی کا احساس بہت بڑی کمائی ہے۔ یہ فیض کی انتہا ہے۔

فیض یہ بھی ہے کہ ممکن ہے، دنیا جس چیز کو برداشت نہ کر رہی ہو، آپ اس پر شکر ادا کر رہے ہوں۔ دنیا کہہ رہی ہو کہ میرے غم دور ہو جائیں جبکہ آپ کہیں کہ میرا غم میرے اور قریب ہو جائے تا کہ میرا اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم رہے۔

فیض بانٹنے والے بن جایئے۔ جو اچھی چیزیں آپ کو ملی ہیں، ان کو لوگوں میں منتقل کیجیے۔ لوگوں کو اپنے ساتھ جوڑ کر نہ رکھیے بلکہ انھیں آزاد کیجیے۔ اگر کوئی چلا گیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ کوئی آ گیا ہے تو صد بسم اللہ۔ جس کو کسی کے آنے سے فرق نہیں پڑتا، اس کو کسی کے جانے سے بھی فرق نہیں پڑتا۔

فیض کا فارمولا

فیض والے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے فیض میں دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ جو اپنے فیض میں شریک نہیں کرتا، وہ فیض والا نہیں ہے۔ فیض والے کا فیض بچتا ہی نہیں ہے جب تک کہ وہ اس کو بانٹ نہ لے، کیونکہ فیض تو بانٹنے والی چیز ہے۔ فیض اپنی ذات تک محدود نہیں رہتا، یہ اپنے سے دوسرے تک جاتا ہے۔ یہ شریک کرنے کا نام ہے۔ یہ دبانے اور سمیٹنے کا نام نہیں ہے، یہ ہاتھ کھولنے اور دینے کا نام ہے۔

جس طرح بعض شخصیات کا ادب متعین ہے جیسے والدین لیکن ان کا فیض متعین نہیں ہے۔ اس کا کوئی قاعدہ نہیں ہے، بس زندگی میں اشارے ہیں۔ جنہوں نے اشارے بتائے ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ جس سے دل مل جائے، اس کا ادب کرنا چاہیے۔ جب آپ کا ادب کرنے کو جی کرے تو پھر اس پر کوئی قاعدے قانون نہیں لگانے چاہئیں۔ جس کے ساتھ آپ کا دل ملا ہوتا ہے عموماً اس کے ساتھ آپ کی روح بھی ملی ہوتی ہے۔ ہمارے کچھ تعلقات خونی ہوتے ہیں، کچھ بنائے جاتے ہیں جبکہ کچھ رشتے روح کے ہوتے ہیں۔ اس میں آپ کے اندر کشش محسوس ہوتی ہے۔ آپ اُن رشتوں کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں اور بے اختیار اُن سے ملنے کو جی کرتا ہے۔ اس فرد کے ساتھ کچھ دیر بیٹھنے ہی سے کیفیت بدل جاتی ہے۔

روحانیت = مقناطیسیت

زیادہ روحانیت کے حامل لوگوں کے پاس یہ قوت زیادہ ہوتی ہے اور وہ مقناطیس کی طرح دوسروں کو کشش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یوں تو سائنسی تحقیقات کے مطابق، یہ مقناطیسیت کم وبیش سبھی میں ہوتی ہے لیکن زیادہ روحانیت والے افراد کی تاثیر زیادہ ہوتی ہے۔ ایسا آدمی آپ کا دل پکڑ لیتا ہے۔ روحانیت والے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ اس کے ساتھ بیٹھنے والے کو ہوش ہی نہیں رہتا کہ کتنا وقت گزر گیا۔ اسے اپنے وقت کے گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ یہ اگرچہ سارے اشارے ہیں،

مگر کوئی فارمولا نہیں ہے۔

صاحب

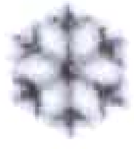
قدرت اللہ شہاب سے کسی نے پوچھا، آپ کی کتاب میں شکریئے کے بڑے نام لکھیں ہوئے ہیں۔ ان میں صرف ایک نام ہے جس کے ساتھ صاحب لکھا ہے اور وہ حضرت واصف علی واصفؒ ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ صاحب کیوں لکھا؟ انھوں نے جواب دیا کہ صاحب کہلوانے کے لائق ہی صرف وہ ہیں۔ جو اللہ کا بندہ صاحب ہوتا ہے، اس کے پاس عہدہ نہ بھی ہو وہ تب بھی صاحب ہی ہوتا ہے، کیونکہ ایسے لوگ دلوں کے صاحب ہوتے ہیں۔ حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ سے کسی نے کہا کہ آپ دنیا سے جانے لگے ہیں؟ آپؒ نے فرمایا، نہیں، میں دنیا کی مسند سے اٹھ کر دلوں کی مسند پر بیٹھ رہا ہوں۔

دلوں کی یہ مسند بڑی کمال کی مسند ہے۔ یہ نصیب والوں کو ملتی ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ سے کسی نے پوچھا کہ زندہ کون ہے اور مردہ کون ہے؟ آپؒ نے فرمایا، جو دلوں میں زندہ ہے وہی زندہ ہے، جو یادداشت سے نکل گیا وہ زندہ ہی نہیں ہے۔

بعض اوقات کسی محفل میں ایسا ہوتا ہے کہ کسی کی موجودگی متاثر کر دیتی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، تاثیر کم ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ایک وقت ہوتا ہے کہ آدمی پیسے والوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے، لیکن کچھ عرصے بعد پیسے والوں کو ایک طرف کرتا ہے۔ اسی طرح، کبھی گاڑی والوں سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ پھر انھیں بھی چھوڑ دیتا ہے۔ اسی طرح، کبھی عہدے والوں سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ پھر انھیں بھی چھوڑ دیتا ہے۔ پھر ایک ہی شے رہ جاتی ہے، وہ ہے کردار یا شناخت۔ جب یہ چیز طے ہو جاتی ہے تو پھر وہ فرد لوگوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ اصل بات یہ ہے کہ بندہ کسی اللہ والے کا راستہ اختیار کر لے۔ یہ زیادتی ہے کہ بندہ اللہ والے سے دنیا مانگے۔

جس طرح پھل پک کر کھانے کے قابل ہوتا ہے، اسی طرح محبت بھی پک کر

فائدہ دیتی ہے اور آدمی اس محبت سے فیض پاتا ہے۔ اس کیلئے ملاقات ضروری نہیں، یہ دلوں کا معاملہ ہے۔ حضرت اویس قرنی قرن میں تھے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرنے مدینہ آنا چاہتے تھے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہوا کہ اپنی ماں کے پاس رہ کر ان کی خدمت کرو۔ دیکھئے کہ کہاں یمن اور کہاں مدینہ منورہ۔ ماں نے کہا تھا کہ اگر مسجد میں ملیں تو مل لینا، اگر نہ ملیں تو واپس آ جانا۔ حضرت اویس قرنی رضی اللہ عنہ مسجد سے ہو کر واپس آ گئے۔ یہ ہے احترام۔ فیض کا تعلق جسم سے نہیں ہے، اسی لیے تو چودہ سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی آپ کی یاد میں آنسو آتے ہیں۔



گیان دھیان

"جب آپ یقین کرنا شروع کریں گے تو آپ کا ذہن اس کے حصول کے راستے تلاش کرنا شروع کردے گا!"

ڈیوڈ جے شوارٹز

زندگی میں بے شمار حقیقتیں ایسی ہیں جن سے ہم باخبر ہوتے ہوئے بھی بے خبر رہتے ہیں۔قرآن مجید میں ہے کہ بعض لوگ آنکھوں کے اندھے اور کانوں کے بہرے ہیں۔آپ کو اپنے گرد ایسے بہت سے لوگ ملیں گے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سن رہا ہے لیکن نہیں سن رہا، وہ دیکھ رہا ہے لیکن نہیں دیکھ رہا،اس کے کان ہیں جس سے وہ سنتا نہیں ہے، اس کی آنکھیں ہیں مگر دیکھتا نہیں ہے۔زندگی کی بے شمار حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جو ہماری اطلاع اور خبر میں تو ہوتی ہیں، لیکن "یقین" میں نہیں ہوتیں۔ مثلاً، جب ایک آدمی کے اندر کچھ کرنے کی صلاحیت ہے، مگر وہ اس کا یقین نہیں رکھتا کہ میں یہ کام کرسکتا ہوں۔ چنانچہ وہ اس صلاحیت ومہارت کے باوجود یہ کام نہیں کرپائے گا۔آپ موٹر سائیکل چلانے کی مثال لے لیجیے۔آپ جانتے ہیں کہ تقریباً ہر نوجوان موٹر سائیکل چلا لیتا ہے۔ لیکن، چند نوجوان ایسے ہیں جو موٹر سائیکل نہیں چلا پاتے۔ ان میں زیادہ تر وہ ہوں گے جنھوں نے موٹر سائیکل چلانے کی کوشش ہی نہیں۔ کیوں؟ آپ اُن سے پوچھیں تو پتا چلے گا کہ انھیں یہ یقین ہی نہیں کہ وہ موٹر سائیکل چلا سکتے ہیں۔

I can`t کا یقین آدمی کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ جو لوگ اس یقین کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، اُن کیلئے آسان کام کرنا بھی مشکل ہوتا ہے۔

اسی طرح، موت کا یقین ہے۔ ہم سب دن رات مشاہدہ کرتے ہیں کہ پیدا ہونے والا ہر فرد مرنے کیلئے آیا ہے، لیکن ہمیں یہ یقین نہیں ہوتا کہ مجھے بھی مرنا ہے۔ لہٰذا، اس یقین کی کمی زندگی میں موت کی تیاری سے مانع رہتی ہے۔

ماہرین نفسیات اور ماہرین روحانیت دونوں اس پر متفق ہیں کہ انسان کو اس حقیقت کا احساس بہت ہی خال ہوتا ہے کہ ہمیں اس دنیا میں نہیں رہنا، یہاں سے بہت جلد چلے جانا ہے۔ اس کے کئی اسباب ہیں اور سب کیلئے یہ مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر، دولت مندوں کے پاس مال و دولت کی مقدار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ان کی یہ سوچ بن جاتی ہے کہ ہمیں ہمیشہ یہیں رہنا ہے۔ بعض اوقات بہت زیادہ ماہر فن بھی اس مغالطے میں رہتا ہے کہ وہ اپنے علم کی بدولت موت سے بچ سکتا ہے یا کم از کم اپنی موت کو پیچھے ضرور دھکیل سکتا ہے۔ لیکن، مستثنیات موجود ہیں۔ سدھارتھا (گوتم بدھ) اپنے ملک کا شہزادہ تھا۔ اس کے پاس مال و دولت سب کچھ تھا۔ اٹھائیس سال کی عمر میں وہ اپنی فوج کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں اس نے ایک جنازہ دیکھا۔ اس نے پہلی مرتبہ کوئی جنازہ دیکھا تھا۔ اس نے پوچھا، یہ کیا ہے؟ جواب ملا، یہ زندگی کا آخری سفر ہے۔ اس نے کہا، اچھا اگر یہ زندگی کا آخری سفر ہے تو میں کون سے سفر پہ ہوں؟ اس نے اسی وقت بادشاہت چھوڑی، محل چھوڑا اور نکل گیا۔ خاصا عرصہ بعد جب وہ واپس لوٹا تو بدل چکا تھا۔ اسے پتا چل چکا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے، آخر کار اس دنیا کو چھوڑ کر چلے جانا ہے تو کیوں نہ اس سفر کی پہلے ہی سے تیاری کر لی جائے۔ بدھا کو سمجھ آ گیا تھا کہ اگر خواہشوں کو نکال دیا جائے تو زندگی آسان ہو جاتی ہے۔ اس نے کہا، خواہشیں تکالیف پیدا کرتی ہیں۔ اگر انھیں اپنی زندگی سے نکال دیا جائے تو تکالیف خود بہ خود ختم ہو جائیں گی۔

ہر واقعے کا ایک اصل ہوتا ہے۔ اس اصل تک جانے کے عمل کو ''گیان'' کہتے ہیں۔ آئن سٹائن کہتا ہے کہ انسان کی کوئی تعریف نہیں، یہ جنس اور چند عادتوں کا نام ہے۔ انسان کچھ عادتیں وراثت میں لے کر آتا ہے اور کچھ عادتیں اس دنیا میں آنے کے بعد اپناتا ہے۔ اگر آدمی اس حقیقت تک پہنچ جائے تو یہ گیان ہے۔ دنیا میں ایسے

لوگوں کی اکثریت ہے کہ جن کی عمر ستر سال سے زائد ہو جاتی ہے، لیکن انھیں گیان نہیں ملتا۔اس کے برخلاف، ایسے افراد بھی ہیں جنھیں چھوٹی سی عمر میں ہی گیان مل جاتا ہے، جیسے محمد بن قاسمؒ جن کی غیرت چھوٹی عمر میں جاگ گئی۔ سکندر اعظم نے بتیس سال کی عمر میں آدھی دنیا کو فتح کرلیا۔ 74 برس کی عمر میں ایڈیسن کی لیباٹری کو آگ لگی لیکن اس نے اس کے باوجود زیادہ ایجادات کیں۔ وہ کہتا تھا کہ جو جل گیا ہے، وہ میرے کام کا نہیں تھا۔اب قدرت مجھ سے وہ کام کرائے گی جو میرے کرنے کے کام ہیں۔ یہ گیان ہے۔بعض اوقات حادثے کا گیان ہوتا ہے۔ زندگی میں چھوٹے چھوٹے حادثات گیان دے دیتے ہیں۔ان سے آدمی میچور اور پختہ کار ہوجاتا ہے۔

بسا اوقات آدمی صوفی کے پاس دنیا لینے جاتا ہےاور دنیادار کے پاس دین۔آپ کو فیصلہ یہ کرنا ہوتا ہے کہ اپنی اس چھوٹی سی زندگی میں کاروبار سیکھنا ہے یا روحانیت۔ زندگی میں کبھی آنکھ زیادہ کام کر جائے تو نظارہ بدل جاتا ہےاور زبان خاموش ہوجاتی ہے۔جن لوگوں کی زبان تیز چلتی ہے، وہ دیکھ ہی نہیں پاتے کہ سامنے والا سننا بھی چاہتا ہے یا نہیں۔ لازم نہیں ہے کہ ایک آدمی جس کو ایک شعبے میں بہت زیادہ گیان حاصل ہے،اسے دوسرے شعبے کا بھی گیان ہو۔شعبہ بدل جائے تو گیان بھی بدل جاتا ہے۔

اظہار اور احساس

انسان پیدا ہوتا ہے،لیکن طویل عرصے تک پیدا ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ زندگی کا اظہار تو ہوتا ہے،مگر احساس نہیں ہوتا۔لوگوں کو یہ احساس ستر ستر برس گزرنے کے بعد بھی نہیں ہو پاتا۔ یہ احساس کہ مجھے مر جانا ہے، اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی عنایت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں پر خصوصی کرم کرتا ہے، اُن میں یہ احساس پیدا کرتا ہے۔ یہ کسی فرعون یا وقت کے حکمران کے دل میں عموماً پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ اس کی سوچ تو صرف پیسہ،طاقت اور حکومت تک محدود ہوتی ہے۔ جس طرح برف پگھل پگھل کر آہستہ آہستہ کم ہوتی اور ختم ہوجاتی ہے،اسی طرح زندگی بھی آہستہ آہستہ پگھلتی ہے۔صد افسوس کہ دوسری جانب انسان اپنی برتھ ڈے کا کیک کاٹ رہا ہوتا ہے۔

قدرت آپ سے کام لینا چاہتی ہے

جن لوگوں کو زندگی کا گیان حاصل ہوتا ہے وہ بتاتے ہیں کہ یہ تب پیدا ہوتا ہے کہ جب قدرت نے بندے سے کوئی کام لینا ہو۔ اگر آپ کو اپنی، اپنے وقت کی اور اپنی زندگی کی قدر آ گئی ہے تو پھر آپ کو مبارک ہو۔ یہ گیان کی علامت ہے۔

بعض اوقات ایک واقعہ یا ایک سانحہ احساس دے جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر کوئی زندگی کی خرمستیوں میں گم ہو اور اچانک اس کی والدہ یا کسی بہت ہی عزیز کا انتقال ہو جائے تو فوراً اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ پھر اُس میں بھی یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ مجھے بھی مرنا ہے۔ جنازہ پڑھنے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اندر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ آپ کے پاس بھی وقت کم ہے، لہٰذا اس کی قدر کیجیے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''ہم موت کو دیکھیں تو زندگی بھول جاتے ہیں اور زندگی دیکھیں تو موت بھول جاتے ہیں۔''

اس احساس کو سنبھالنا اور پالش کرنا، اسے کام میں لانا بہت بڑی بات ہے۔ اگر کسی عام ماہر نفسیات کے پاس چلے جائیں اسے اس احساس کے متعلق بات کریں تو وہ کہے گا کہ یہ نفسیاتی عارضہ ہے، حالانکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ یہ احساس کہ میری زندگی برف کی طرح کم ہو رہی ہے اور اسے ختم ہو جانا ہے، بہت سمجھ داری کی علامت ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ''موت کو تکیے کے نیچے رکھ کر سویا کرو۔'' موت کو یاد کرنے کا بہت بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی وقت ضائع نہیں کرتا۔ اپنی زندگی کے ہر ہر لمحے کو پلان کرتا ہے، اپنے کام پر فوکس کرتا ہے اور کامیاب ہو جاتا ہے۔

زندگی کے مغالطے

ایک شخص کے پاس مال و دولت سب کچھ تھا۔ زندگی مزے سے گزر رہی تھی۔ ایک دن اچانک اسے سینے میں درد محسوس ہوا۔ وہ ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کے پاس صرف ایک دن ہے۔ وہ یہ سن کر شدید گھبراہٹ میں گھر آیا۔

اپنے کاغذات نکالے، جائیداد اپنے بیوی بچوں کے نام لکھی۔ اپنے کاروبار کے متعلق پلان کیا اور سو گیا۔ اگلی صبح اٹھا تو کچھ نہیں ہوا۔ تسلی کیلئے دوسرے ڈاکٹر کے پاس گیا اور اسے چیک کرایا تو ڈاکٹر نے کہا، آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ یہ سن کر بہت وہ خوش ہوا، لیکن اس تکلیف سے اس میں یہ احساس پیدا ہوا کہ مجھے ہمیشہ نہیں رہنا۔ اس سے پہلے کہ وہ وقت آ جائے، الرٹ ہو جانا چاہیے۔ جب ہم اس مغالطے کا شکار ہوتے ہیں کہ ہمیں یہیں رہنا ہے تو الرٹ ہوتے ہیں اور زندگی کو پلان کرتے ہیں۔ پھر مزاج میں لاابالی پن، سستی اور تاخیر پروان چڑھتے ہیں۔

موت کا احساس دراصل ڈر کا ہونا ہے۔ اس ڈر سے نکل جانا چاہیے۔ جو اس ڈر سے نکل جاتا ہے، وہ کام میں لگ جاتا ہے۔ وہ اپنے کام کو ٹارگٹ میں بدل لیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا مقصد متعین کر لیتا ہے۔ موت کا خوف ہمیشہ تب زیادہ ہوتا ہے کہ جب زندگی بے مقصد ہو۔ جس کی زندگی میں مقصد آ جاتا ہے، وہ موت کے خوف سے آزاد ہو جاتا ہے۔

کوئی اسائنمنٹ مکمل کرنے کا سوچیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو بے خوف کر دے گا۔ جس کے پاس کوئی اسائنمنٹ نہیں ہوتا، وہ موت کے خوف میں مبتلا رہتا ہے۔ غور کیجیے کہ پیپر دینا ہو اور تیاری بھی شاندار ہو تو پھر پیپر والے دن کا شدت سے انتظار ہوتا ہے۔ لیکن اگر تیاری نہ ہو تو پھر یہ ہوتا ہے کہ کاش، امتحان آگے پیچھے ہو جائے۔

بامقصد انسان کو پتا ہوتا ہے کہ میں نے اپنے کام کو ڈسکور کر لیا ہے، دریافت کر لیا ہے۔ میں اپنے ٹیلنٹ کو تلاش کر چکا ہوں۔ میرے مالک نے مجھے جو ٹیلنٹ دیا ہے، اب مجھے اس ٹیلنٹ کے مطابق کام کرنا ہے۔ اسے اطمینان ہوتا ہے کہ اس نے اس ٹیلنٹ کے مطابق کام کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ جو کر سکتا تھا، وہ کیا ہے۔

زندگی کی برف

زندگی میں جب یہ احساس پیدا ہو جائے کہ زندگی برف کی طرح ہے تو اس احساس پر بھی اللہ کا شکر ادا کیجیے۔ اس شکرانے کے بعد دوسرا کام یہ کیجیے کہ اپنی زندگی کا

مقصد طے کیجیے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں کہ ''جس نے تمہیں پیدا کیا ہے وہی تمہارے خیال کو بھی پیدا کرتا ہے۔'' اگر یہ نکتہ سمجھ آجائے تو زندگی بہت آسان ہو جاتی ہے۔ خیال کسی بھی وقت پیدا ہو سکتا ہے۔ کبھی بیٹھے بیٹھے ہی پیدا ہو جاتا ہے، کبھی کسی واقعے اور سانحے کے باعث کوئی غیر معمولی خیال آجاتا ہے۔ یہ خیال آپ کو آپ کی زندگی کا مقصد یاد دلاتا ہے۔ اس لمحے کو ضائع نہ ہونے دیجیے، فوراً اپنے اندر مقصد پیدا کیجیے، کیونکہ دنیا میں صرف با مقصد لوگوں کا نام ہی زندہ رہتا ہے۔

ہمیں عموماً یہ احساس تو مل جاتا ہے، لیکن کام میں لانا نہیں آتا۔ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جب یہ احساس پیدا ہو تو فوری طور پر سجدے میں سر رکھ لینا چاہیے اور اللہ تعالیٰ کے حضور یہ دعا کرنی چاہیے کہ اے اللہ، تو نے مجھے یہ احساس تو دے دیا ہے، اب ہمیں اس کو کام میں لانا بھی سکھا دے۔ یہ احساس جب بھی پیدا ہو جائے، مالک کائنات کے در پہ چلے جایئے، کیونکہ احساس کی چٹھی اس نے بھیجی ہے، اس لیے اس کے سامنے آنسو بہایئے اور التجا کیجیے کہ میرے مالک، میری زندگی برف کی طرح پگھلتی جا رہی ہے، اس سے پہلے کہ یہ ختم ہو جائے، ایک مہربانی یہ کر دے کہ اس احساس کو کسی ٹھکانے پر لگا دے۔ اس کو کسی نتیجے پر پہنچا دے۔ میری بے مقصد زندگی کو با مقصد زندگی بنا دے۔ یہ وہ دعا ہے جو اللہ تعالیٰ کبھی رد نہیں کرتا۔

کئی اساتذہ، کئی رنگ ... بے رنگ

بعض اوقات آدمی کسی استاد کے پاس جاتا ہے اور وہ گائیڈ کرتا ہے جس کی وجہ سے سرخ رنگ چڑھتا ہے۔ پھر وہ کسی اور استاد کے پاس جاتا ہے تو وہ بھی گائیڈ کرتا ہے جس کی وجہ سے اس پر سفید رنگ چڑھ جاتا ہے۔ پھر تیسرے استاد کے پاس جاتا ہے تو سرمئی رنگ چڑھتا ہے۔ اسی طرح، مختلف اساتذہ کے پاس جاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس دنیا سے چلا جاتا ہے لیکن اس پر نہ سفید رنگ چڑھتا ہے اور نہ سرخ اور سرمئی رنگ۔ یہ فیصلہ کیجیے کہ اپنے اوپر کون سا رنگ چڑھانا ہے۔ اپنے اوپر رنگ چڑھانے کیلئے بہت سادہ فارمولا ہے کہ آپ تیرہ قسم کی شخصیات کو اپنے سامنے رکھیے اور دیکھیے

کہ ان میں کون سی شخصیت آپ کی شخصیت اور مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ پھر جو شخصیت آپ کے ساتھ ہم آہنگ ہو، اسی کا رنگ چڑھالیں۔ آپ کامیاب ہو جائیں گے۔

دو کشتیوں میں سوار ہونے والا کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔ وہی مسافر اپنی منزل پر پہنچتا ہے جو ایک کشتی پر سوار ہو اور ایک راستے کا مسافر۔ آپ جس شعبے میں جانا چاہتے ہیں، جو کریئر اختیار کرنا چاہتے ہیں، جو کام کرنا چاہتے ہیں، اسی طرح کے مشاہیر اور معروف لوگوں کی سوانح پڑھیے، اُن کی سرگزشت جانیے۔ آپ کو اُن کی زندگیوں سے رہنمائی ملے گی۔ ہم مزاج ماہرین سے ملیے اور اُن کی صحبت کو کہ جب تک وہ اس دنیا میں ہیں، غنیمت جانیے۔ اُن سے زیادہ سے زیادہ فیض اٹھائیے۔ اس مطالعے اور مشاہدے سے آپ کو آگے بڑھنے اور زندگی میں کچھ غیر معمولی کرنے کی تحریک پیدا ہوگی۔



بات چیت میں مہارت

''بحث کا مقصد بحث نہیں ہونا چاہیے، بلکہ آگے بڑھنا ہو!''

جوزف جوبرٹ

دنیا میں کامیاب اور موثر زندگی کیلئے جو بنیادی مہارتیں درکار ہیں، اُن میں سے ایک ''بات چیت'' یا گفتگو کی مہارت ہے۔ بات چیت میں مہارت کے بغیر آگے نہیں بڑھا جاسکتا۔ کامیاب ہونے کیلئے بات چیت میں مہارت بہت ضروری ہے۔ بات چیت میں مہارت کیلئے چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے:

1۔ لکھنا

2۔ پڑھنا

3۔ بولنا

4۔ سننا

زبان ابلاغ یعنی بات چیت کا ذریعہ ہے۔ ابلاغ میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ جو سن رہا ہے، آیا اسے بات سمجھ آرہی ہے یا نہیں۔ ہمارے ہاں یہ مزاج بن چکا ہے کہ متاثر کرنے کیلئے انگلش کا بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن اسے اکثریت سمجھ نہیں پاتی۔ سمجھ کیلئے زبان کا آسان ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق، الفاظ کے انتخاب کا کردار صرف 3 فیصد ہوتا ہے باقی 97 فیصد کردار باڈی لینگوئج اور آواز کے زیروبم کا ہوتا ہے۔

بات چیت میں مہارت کے حوالے سے تعلیمی ادارے کا کردار نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ بعض تعلیمی ادارے بات چیت میں مہارت تو نہیں پیدا کراتے بلکہ خود

اعتمادی پیدا کردیتے ہیں جس سے بات چیت میں مہارت حاصل کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ وہ بچے جن کے گھروں میں اچھی تربیت کی جاتی ہے، ان میں اعتماد ہوتا ہے۔ یہی اعتماد بات چیت میں مہارت پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مہارت کے حوالے سے بہت سے سافٹ ویئرز، بہت سے کورسز، بہت سی وڈیوز انٹرنیٹ پر موجود ہیں جنھیں گھر پر بیٹھ کر استعمال کر کے بات چیت میں خاصی حد تک مہارت حاصل کی جاسکتی ہے۔

دوسروں کی گفتگو کا مشاہدہ کیجیے

بات چیت میں مہارت کیلئے بہترین اوزار (ٹول) سننا ہے۔ اگر لوگوں کے جملوں، لفظوں اور باڈی لینگوئج پر غور کیا جائے تو بڑے آرام سے ان کو کاپی کر کے اپنے گفتگو کے انداز میں بہتری لائی جاسکتی ہے، کیونکہ انسان میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ سننے اور دیکھنے سے سیکھتا ہے۔ پھر اسی انداز سے بولنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو اچھا سننے والا ہے وہ اچھا بولنے والا بھی بن سکتا ہے۔ لوگوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو ریڈیو پروگرام بہت اچھا کرتے ہیں۔ جب ان سے وجہ پوچھی جاتی ہے تو وہ جواب دیتے ہیں کہ طویل عرصہ ہم نے ریڈیو سنا ہے، اس لیے الفاظ کی ادائیگی ٹھیک ہوگئی ہے۔ ہمیں بات سمجھانا آگیا۔

ذخیرۂ الفاظ

ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ بات چیت میں مہارت کیلئے ذخیرۂ الفاظ (Vocabulary) کا زیادہ ہونا ضروری ہے۔ جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اگر الفاظ کم بھی ہوں، لیکن بات سمجھانا آتا ہو، انداز پُرکشش ہو تو بات بن جاتی ہے۔ اگر آپ آکسفورڈ کی پوری ڈکشنری زبانی یاد بھی کرلیں، لیکن الفاظ کا چناؤ ٹھیک نہ ہو، لہجہ بھی اچھا نہ ہو تو پھر لوگوں کو بات سمجھانا مشکل ہو جائے گا۔

اپنی گفتگو کو بہتر بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ جہاں جہاں بہتری لانے کی ضرورت محسوس ہو، اسے نوٹ کرلیجیے۔ یوں یاد رہے گا کہ کون کون سی چیز بہتر کرنا ہے۔ اپنی آواز ریکارڈ کیجیے، پھر اسے سنئے۔ اس سے غلطیاں دور کرنے میں آسانی پیدا

ہوگی۔

جسمانی حرکات

ایک تحقیق کے مطابق بات چیت کی مہارت میں باڈی لینگویج یعنی آپ کی جسمانی حرکات وسکنات کا پچاس سے پچپن فیصد کردار ہوتا ہے، کیونکہ زبان کے بلنے سے پہلے جسم بولتا ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جو سر سے پاؤں تک بولتی ہے۔ ہاتھ ہلیں تب بات ہوتی ہے، سر ہلے تب بات ہوتی ہے، کندھے اٹھیں تب بات ہوتی ہے، کندھے جھکیں تب بات ہوتی ہے۔ غرض، جسم کی کوئی بھی صورت بن جائے، وہ بات چیت ہی ہوتی ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جس کے جذبات اور نیت کو بھانپنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ چنانچہ آدمی اپنی جو بات سمجھانا چاہ رہا ہوتا ہے، اس میں الفاظ نہ صرف زبان سے ادا ہوتے ہیں بلکہ اس میں جسم بھی شامل ہوتا ہے۔ جیسے بعض اساتذہ کی باتیں بچوں کو جلد سمجھ آجاتی ہیں جبکہ بعض کی نہیں آتیں۔ جن اساتذہ کی بات جلد سمجھ آتی ہے، اس کا ایک عامل یہ بھی ہے کہ اُن کی باڈی لینگویج بہت موثر ہوتی ہے۔ جن اساتذہ کی بات جلد سمجھ نہیں آتی، ان کے الفاظ اور جسمانی حرکات میں مطابقت نہیں ہوتی۔

جسمانی حرکات میں بہتری کیلئے

اپنی گفتگو کے دوران باڈی لینگویج کو بہتر کرنے کے تین طریقے ہیں:

1۔ آئینے کے سامنے بات کرنا

شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بات کرنے کی مشق کیجیے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو خود اعتمادی آئے گی، دوسرے جسم کی حرکات وسکنات کو بہتر طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ حرکات وسکنات میں آپ سر کی جنبش، آنکھوں کا کھلنا اور بند ہونا، ہاتھوں کا ہلنا جلنا، گردن کی کیفیت، جسمانی خدوخال وغیرہ سب دیکھ سکیں گے۔ اس طرح، آپ کو اپنے پورے جسم کے بارے میں پتا چل گا کہ آپ کے اندر کتنا اعتماد ہے۔ بار بار کی مشق سے باڈی لینگویج میں بہتری آنا شروع ہو جائے گی۔ پھر، بات

چیت میں بہتری آئے گی۔

2۔اپنی ویڈیو بنانا

آج جدید دور ہے۔ ہر کسی کے پاس موبائل فون موجود ہے۔ موبائل سے اپنی ویڈیو بنایئے، پھر یہ دیکھئے کہ اس میں آپ سے کہاں کہاں غلطیاں ہوئیں۔ آپ جب اپنی ویڈیو کو اس نظر سے دیکھیں گے تو آپ کو وہ غلطیاں نظر آئیں گی۔ آپ کو پتا چلے گا کہ باڈی لینگویج کہاں کہاں سے بہتر ہو سکتی ہے۔ اس طریقہ کار سے کچھ ہی عرصے میں باڈی لینگویج میں بہتری ہونا شروع ہو جائے گی۔

3۔نیورو لینگویسٹک پروگرامنگ NLP

نیورو لینگو یسٹک پروگرامنگ (Neuro Linguistic Programing) انسانی ذہن اور جسم کے درمیان ابلاغ کو سمجھنے کا دنیا کا سب سے مقبول اور تیز ترین علم ہے۔ این ایل پی کی مدد سے آپ کیلئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ آپ کو جو انداز اچھا لگتا ہے، اس انداز کو اپنے اوپر انسٹال کر لیں۔ اگر آپ کسی کے انداز کو اپنے اوپر انسٹال کر لیتے ہیں تو پھر کچھ عرصہ بعد اس فرد کا انداز آپ کا انداز بن جاتا ہے۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کا انداز اور اس فرد کا انداز مل کر ایک نیا انداز بن جائے جو دونوں انداز سے بہتر اور موثر ہو۔ یوں، باڈی لینگویج بہتر ہوگی اور ساتھ ہی ساتھ بات چیت میں بھی بہتری آئے گی۔ این ایل پی کو موثر ابلاغی ذریعے کے طور پر پوری دنیا میں بڑی کامیابی سے استعمال کیا جا رہا ہے۔

آواز کا زیر و بم

گفتگو اور بات چیت میں مہارت کیلئے تیسرا لازمہ ''آواز کا زیر و بم'' یعنی اتار چڑھاؤ (Tonality) ہے۔ کمیونیکیشن کے ماہرین کے مطابق، آدمی ایک بات کو کم از کم تین انداز سے ادا کر سکتا ہے۔ اور ادائیگی کا یہ فرق اُس کی آواز میں اتار چڑھاؤ سے راست تعلق رکھتا ہے۔ ایک ہی جملہ اگر آپ درمیانی آواز سے کہیں گے تو اس کا جو مطلب لیا جائے گا، وہی جملہ کرخت آواز میں کہنے سے اس کا مفہوم بالکل تبدیل

ہو جائے گا۔

انسان اپنی پیدائش کے ساتھ ہی بات چیت شروع کر دیتا ہے۔ بچپن میں یہ زیادہ ہوتی ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بات چیت میں خلا آنا شروع ہو جاتا ہے۔ یہ والدین کے ساتھ ہوتا ہے، یہ اساتذہ کرام سے ہوتا ہے، یہ عزیز رشتے داروں کے ساتھ ہوتا ہے، یہ دوستوں کے ساتھ ہوتا ہے بلکہ معاشرے کے تقریباً ہر فرد کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ ایک وائرس ہے۔ دنیا کی سب سے سخت سزا قید تنہائی ہے۔ اس میں مجرم کی بات چیت دوسرے لوگوں سے بند کر دی جاتی ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق اگر کسی کو پاگل کرنا ہو تو اس کو قید تنہائی دے دیجیے۔ یہ قید تنہائی ہمارے گھروں اور دفتروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ لہٰذا، گھر میں بات چیت کا جو خلا پیدا ہوتا ہے، اسے ختم کرنا چاہیے۔ اس خلا کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بچوں کے ساتھ روزانہ دن میں کئی بار بات چیت کی جائے۔ وہ جو محسوس کرتے ہیں، جو دیکھتے ہیں اُن سے اس کے بارے میں پوچھا جائے۔

بچوں میں بات چیت کی مہارت کیسے پیدا کریں؟

اپنے بچوں میں بات چیت کی مہارت پیدا کرنا والدین کی ذمے داری ہے۔ آپ اس حوالے سے درج ذیل باتوں پر عمل کر کے اپنے بچوں کی ابلاغ کی صلاحیت کو بہتر کر سکتے ہیں:

1۔ بچہ اسکول میں جو کچھ پڑھتا ہے، اس سے اس کے بارے میں روزانہ پوچھا جائے۔ اس سے یہ پوچھا جائے کہ آپ کے دوست کیسے ہیں؟ آپ کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟ آج آپ کے ٹیچر نے کون سا ڈریس پہنا ہوا تھا؟ ٹیچر نے کس کو شاباش دی؟ کس کے نمبر اچھے آئے؟ آج کیا کھایا پیا؟ بریک میں کیا کیا؟ آپ کا سب سے اچھا دوست کون سا ہے؟ دنیا میں ہر انسان کی سب سے زیادہ دلچسپی اپنی ذات میں ہوتی ہے۔ جب بچوں کو اُن کی ذات کے بارے میں سوال پوچھے جاتے ہیں تو گفتگو میں بھی اُن کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

2۔ بچوں کو ایسے لوگوں سے بات چیت کرائیے جو بات چیت میں مہارت رکھتے ہیں۔ جب بچے ایسے لوگوں سے بات کریں گے تو وہ ان سے انسپائر ہوں گے اور یہی انسپائریشن ان کی بات چیت میں مہارت کا ذریعہ بنے گی۔

3۔ بچے کا کم از کم ایک ایسا استاد ضرور ہونا چاہیے جس کی بات چیت بہت بہتر ہو۔ جب ایسا استاد ہوگا تو پھر بچے کی بات چیت میں مہارت خود بہ خود بہتر ہوگی۔ آدمی جس سے متاثر ہوتا ہے، لاشعوری طور پر اس کے انداز کو اپنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر بچہ اپنے استاد سے انسپائر ہوگا تو وہ خود ہی اپنے استاد کے انداز گفتگو کو اختیار کرنے کی کوشش کرے گا۔

نوجوان کیسے گفتگو میں ماہر ہوں

نوجوانوں کیلئے بات چیت میں مہارت حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ زندگی کے قدم بہ قدم امتحانات اور ذمے داریوں کی ادائیگی میں ہر قدم پر موثر گفتگو کی مہارت درکار ہوتی ہے۔ اس لیے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ بات چیت میں لازماً مہارت حاصل کریں۔ بے شمار مواقع ایسے ہوتے ہیں جہاں نوجوان بات چیت میں مہارت حاصل کرسکتے ہیں۔ ذیل میں چند عام مشورے دیے جاتے ہیں جن پر عمل کر کے بات چیت کو بہتر کیا جا سکتا ہے:

1۔ کالج میں جتنی سرگرمیاں ہوتی ہیں ان میں ضرور حصہ لیں۔ ممکن ہے، ان کا تعلق لکھنے سے ہو۔ اگر کسی کو لکھنا اچھا لگتا ہے تو لکھنے میں مہارت حاصل ہو جائے گی۔ اگر کوئی ڈراما کیا جا رہا ہے تو اس میں ضرور حصہ لیں۔ اس سے اداکاری کرنا آئے گی اور بات چیت میں بھی بہتری آئے گی۔ باڈی لینگویج بھی بہتر ہوگی اور جذبات کو کنٹرول کرنے کا سلیقہ بھی آئے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ تقاریر کے جتنے بھی مقابلے ہوں، ان میں ضرور حصہ لیں۔ اس سے آپ کو زیادہ لوگوں کے سامنے بات چیت کرنا آ جائے گا۔ تقریر کرنے سے اعتماد میں غضب کا اضافہ ہوتا ہے۔

2۔ آپ کے شہر میں اگر کوئی ریڈیو چینل ہے تو وہ جوائن کریں۔ بغیر معاوضے

کے وہاں وقت گزاریں، کیونکہ ریڈیو آواز اور بات چیت بہتر کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ وہاں نہ تو باڈی لینگویج کسی نے دیکھنی ہے اور نہ چہرہ سامنے آتا ہے۔ یہاں تو آواز، جملوں اور الفاظ کو سنا جاتا ہے۔ پوری بات صرف آواز کے سہارے ہوتی ہے۔ جب ایک ہی سہارا استعمال ہوتا ہے تو ساری توانائی آواز کے ذریعے بات چیت میں منتقل ہوتی ہے۔

3۔کوشش کیجیے کہ کہیں پر بھی کوئی رول پلے کرنا پڑتا ہے تو اس موقع کو ضائع نہ کیجیے۔آپ کے ادارے میں کوئی شخصیت آرہی ہو تو اس کا استقبال کیجیے۔اس سے بات کیجیے۔ یوں آپ کو لوگوں سے بات کرنا آ جائے گا۔لوگوں کے چھوٹے انٹرویو کیجیے۔ ان کے ساتھ ادب اور شائستگی کے ساتھ بات کیجیے۔ ان کے کام کے متعلق جانئے۔ ان سے پوچھیں کہ وہ کامیاب کیسے ہوئے اور مزید کتنا کامیاب ہونا چاہتے ہیں۔اس سے آپ کے اندر اعتماد آئے گا اور بات چیت کی صلاحیت بہتر ہوگی۔اپنے دوستوں کا گروپ بنائیے۔ اور پھر ایک وقت طے کر کے اس وقت میں اوپر دی گئی مشقیں کیجیے۔ایک دوسرے کی بات چیت اور اندازِ گفتگو کو چیک کیجیے۔ اس طرح، بہت جلد بات چیت بہتر ہونا شروع ہو جائے گی۔

اگر آپ اپنی گفتگو اور ابلاغ میں مہارت چاہتے ہیں تو اس موضوع پر کتابیں پڑھئے اور آپ کے شہر میں اس حوالے سے جو ورکشاپس کرائی جاتی ہوں، اُن میں شرکت کیجیے۔



زندگی کی تجدید

''تبدیلی اور تجدید زندگی کا لازمہ ہیں۔ آپ چاہیں یا نہ چاہیں، یہ تمام زندگی آپ کے ساتھ ہیں!''

سوسان مینوٹ

ہر شے تجدید مانگتی ہے۔ ہر چیز کو گاہے گاہے سنوارنا اور نکھارنا پڑتا ہے۔ ہماری زندگی کے کئی شعبے ایسے ہیں جن کی تجدید کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں جاتا۔ انتھروپالوجی انسانی مزاج کا علم ہے۔ یہ علم بتاتا ہے کہ جب انسان دنیا میں آیا تھا تو اس کو بے شمار قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ اسے اپنی بقا کا تھا۔ رات کو اگر دس لوگ سوتے تو صبح کو دو تین غائب ہوتے۔ پتا چلتا کہ انھیں کوئی جنگلی جانور اٹھا کر لے گیا۔ اسی طرح، کچھ لوگ بیٹھے ہوتے تو قریب سے سانپ گزرتا اور اُن میں سے کسی ایک کو ڈس لیتا اور وہ مر جاتا۔ ان لوگوں کے پاس اسے بچانے کا کوئی سبب نہیں تھا۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ چلتا رہا۔ جب انسان سے ان مسئلوں کا حل نہ بن پایا تو انھوں نے ان مسائل کو خدا سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ وہ دور تھا کہ جب انسان سمجھتا تھا کہ شاید آندھی کا نام خدا ہے، شاید دیوہیکل پہاڑ خدا ہے۔ شاید آگ ہی خدا ہے۔ پھر جیسے جیسے اس میں کچھ شعور آیا تو وہ اپنی بقا کے طریقے سوچنے لگا۔ چنانچہ وہ لوگ جہاں سوتے وہاں اپنے اردگرد ایک گڑا کھود لیتے تاکہ سانپ آئے تو گڑھے میں گر جائے۔ یہ انسان کی اپنے بقا کی شروعات اور پہلی تجدید تھی۔

شروع کے مسائل نے انسان کی جبلت کو جگایا۔ وہ جبلت یہ تھی کہ مجھے مسائل کا سامنا کرنا ہے۔ جس طرح انسان کو مسائل کا سامنا تھا، اسی طرح دوسری مخلوقات کو بھی

مختلف مسائل کا سامنا تھا۔ جیسے، آندھی سے چڑیا کا گھونسلا گر جانا، لیکن اس میں تجدید کا عنصر نہیں تھا۔ اللہ نے انسان کے سوا دیگر تمام مخلوقات میں اپنا تحفظ اُن کی جبلت میں ڈال رکھا ہے۔ لہٰذا، انھیں اپنی بقا کیلئے الگ سے مشقت کر کے یہ فن سیکھنا نہیں پڑا۔ انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جس نے مسائل کا سامنا کرنے کا شعوری فیصلہ کیا۔ اسی خاصیت کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلایا۔ آج انسان نے ان مسائل پر بڑی حد تک قابو پا لیا ہے۔ انسان نے ایسی ادویہ ایجاد کر لی ہیں کہ جن سے خطرناک ترین امراض جو صدیوں سے بستیوں کی بستیاں اجاڑ دیتے تھے، آج قابل علاج ہیں۔ انسان نے اپنے مسائل کا حل تلاش کیا، لیکن کوئی اور مخلوق اپنے مسائل کا حل نہ کر سکی۔ آج بھی بلی اپنا پیٹ خراب ہونے پر گھاس کھاتی ہے، آج گدھا اپنی خارش دور کرنے کیلئے مٹی پر لوٹتا ہے۔ آج بھی شیروں کے رہنے کے انداز وہی ہیں جو اس دنیا کی تخلیق کے وقت تھے۔ آج بھی پرندے اپنے گھونسلے اسی طرح بناتے ہیں جیسے ہزاروں سال پہلے کے پرندے بناتے تھے۔ غرض ان کی کسی چیز میں کوئی ردوبدل نہیں آیا۔

جبلت اور مزاج

انسان کی منفرد جبلت نے انسان کے منفرد مزاج کی تشکیل کی ہے۔ البتہ، جبلت کے برخلاف، انسانی مزاج نہ صرف ہر دور میں بدلتا رہا ہے، بلکہ یہ ہر فرد کا الگ الگ ہوتا ہے۔ زندگی میں کامیابی کیلئے انسانی مزاج کا مطالعہ کیا جائے۔ انسانی مزاج کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ انسان کی تاریخ پڑھی جائے۔ مزاج کی ابتدا کو جاننے کیلئے حضرت آدم علیہ السلام کی زندگی کو پڑھا جائے۔ اس سے پتا چلے گا کہ زندگی گزارنے کے متعلق آپ علیہ السلام کا کیا مزاج تھا۔ مزاج کی معراج کو جاننا ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پڑھی جائے۔ اس سے چلے گا کہ عظمت کیا ہوتی ہے۔ کسی کو معاف کرنا ہے تو دیکھیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح معاف کیا کرتے تھے۔ کسی سے وعدہ کرنا ہے تو دیکھیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے وعدہ وفا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ سے پتا چلے گا کہ جو اچھا نہ سمجھے، اس کے ساتھ اچھا ہونا کتنا

ضروری ہے۔ یہ پتا چلے گا کہ زیادتی کرنے والوں کو معاف کرنا کتنا ضروری ہے۔ یہ پتا چلے گا کہ تجدید کرنا کتنا ضروری ہے۔ یہ پتا چلے گا کہ چیزیں پر لکھنے سے پہلے مشورہ کرنا کتنا ضروری ہے۔ یہ پتا چلے گا کہ زندگی میں پلاننگ کی کتنی اہمیت ہے۔ غرض، زندگی کا کوئی بھی گوشہ ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ نمونہ ہے۔

ارادہ اور فیصلہ کی قوت

اللہ تعالیٰ نے ارادہ جیسی بنیادی صفت صرف انسان کو بخشی۔ دنیا کی کسی اور مخلوق کو یہ صفت نہیں دی گئی۔ انسان واحد مخلوق ہے جس نے ارادہ کیا اور چاند پر چلا گیا۔ یہ واحد مخلوق ہے جس نے خود کو ہوا میں اڑانے کیلئے جہاز بنا لیے۔ یہ واحد مخلوق ہے جو مائیکروسیکنڈ کی رفتار پر چلی گئی۔ ٹیلنٹ، کمیونیکیشن، سفر، ادویہ، ترسیل، رہائش، علم، تعلیم، کتابیں اور ٹیکنالوجی... یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہیں۔ اور یہ اس کے ارادے کی وجہ سے وجود میں آئیں۔

بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کے والدین بچپن میں ہی انتقال کر جاتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ زندگی کے شدید ترین مسائل کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور پھر ایک دن دنیا کو بتاتے ہیں کہ میں ایک کامیاب انسان ہوں۔ جو دنیا کو یہ بتاتے ہیں کہ تعلیم نہ ہونے کے باوجود بھی میں بل گیٹس (بزنس مین) بن گیا ہوں، اسکول نہ جانے کے باوجود بھی نیوٹن (سائنس داں) بن گیا ہوں۔

ارادے کی پختگی انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ تجدید کرے اور آگے بڑھے۔ انسان کبھی نہیں چاہتا کہ وہ کسی ایک جگہ پر کھڑا رہے۔ وہ بہتر سے بہتر ہونا چاہتا ہے۔ انسان وہ مخلوق ہے کہ اگر آج فرض کیجیے، آپ پانچ بڑے مسائل میں پھنسے ہوئے ہیں تو پانچ سال بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ تو کب کے حل ہو چکے۔

جس قسم کے مسائل بھی کیوں نہ ہوں، انسان ان مسائل کے باوجود جینا سیکھ جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک آدمی کی ٹانگ کٹ جاتی ہے۔ وہ مصنوعی ٹانگ لگا کر چلنا شروع کر دے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے چیلنج کے سامنے کھڑا ہو کر ثابت کر دیا

کہ ایک ٹانگ نہ بھی رہے تو میں پھر بھی چل سکتا ہوں۔

مسائل نعمت ہیں

مسائل انسان کے ارادے کو باہر نکالتے ہیں۔ یہ اسے تجدید کا موقع دیتے ہیں۔ آج کوئی نہیں چاہے گا کہ وہ سو سال پیچھے چلا جائے بلکہ سو سال تو دور کی بات ہے، چند سال پیچھے جانے کو تیار نہیں ہوگا۔ کسی دانشور نے کیا خوب کہا ہے کہ انسانیت اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے کھرچ کھرچ کر یہاں تک پہنچی ہے۔ اسے قطعاً واپسی کی چاہت نہیں۔ رنجیت سنگھ تجدید کی اہمیت سمجھ چکا تھا، اس لیے اس نے کہا کہ میں اپنی عورتوں کو بھیک نہیں مانگنے دوں گا، بلکہ انھیں تعلیم دوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں بھکاریوں کی سب سے کم تعداد سکھوں کی ہے، کیونکہ انھیں سمجھ آ گئی کہ عورت کا تعلیم حاصل کرنا کتنا ضروری ہے۔ دنیا میں ایسے کامیاب لوگ ہیں جن کے والد پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن والدہ پڑھی لکھی تھیں۔ اس کے نتیجے میں سارے بچے پڑھ لکھ گئے اور کامیاب ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ ماں کا شعور بچوں میں منتقل ہوا۔

ہم لوگ مسائل سے بچنا چاہتے ہیں۔ جب آدمی مسائل سے راہِ فرار اختیار کرتا ہے تو اس کی قوتِ ارادہ باہر نہیں نکل پاتی۔ وہ تمام بچے جو چھاؤں میں پلتے ہیں وہ زیادہ ترقی نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا واسطہ کبھی مسائل سے پڑا ہی نہیں کہ وہ اپنے اندر کی قوتِ ارادہ کو کھنگالتے اور اسے باہر نکال کر اس سے کام لیتے۔ لہٰذا، جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں اور جب مسئلہ سامنے پاتے ہیں تو بھاگ جاتے ہیں۔

آج کے نوجوان کی پستی

میں دیکھتا ہوں کہ انٹرمیڈیٹ کے داخلے شروع ہوتے ہیں تو اٹھارہ بیس برس کے نوجوان اپنی ماؤں کا ہاتھ تھامے کالج میں پروسپکٹس لینے آتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ایک طرف تو وہ سترہ سال کا نوجوان تھا جو کئی سو میل کا فاصلہ طے کر کے اپنے ساتھ کئی ہزار افراد کا لشکر لے کر سندھ آیا یعنی محمد بن قاسم اور دوسری جانب آج کا مسلمان نوجوان ہے۔ بہت بڑا فرق اس نوجوان اور آج کے نوجوان میں یہی ہے کہ محمد بن قاسم

کے پاس ارادہ و فیصلہ کی قوت تھی اور آج کا نوجوان اس نعمت سے محروم ہے۔

اگر آج بیس اور تیس سال کی عمر میں بھی آدمی ہر کام شروع کرنے سے پہلے اپنے والدین سے پوچھتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اسے یہ صلاحیت سکھائی ہی نہیں گئی ہے۔ انسان زندگی میں قوت فیصلہ سے ترقی کرتا ہے۔ قوتِ فیصلہ اور قوتِ ارادہ نہ ہو تو وہ ستر سال کا بھی ہو جائے تو پھر بھی وہ بچہ ہی رہتا ہے۔ قوتِ ارادہ و قوتِ فیصلہ اس وقت باہر نکلتی ہے کہ جب مسائل راہ میں آتے ہیں۔ ایسے میں انسان مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنی تجدید کرے۔ جب انسان کو پتا ہوتا ہے کہ میرے پاس ایک بہت بڑی طاقت اور قوت موجود ہے تو وہ اسے استعمال میں لاتا ہے۔ اس کے برخلاف، جن لوگوں کی قوتِ ارادہ سوئی ہوتی ہے یا مُردہ رہتی ہے، وہ لوگ ہوتے ہیں جنھوں نے زندگی میں مسائل اور مشکلات کا سامنا نہیں کیا ہوتا۔ وہ زندگی کے مسائل سے بھاگنے والے ہوتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں،

"تو اسے بچا بچا کے نہ رکھ"۔

مشکلات کا سامنا کرنے والے کو اللہ تعالیٰ پہلا انعام یہ دیتا ہے کہ اس کی ارادے کی قوت باہر آجاتی ہے۔

مسائل سے نمٹنے کے تین انداز

شاید ہی کوئی انسان ہو جس کی زندگی میں چھوٹے بڑے مسائل نہ آئے ہوں۔ مسائل زندگی کا لازمہ ہیں۔ مسائل کو حل کرنے والے لوگ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جنھیں مسائل آتے ہیں تو وہ انھیں دیکھتے ہیں اور اپنے آپ سے کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی تجدید کرنی ہے۔ یہ سمجھ دار لوگ ہوتے ہیں۔ وہ تمام لوگ جنھیں یہ سمجھ آجاتی ہے کہ مجھے ضد چھوڑ دینی چاہیے، مجھے کفر کا راستہ چھوڑ دینا چاہیے، مجھے کولھو کے بیل کی طرح چکر لگانا چھوڑ دینا چاہیے اور مجھے ٹھہر کر تجدید کرنی چاہیے، ایسے لوگ قدرت کے اشارے سمجھ جاتے ہیں۔ یہ راہ میں گر جائیں تو اٹھ کر کہتے ہیں کہ آئندہ احتیاط سے چلنا ہے۔ دوسری طرح کے لوگ وہ ہوتے ہیں جنھیں قدرت اشارے دیتی ہے، لیکن ان کو

یہ اشارے سمجھ نہیں آتے۔ چنانچہ وہ تجدید نہیں کر پاتے۔ تیسری طرح کے لوگ انتہائی خوف ناک ہوتے ہیں۔ انھیں یہ اشارے ملتے ہیں، انھیں پتا ہوتا ہے کہ یہ قدرت کے اشارے ہیں، لیکن وہ اڑ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ اللہ کے رسولؐ ہیں مگر میں ابوجہل ہوں۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ان لوگوں کے متعلق فرماتا ہے کہ ان کے دلوں پر قفل پڑے ہیں۔ جس دل پر قفل لگ جائے تو اس کے سامنے جتنی بھی اچھی بات کی جائے، وہ اس کو نہیں مانتے۔ یہ سب سے بڑی بدبختی کی حالت ہے۔

مذکورہ بالا تینوں قسم کے افراد آپ کو ہر دور میں ملیں گے۔

ترقی اور برکت

جن لوگوں کی وجہ سے آپ کی ترقی ممکن ہوئی ہے یا وہ کسی بھی طرح سے آپ کے معاون بن سکتے ہیں، اگر آپ اُن سے نفرت کرنا شروع کر دیں گے تو شاید ترقی تو مل جائے لیکن برکت نہیں ہوگی، راحت نہیں ہوگی۔ لوگوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو کامیاب ہونے کے بعد اپنے محسنوں کے شکرگزار نہیں ہوتے، بلکہ الٹا اُن کو ان کی اوقات دکھاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو حقیقی سکون میسر نہیں آتا اور زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر انھیں شدید ٹھوکر کھانا پڑتی ہے۔

اگر اپنی عقل اور مہارت زندگی کو خوشگوار نہیں بنا رہی تو پھر تجدید کی ضرورت ہے۔

اسلام میں تجدید

اسلام نے تجدید کا سب سے حسین تصور توبہ کی صورت میں دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے توبہ بہت پسند ہے۔ پوری زندگی انسان کے پاس تجدید کا موقع ہوتا ہے۔ بندہ جتنا بھی گنہگار ہو، گناہوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہو، لیکن دل میں یہ خیال آئے کہ مجھے واپس لوٹنا چاہیے تو اسے چاہیے کہ توبہ کرے۔ جب اپنی عقل زندگی کو بہتر نہ بنا رہی ہو تو اس وقت اپنی عقل پر چھلانگیں نہ لگائی جائیں۔ اس وقت یہ دعوا نہیں کرنا چاہیے کہ میں بڑا عقل مند ہوں۔ ایسی صورت میں تجدید ممکن نہیں ہوتی۔ عقل کی انتہا یہ ہے کہ زندگی میں سکون ہو۔ سکون کا مطلب ہے کہ آدمی جہاں ہو، ذہن بھی وہیں ہو۔

ذہن میں نہ ماضی کا غم ہو اور نہ مستقبل کی تشویش چل رہی ہو عقل جب بھی آتی ہے تو اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے ہوتی ہے کہ وہ ماضی اور مستقبل سے آزاد ہو جاتا ہے۔

زندگی میں کبھی وقت ضائع ہو جائے اور کوئی بھول ہو جائے تو فوری طور پر تجدید کیجیے۔ کوئی بات نہیں، یہ انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ انسان بھولنے والی مخلوق ہے۔ انسان کا لفظ نسیان سے بنا ہے جس کا مطلب ہے، بھولنا، یعنی ایسی مخلوق جو بھول جاتی ہے۔ یہ ایسی مخلوق ہے کہ اگر اپنے خالق کو دن میں پانچ بار یاد نہ کرے تو وہ اپنے خالق کو بھی بھولنے لگتی ہے۔ اس لیے اسے پانچ دفعہ یاد کرنا پڑتا ہے۔ زندگی میں کبھی وسائل ضائع ہو جائیں تو فوری طور پر سجدے میں سر رکھیے اور تجدید کیجیے۔

زندگی میں تجدید کا سب سے بہتر وقت وہ ہے کہ جب بندے کو اپنے گناہ یاد آ جائیں اور شرمندگی ہو۔ یہ خوش بختی کی علامت ہے۔ یہ احساس اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ گناہ اللہ تعالیٰ سے دور نہیں کرتا بلکہ گناہ کی یاد اللہ تعالیٰ کو پاس نہیں آنے دیتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کی وجہ سے خیال اتنا پراگندہ ہو جاتا ہے کہ پاک ہستی کو سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ کبھی گناہوں کا بوجھ محسوس ہو تو زندگی کی تجدید کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

تجدید کا مطلب یہ ہے کہ سہارا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔ تجدید کا مطلب ہے کہ قدم اٹھے، لیکن اس کا دارومدار اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو۔ تجدید کے بعد دعا کریں کہ اے باری تعالیٰ، آج تجدید کیلئے میرا پہلا قدم اٹھ گیا ہے، تو مہربانی فرما اور اب اپنے وعدے کے مطابق دس قدم میری طرف آ جا۔ یقین کیجیے، آپ کا ایک قدم اٹھے گا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سو قدم آپ کی طرف آئے گی۔

کبھی بھی زندگی میں احساس ہو کہ میں نے کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے اور وہ مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی تو فوری اس شخص کے پاس جائیں اور اس سے معافی مانگیں۔ یہ بھی تجدید ہے۔

تجدید کیجیے

اپنی زندگی کی تجدید کیلئے اپنے سے یہ سوال کیجیے کہ میں کیوں جی رہا ہوں، میرے جینے کا سبب کیا ہے، میں کدھر جا رہا ہوں، میں اس دنیا میں آیا کیوں تھا؟ یہ زندگی ایک بار ملی ہے، میں اس واحد اور قیمتی متاع کو کیسے برت رہا ہوں؟

اگر یہ سوالات پہلے سے آپ کے ذہن میں کلبلا رہے ہیں اور آپ کو بے چین کیے ہوئے ہیں تو یہ خوش بختی کی علامت ہے۔ اس سے استقامت ملتی ہے۔ استقامت یقین کا انعام ہے۔ جس کے پاس یقین نہیں، اس کے پاس استقامت نہیں ہوتی۔ جو یقین کی راہ پر چل نکلے، انھیں منزلوں نے پناہ دی۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''زندگی کے تین حاصل بہت بڑے حاصل ہیں: یقین، یکسوئی اور استقامت۔'' یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے کہ وہ کسی کو صاحب یقین، صاحب یکسوئی اور صاحب استقامت بنادے۔



بن مرشد

"ٹکنالوجی محض ایک اوزار ہے۔ اپنے بچے کو کام کے قابل بنانے اور اس میں موٹیویشن پیدا کرنے کیلئے استاد ضروری ہے!"

بل گیٹس

"بن مرشد" کا مطلب ہے، بغیر استاد کے۔ جن لوگوں کا تعلق پڑھنے پڑھانے سے ہے، ٹریننگ یا کاؤنسلنگ و لائف کوچنگ سے ہے، چاہے ان چاہے، اُن کا واسطہ بہت سے لوگوں سے ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر ٹیچر ایک بچے کو پڑھاتا ہے تو بچے کے ساتھ ساتھ اس کا تعلق اس کے والدین کے ساتھ بھی ہو جاتا ہے۔ جب ان لوگوں کی زندگی میں پبلک ٹریفک بڑھ جاتی ہے تو ان کا سوچ کا انداز بدل جاتا ہے، کیونکہ وہ اپنے تجربے کو اس علم کی طرف لے جاتے ہیں جو علم انھوں نے کبھی پڑھا ہوتا ہے۔ پھر انھیں پتا لگتا ہے کہ جن لوگوں نے کتابیں لکھیں، انھوں نے صحیح لکھا تھا۔ انھیں سمجھ آ جاتی ہے کہ کچھ لوگ عمر میں، رتبے میں اور مقام میں بہت بڑے ہوتے ہیں، لیکن وہ فائدہ مند نہیں ہوتے۔ جبکہ کچھ لوگ جن کی عمر کم بھی ہو، معاشرے کیلئے فائدہ رساں ہوتے ہیں۔ مرشد سے مراد آپ کی زندگی میں وہ انسان ہے کہ جس کی بات سن کر آپ اپنی عقل کو پرے کر دیں۔

موٹیویشن اور انسپائریشن

وہ تمام لوگ جن سے معاشرے کو فائدہ ملتا ہے، ماضی میں ان کی

زندگی میں کہیں نہ کہیں کوئی انسپائریشن ضرور ہوتی ہے۔ وہ انسپائریشن چاہے استاد کی ہو، چاہے والد کی ہو یا کسی بھی دوسرے فرد کی ہو۔ انسان اس چیز کی تلاش میں ہوتا ہے جس سے وہ متاثر ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں آدمی مختلف افراد سے متاثر ہو سکتا ہے۔

بن مرشد، بے فیض

جن لوگوں کا کوئی مرشد نہیں ہوتا، کوئی استاد نہیں ہوتا، وہ بے فیض ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی میں کوئی انسپائریشن نہیں ہوتی۔ مقولہ مشہور ہے کہ جس کا کوئی استاد نہیں ہوتا، اس کا استاد شیطان ہوتا ہے۔ بے استادے کسی سے متاثر ہوئے ہوتے ہیں اور نہ اُن سے کوئی متاثر ہو پاتا ہے۔ بن مرشد لوگوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو طویل عرصے تک یہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ طویل زندگی گزارنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ میں غلط راستے پر ہوں۔ اس وقت آدمی واپس مڑنا چاہتا ہے، لیکن وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ یہ وقت بہت خطرناک ہوتا ہے کہ آدمی کی قوتِ فیصلہ زنگ آلود ہو جائے۔ اگر آدمی زندگی میں کسی کو اپنا مرشد اور استاد بنا لے تو زندگی سے یہ خطرہ ٹل جاتا ہے۔

با استاد، با فیض، خوش قسمت

وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جن کو مناسب عمر اور مناسب وقت میں مثبت انسپائریشن مل جائے۔ انسان جس سے متاثر ہوتا ہے یا جس سے محبت کرتا ہے، اس کی بات بھی آسانی سے سنتا اور مان لیتا ہے۔ انسان جب شعوری یا لاشعوری طور پر اپنا رول ماڈل طے کر لیتا ہے تو پھر اس کیلئے ہدایت کی جست لگانا آسان ہو جاتا ہے۔ ہدایت ایک لمبا اور کٹھن راستہ ہے۔ اس کو حاصل کرنے کیلئے بڑے دشت طے کرنے پڑتے ہیں، لیکن اگر اس کا کوئی شارٹ کٹ ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ بندہ کسی فیض یافتہ شخصیت کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر لے۔

انسان واحد مخلوق ہے جو دوسروں سے متاثر ہوتی ہے۔ یہ شرف اللہ

تعالیٰ نے صرف انسان کو بخشا ہے۔ ذرا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کے متعلق سوچئے کہ جب پہلی وحی آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے۔ سارا ماجرہ حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے بیان کیا اور وہ آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں۔ ورقہ بن نوفل نے کہا کہ کائنات میں رسولوں کی جو لڑی چلی آرہی ہے، آپ اُس کے آخری رسول ہیں۔ یہ کتنی بڑی بات ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق شناسائی ہو۔ وہ کتنے عظیم انسان ہوں گے جو آپؐ کے بچپن میں آپ کی عظمت سے شناسا رہے ہوں گے۔

جو شخص عظمت سے شناسا ہے، وہ عظمت کو ڈھونڈ لیتا ہے۔ اس سے بڑی کمبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کے پاس ہی عظیم انسان ہو، لیکن آپ کو یہ ادراک ہی نہ ہو۔ ہم خود بُرے ہوتے ہیں، لیکن اچھوں کی تلاش میں رہتے ہیں جس کی وجہ سے اچھا انسان ملنے کی بجائے برا انسان ہی ملتا ہے۔ ایک شخص نے کسی کو حضرت واصف علی واصفؒ کے پاس بھیجا اور اس کو پچاس سوال دیئے اور کہا کہ یہ یاد رکھنا، صحیح ولی کی پہچان یہ ہے کہ وہ ان پچاس سوالوں کے جواب دے دے۔ اس نے وہ پچاس سوال اپنی جیب میں ڈالے اور آپؒ کی محفل میں آکر بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ایک سوال کا جواب آچکا تھا۔ پھر دوسرے کا جواب آیا۔ پھر تیسرے کا آیا۔ یہاں تک کہ پچاس کے پچاس سوالوں کے جواب آگئے۔ آپؒ نے اس سے کہا کہ صفحہ نکال کر دیکھو، کوئی بات رہ تو نہیں گئی۔ اگر زندگی میں انسپائریشن ہے تو بہت جلدی تبدیلی آسکتی ہے۔

ہمارے ہاں رسمیں بنی ہوئی ہیں کہ اگر ایک کی بیعت ہوگئی تو پھر کسی کی بیعت نہیں ہو سکتی۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''دل کی بیعت ہوتی ہے۔ ہاتھ کی بیعت کوئی بیعت نہیں۔'' دل کی بیعت یہ ہے کہ جو اندر سے بدل جائے تو پھر چاہے کوئی کچھ بھی کر لے، وہ کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ اگر دل کسی سے انسپائر ہو جائے تو پھر اس کا بتایا ہوا ایک جملہ زندگی بدل دے گا۔ اس لیے ممکن ہے کہ بڑا علم والا ملے، لیکن دل مائل نہ ہو۔ جبکہ ایک عام سا بابا مل جائے اور وہ آپ کو کلک کر جائے۔

اندر سے تبدیلی

انسپائریشن خیال کی تبدیلی ہے۔ یہ اندر کی دنیا کی تبدیلی کا نام ہے۔ جب بھی اندر کی دنیا میں تبدیلی آتی ہے تو انسان کے حال میں تبدیلی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ لوگ بیعت کے ساتھ ہی حلیہ بدل لیتے ہیں، لیکن خیال تبدیل نہیں آتی جس کی وجہ سے اس کے حلیے کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

کسی بادشاہ نے حضرت شیخ سعدیؒ کی دعوت کی۔ آپؒ سادہ لباس پہن کر بادشاہ کے دربار میں گئے۔ جب محل کے دروازے تک پہنچے تو دربان نے اندر داخل نہیں ہونے دیا۔ آپؒ واپس چلے آئے۔ مہنگا لباس پہنا اور دربار میں چلے گئے۔ جب دروازے تک پہنچے تو دربان نے بہ خوشی آپ کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ جب کھانا شروع ہوا تو آپؒ نے اپنے بازو کا بٹن کھول کر کپڑے کو شوربے میں ڈبو دیا۔ مہمانانِ محفل نے یہ عجیب حرکت دیکھی تو متوجہ ہوئے۔ شیخ سعدیؒ یہ بھانپ کر جواب دیا کہ چونکہ اس محفل میں احقر کو تو اجازت نہیں ملی، البتہ مہنگے لباس کو دعوت میں شرکت کی اجازت مل گئی، اس لیے میں اپنے مہنگے لباس کو کھانا کھلا رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں محترم وہ ہے جو دل کا صاف ہے۔ انسپائریشن کا کمال یہ ہوتا ہے کہ یہ بندے کو اندر سے صاف کر دیتی ہے۔

بعض اوقات پتا نہیں ہوتا کہ ہمیں کسی رہبر کی ضرورت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ عطا کر دیتا ہے۔ اس کے آنے کے بعد پوری کائنات بدلی بدلی سی لگتی ہے۔ بعض اوقات شعوری طور پر خیال آتا ہے، کیوں نہ کسی کی انگلی تھام لی جائے۔ یہ صرف اس وقت ہوتا ہے کہ جب محبت ہوتی ہے۔ رسمی طور پر کسی سے بیعت نہیں کرنی چاہیے۔ اس میں بندہ اپنی عقل استعمال کرنا شروع کر دیتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں: "جس سے عقل لینی ہے، اس پر عقل نہیں لگانی۔"

انسپائریشن ملنا نصیب کی بات ہے۔ ایک درویش بیٹھے ہوئے تھے۔ کسی نے کہا کہ میں ایک جگہ درویش کے پاس گیا تھا۔ وہ آپ کی بڑی تعریف کر رہے

تھے۔ درویش نے کہا، ہاں وہ ہمارا ہی بچہ ہے۔ اس نے کہا کہ وہ بڑا انسان ہے۔ درویش نے پوچھا، وہ کیسے؟ اس نے جواب دیا کہ جیسے ہی اس کے سامنے کوئی فرد آتا ہے، وہ فوری طور پر اس کا حال جان لیتا ہے۔ درویش نے کہا، ہم نے یہ علم بیس سال پہلے اسے دے دیا تھا۔ یہ تو چھوٹے چھوٹے شعبدے ہیں۔

فیض منتقل ہوتا ہے

بعض اوقات ماں کی دعا ہوتی ہے اور استاد اچھا مل جاتا ہے۔ باپ کا نیک عمل ہوتا ہے تو رہبر مل جاتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''ہم کسی کی دعا کی تاثیر ہیں اور ہماری دعائیں کسی اور زمانے میں اثر دکھائیں گی۔'' بعض اوقات کسی کی خلوص بھری دعا کسی اور نسل میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔ لاہور کے پاگل خانے کے ایک ڈاکٹر صاحب کبھی کبھی اپنے بھتیجے کو لے کر پاگل خانے جایا کرتے تھے۔ وہاں پر ایک بوڑھا شخص بھی تھا۔ وہ پاگل نہیں تھا۔ وہ درویش تھا۔ سلاخوں کے پیچھے سے وہ بچے کو غور سے دیکھتا اور مشاہدہ کرتا رہتا تھا۔ ایک دن بچے کو بھی محسوس ہوا کہ باباجی مجھے بڑی محبت سے دیکھتے ہیں۔ وقت گزرتا گیا۔ بچہ بڑا ہو گیا۔ جو بات اس کے منہ سے نکلتی، پوری ہو جاتی۔ وہ بڑا حیران ہوتا کہ ایسا کیوں ہے۔ کسی اور درویش نے اس سے کہا کہ فقیری تو تمھیں اس وقت ہی مل گئی تھی کہ جب پاگل خانے کا بوڑھا تمھیں دیکھتا اور دعا دیتا تھا۔ فیض ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتا ہے اور وہ کسی بھی شکل میں ہو سکتا ہے۔

اپنے خول سے باہر نکلئے

زندگی میں انسپائریشن کیلئے خود کو چھوٹے چھوٹے دائروں سے نکالیے اور باہر کی دنیا کو دریافت کیجیے۔ آپ اپنے سے باہر کی دنیا کو جتنا زیادہ گھومیں گے، آپ کیلئے انسپائریشن لینا اتنا زیادہ ممکن ہوگا۔ انسپائریشن وہ راستہ ہے جہاں ایک سے بڑھ کر ایک انسان ملتا ہے۔ بندہ جس سے انسپائر ہوتا ہے اس کے نقش ہونے کی پہلی نشانی یہ ہے کہ اس سے بار محسوس نہیں ہوتا۔ آدمی محسوس کرتا ہے کہ میرا بار اس نے اٹھا

لیا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اگر میرا مرشد خوش ہے تو میں بھی خوش ہوں۔ وہ اس کی بات پر اپنی عقل لگانا چھوڑ دیتا ہے۔ ہم روز نماز میں یہ آیت پڑھتے ہیں کہ "ہمیں سیدھا راستہ دکھا، اُن لوگوں کا راستہ جن پر تیرا انعام ہوا ہے۔" ہماری زندگی میں کوئی ایک مثال تو ایسی ہونی چاہیے۔ اگر مثال نہیں ہے تو پھر یہ زندگی کا بہت بڑا المیہ ہے۔ آدمی جیسا بننا چاہ رہا ہے، ویسی مثال کا سامنے ہونا بہت ضروری ہے۔ ایسے فرد کے علم کے سامنے اپنا علم مکھی کے سر کے برابر لگے۔ کیا آپ کی زندگی میں کوئی ایسا فرد ہے؟ اگر نہیں تو تلاش کیجیے۔ آپ کے بہت سے کٹھن راستے آسان ہو جائیں گے اور مختصر بھی۔

دل کا دروازہ کھلا رکھیے

زندگی میں دل کا دروازہ کھلا رکھیے۔ انسپائریشن اُن لوگوں میں کم ہوتی ہے جن کے دل سخت ہوتے ہیں۔ دل کا سخت انسان کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔ وہ اپنی عقل کو عقل کُل سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں بہتری کی گنجائش نہیں ہے۔ ایسے آدمی کے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔ اس کی آنکھ ہوتی ہے، مگر وہ دیکھ نہیں پاتا۔ اس کے کان ہوتے ہیں، لیکن سن نہیں پاتا۔ پاؤں اٹھتے ہیں، مگر غلط راستے پر۔ کوئی کیل پانی میں نہیں تیر سکتا، لیکن اگر یہی کیل لکڑی کے تختے میں لگا دیا جائے تو تیرنے لگتا ہے۔ انسان دوسروں کا محتاج ہے۔ اس کو تیرنے کیلئے کسی نہ کسی تختے کی ضرورت ہوتی ہے اور مرشد یا استاد اس تختے کا کام کرتا ہے۔

طلب پیدا کیجیے

جو آدمی طلب گار نہیں ہے، اللہ تعالیٰ بھی اسے یہ انعام نہیں دیتا۔ اصل چیز طلب اور تلاش ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء "کشف المحجوب" کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جو اس کتاب کو صدقِ دل سے پڑھے گا، اسے سچا مرشد مل جائے گا۔ کیونکہ اس کتاب کو پڑھنے کیلئے تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔

یقین والا ترقی کر جاتا ہے۔ یقین کا مطلب ہے، کسی دوسرے پر

یقین، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و عطا پر یقین۔ یہی طالب روتا ہے اور کہتا ہے کہ مالک، میری زندگی میں کوئی اچھا بندہ داخل کر دے۔ لیکن مرشد کی یہ طلب دنیا کیلئے نہیں ہو، بلکہ اپنی ذات کی بہتری کیلئے ہونی چاہیے۔ مرشد اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کیلئے ہونا چاہیے۔ مرشد وہ ہو جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے آشنا کر دے۔ مرشد وہ ہو جو خود آپ پر آپ سے آشنا کرا دے۔



مستقبل بنانے والے عناصر

"مستقبل ان لوگوں کا ہوتا ہے جو خوابوں کی خوب صورتی پر یقین رکھتے ہیں!"

ایلینور روز ویلٹ

انسان ہمیشہ ہی سے اپنے مستقبل کو پیشگی جاننے کا خواہش مند رہا ہے۔ چنانچہ مستقبل کے موضوع کام کرتے ہوئے جو علوم پروان چڑھے، اُن کی تاریخ اتنی پرانی ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ کس علم کا آغاز کب ہوا۔ انسان شروع سے اس تلاش میں ہے کہ اپنے مستقبل کو کیوں کر بہتر بنایا جائے یا کیسے اپنے مستقبل کے بارے میں حال ہی میں جان لیا جائے۔ لوگ ہاتھ کی لکیریں دیکھنے کے بعد اپنے مستقبل کا اندازہ لگاتے ہیں۔ اسلام ہمیں اس سے منع کرتا ہے، لیکن اس کے باوجود لوگ جاننا چاہتے ہیں کہ میرا مستقبل کیا اور کیسا ہے۔ کچھ لوگ اپنے ہاتھوں کا بغور جائزہ لیتے رہتے ہیں اور انھیں پتا چل جاتا ہے کہ یہ لکیریں کچھ عرصے بعد بدلتی رہتی ہیں۔ انسان چاہے اَن چاہے اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں اپنا مستقبل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اسی طرح کا ایک فن "علم الاعداد" ہے، جس میں عدد یعنی نمبر سے مستقبل شناسی کی جاتی ہے۔ اس علم کے ماہرین ایک سے نو تک نمبروں کو جمع کر کے ایک نمبر بناتے ہیں اور پھر نتائج نکالتے ہیں۔ مثال کے طور پر، کسی نام کے کچھ نمبر ہیں۔ ان کو جمع کیا تو وہ 13 کا عدد بن گیا۔ پھر ایک اور تین کو جمع کیا تو چار جواب آگیا۔ یہ علم بھی بہت پرانا ہے۔ اس علم کے ذریعے انسان اپنے مستقبل کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا

ہے۔ اکثر لوگ دوسروں سے کہتے ہیں کہ آپ کوئی عدد سوچیں۔ وہ 57 نمبر کہہ دیتا ہے تو اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں کہ آنے والا وقت آپ کیلئے اچھا نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ تو میں نے تو ایسے ہی کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اچانک انسان کا شعور نہیں کہتا، انسان کا لاشعور کہتا ہے۔ شعور کو مستقبل کے بارے میں علم نہیں ہوتا، لیکن لاشعور کو علم ہوتا ہے اور لاشعور جو نمبر کہتا ہے، اصل اشارہ وہی ہوتا ہے۔

خوابوں کا علم بھی ایک معروف علم ہے۔ لوگ اپنے مستقبل کا حال خوابوں کے ذریعے لگاتے ہیں۔ خواب اور اس کی تعبیر کے متعلق کتابیں بھری پڑی ہیں۔ تعبیر بتانے والے تعبیر بتا رہے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر ایک لڑکا خواب میں چاند کو دیکھتا ہے تو اسے تعبیر یہ بتائیں گے کہ اگر تمہارا امتحان ہونے والا ہے تو تم کامیاب ہو جاؤ گے۔ اگر نوکری کر رہے ہو تو تمہاری شادی ہو جائے گی۔ یہی خواب اگر لڑکی دیکھے تو اس کو یہ تعبیر بتائی جائے گی کہ تمہاری شادی ہو جائے گی۔ اگر شادی شدہ ہے تو کہا جائے گا کہ بیٹا ہوگا۔ تعبیر بتانے والے پوچھتے ہیں کہ خواب کس وقت دیکھا تھا، صبح کا وقت تھا یا شام کا، کھایا کیا تھا، چاند کی حالت کیا تھی، سورج کی حالت کی تھی، ستاروں کی حالت کیا تھی۔ ان تمام باتوں کو جاننے کے بعد اس کی تعبیر دی جاتی ہے۔

نجوم بھی ایک علم ہے۔ بنی اسرائیل اس علم کے بہت ماہر تھے۔ ایک دفعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جاؤ، اس بستی کو تباہ کر دو۔ انھوں نے کہا، باری تعالیٰ میں اس بستی کو تباہ کرنے سے پہلے وہاں کے لوگوں کے علم کا اندازہ لگانا چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اجازت دے دی۔ آپ ایک کسان کے پاس گئے جو کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا۔ آپ نے کہا، میں آپ سے کچھ پوچھنا ہوں۔ کسان نے کہا، پوچھو۔ آپ نے پوچھا، جبرئیل کہاں ہے؟ اس نے ہاتھ میں جو چھڑی پکڑی ہوئی تھی، اس سے زمین پر لائنیں لگائیں اور آسمان کی طرف دیکھا اور کہا کہ آسمان پر نہیں ہے۔ پھر دوبارہ لائنیں لگائیں اور کہا، زمین پر بھی نظر نہیں آ رہے۔ پھر ایک دم سے کہا کہ دیکھو یا جبرئیل تم ہو یا میں ہوں، کیونکہ میں تو نہیں ہوں لہٰذا تم ہی ہو۔

اسی طرح ستاروں کا بھی ایک علم ہے۔ اس میں ستاروں کی چالوں سے اندازہ لگا

کر راتے معلوم کیے جاتے ہیں یا آنے والے وقت کی پیشین گوئی کی جاتی ہے۔

دنیا میں بعض معروف ہستیاں ایسی ہیں جو پیدا ہوئیں تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی دنیا میں اشارے ملنے لگے۔ وہ اشارے ابر رحمت کی شکل میں، سکون قلب کی شکل میں، نور کی برسات کی شکل میں تھے۔ ایک راہب کہتا ہے کہ اس بچے کو چھپا لیں، یہ نبی ہیں۔

اس کے علاوہ عام لوگ بھی بعض اشاروں کے ذریعے اپنے مستقبل کا اندازہ لگاتے ہیں۔ جب بچہ امتحان دیتا ہے تو اس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مجھے رزلٹ کا پہلے سے پتا لگ جائے۔ اس کی تمنا اتنی پیپر دینے کی نہیں ہوتی جتنی رزلٹ جاننے کی ہوتی ہے۔

ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اس کے کندھے پر ہاتھ مارے اور مستقبل بدل جائے۔ کوئی بابا مل جائے جو چھڑی گھمائے اور وارے نیارے ہو جائیں۔ لوگ انگوٹھیاں پہنتے ہیں، کیوں کہ اُن کا یہ یقین ہوتا ہے کہ اگر یہ پتھر میرے ساتھ ہے تو میرا مستقبل اچھا رہے گا۔ جب وہ انگوٹھی اتارتے ہیں تو فیصلہ نہیں کر پاتے، انگوٹھی پہن کر فیصلہ کرتے ہیں۔ ان کے مطابق، ان کی اچھی یا بری قسمت کا تعلق اس پتھر سے ہوتا ہے، حالانکہ اس کا کہیں زیادہ تعلق اس پتھر سے وابستہ خود اُن کے اپنے یقین سے ہوتا ہے۔

آج سائنس ترقی کر چکی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ ایک ذاتی بہتری کی بھی سائنس ہوتی ہے جس کو سیلف ہیلپ (Self help) اور پرسنل ڈیویلپمنٹ (Personal Development) کہا جاتا ہے۔ اسے اُردو میں "خود نموئی" کہہ لیجیے۔ خود نموئی یا پرسنل ڈیویلپمنٹ کی کئی شاخیں ہیں۔ ان میں سے معروف و مقبول "نیورو لنگوئسٹک پروگرامنگ" یا این ایل پی (NLP) ہے۔ اسے سوچ کی سائنس بھی کہا جاتا ہے۔ این ایل پی میں بہت زیادہ کام انسانی یقین (Human Belief System) پر کیا جاتا ہے۔ این ایل پی کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے، اچھا یا برا، کام یاب یا ناکام... اس کا سب سے بڑا سبب اس کا اپنا یقین ہوتا ہے۔ انسانی یقین پر

گزشتہ ستر اسی برس میں بہت زیادہ کام ہوا ہے۔ یہ کام نہایت سائنسی بنیادوں پر ہوا ہے۔ ان تحقیقات کے بعد انسان اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ہم ستاروں سے حساب لگوائیں یا نہ لگوائیں، ہم اپنے خوابوں سے حساب لگوائیں یا نہ لگوائیں، ہم اپنے ہاتھوں کی لکیروں سے مستقبل کو جانچیں یا نہ جانچیں، اپنے نام کے اعداد کی فکر کریں یا نہ کریں، کچھ وجوہ ایسی ہیں کہ اگر وہ انسان میں پائی جائیں تو مستقبل اچھا ہوتا ہے۔ اگر وہ نہ ہوں تو مستقبل اچھا نہیں ہوگا۔

خودنموئی کی سائنس کے ماہرین کے مطابق، اچھا مستقبل پانے کیلئے ایک فرد کی شخصیت میں درج ذیل خصوصیات ہونی چاہئیں:

1۔سوچ

کئی تحقیقات کے مطابق یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مستقبل پر اثر انداز ہونے والی سب سے اہم شے انسان کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ سوچ ہی سے مستقبل بنتا ہے۔ آج ہم جس سوچ کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، وہ کبھی ماضی میں تشکیل پائی اور پروان چڑھی ہے۔ ماضی میں جو سوچ تشکیل ہوئی، اس نے ہمارا مستقبل تخلیق کیا جو آج ہمارا حال ہے۔ اسی طرح، آج کی سوچ کے مطابق ہمارا مستقبل تشکیل پائے گا۔

دنیا میں جتنی بھی بیماریاں ہیں، وہ دراصل سوچ کی بیماریاں ہیں۔ کئی لوگ ایسے ملیں گے جو کہتے ہیں کہ ہم رات کو سو نہیں سکتے۔ جب ان سے اس کا سبب پوچھا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہماری سوچ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ خیالات کا انبار ہمیں سونے نہیں دیتا۔ ہم بے چین رہتے ہیں۔

دنیا میں دو طرح کی سوچ ہیں: مثبت اور منفی۔ وہ تمام خیالات مثبت ہیں جن سے ہم اچھا محسوس کرتے ہیں۔ جو ہمیں خواب دیکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ وہ تمام خیالات جو ہماری توانائی کو دیمک کی طرح چاٹ جائیں۔ یہ وائرس ہے جو مستقبل کو تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ایک شخص سقراط کے پاس آیا اور کہا کہ میرا مستقبل کیا ہے؟ مجھے اپنے مستقبل کا پتا کیسے لگے گا؟ سقراط نے ایک کاغذ دیا اور کہا کہ اس پر اپنے خیالات لکھو۔ اس نے اپنے خیالات لکھ دیے۔ سقراط نے کہا، یہ تمہارا مستقبل ہے، کیونکہ جیسے

تمہارے خیالات ہوں گے، ویسا ہی تمہارا مستقبل ہوگا۔ حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں، ''جو تمہارا خیال ہے، وہی تمہارا حال ہے اور حال سے ہی مستقبل بنتا ہے۔''

2۔ نظریات

ہر انسان کے اپنے نظریات اور اپنی اپروچ ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دیانت داری بڑی چیز ہے، جبکہ بددیانت آدمی کے نزدیک دیانت داری کی کوئی اہمیت نہیں۔ جس کے جیسے نظریات ہوں گے، ویسا ہی اس کا مستقبل ہوگا۔ اگر نظریات اچھے ہیں تو پھر مستقبل بھی ٹھیک ہوگا۔ پرسنل ڈیویلپمنٹ میں ''یقین'' (Belief) کہا جاتا ہے۔ یقین انسانی زندگی کو بناتے ہیں اور یہی بگاڑتے ہیں۔ معروف کوچ اور مصنف انتھونی روبنز کہتا ہے کہ دو طرح کے یقین ہیں: ایک یقین جو آدمی کو قابل کرتے ہیں، دوسری قسم کے یقین آدمی کی قابلیت چھین لیتے ہیں۔

بعض عمومی یقین جو مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں:

☆ اگر کوئی یہ کہے کہ آپ بہت زبردست انسان ہیں تو اس کی بات کا یقین کرنا چاہیے، لیکن ہمارے ہاں معاملہ الٹ ہوتا ہے۔ ہماری دنیا ہمیں کہہ رہی ہوتی ہے کہ تم بڑے زبردست ہو، ہمیں یقین ہی نہیں آتا۔ جس دن دس میں سے دس نمبر آجائیں تو اُس دن ہمیں اپنی قابلیت پر شک ہونے لگتا ہے۔ ہمیں یہ یقین ہونا چاہیے کہ اگر دنیا کی آبادی آٹھ ارب ہے تو ان آٹھ ارب انسانوں میں، مجھ جیسا کوئی نہیں ہے۔ میں منفرد ہوں۔

☆ اپنی صلاحیتوں پر یقین ہونا چاہیے۔ تیراک کے پاس اگر یقین نہ ہو تو وہ تیر نہیں سکتا۔ جہاز اڑانے والے کے پاس یقین نہ ہو تو وہ جہاز اڑا نہیں سکتا۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا کا ہر پرندہ اپنے پروں سے نہیں اڑتا بلکہ اپنے یقین سے اڑتا ہے۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ اگر میں پر پھیلاؤں گا تو ہوا میں اڑنے لگوں گا۔ صلاحیتوں پر یقین کامیابی کو ممکن اور مستحکم بناتا ہے۔

☆ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین ہونا بہت ضروری ہے۔ ہم مخلوق ہیں اور وہ خالق ہے۔ مخلوق کا اپنے خالق پر یقین اور بھروسا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر اس خالق کائنات نے ہمیں پیدا کیا ہے تو اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ بغیر مقصد کے ہماری پیدائش نہیں ہوسکتی، اس لیے اپنے اور اپنے مستقبل کے حوالے سے اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنا چاہیے۔

☆ زمانے پر یقین ہونا چاہیے۔ یہ وقت ہمارا وقت ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس وقت کو ہم سے نہیں چھین سکتی۔ دنیا میں سو سال پہلے ایک وقت وہ تھا کہ جب ہم اس دنیا میں نہیں تھے۔ وہ ہمارا وقت بھی نہیں تھا۔ آج سے سو سال بعد میں نہیں ہوں گا تو ہمارا وقت بھی نہیں ہوگا۔ اپنے وقت پر یقین کرنا سیکھیے۔

3۔ عادات

بھارت کے سابق صدر عبدالکلام اسکول میں بچوں کو لیکچر دیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ''دنیا کا کوئی آدمی اپنے مستقبل کو بدل نہیں سکتا، لیکن اپنی عادات بدل سکتا ہے اور پھر اس کی عادات اس کے مستقبل کو بدل کر رکھ دیتی ہیں۔'' اگر آپ کی عادات اچھی ہیں تو پھر کامیابی آپ کی منتظر ہوگی۔ پھر مٹی کو ہاتھ لگائیں گے تو وہ سونا بن جائے گی۔ پھر لوگ چاہے اَن چاہے محبت کریں گے۔ آپ کو مواقع زیادہ ملیں گے۔ شہرت ملنا شروع ہوجائے گی، شناخت ملنا شروع ہوجائے گی اور پھر قدرت بھی راستہ بنانا شروع کردے گی۔

☆ خوش اخلاق اور خوش کردار بنیں۔ اگر اخلاق اچھا ہوگا تو پھر ترقی بھی ہوگی اور رزق بھی بڑھے گا۔ اللہ تعالیٰ زندگی میں برکت ڈالے گا اور عزت بھی ہوگی۔ برکت کا آپ کے اخلاق اور کردار سے گہرا تعلق ہے۔

☆ اپنے اندر سیکھنے کی عادت ڈالیے۔ پوری دنیا کتاب ہے۔ ایک ایک واقعہ، ایک ایک شخص سکھاتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''زمین پر پڑے کاغذ سے بھی نصیحتیں ملنا شروع ہوجاتی ہیں۔'' راہ چلتے کہیں نہ کہیں کوئی صفحہ

دیکھیں، کوئی بورڈ، بینر یا اشتہار دیکھیں تو اس سے بھی سیکھنے کو ملے گا۔ سیکھنے کی عادت آپ کے مستقبل پر اثر ڈالتی ہے۔

☆ عزت کرنے کی عادت ڈالیے۔ سب سے پہلی اپنی عزت کیجیے تو دوسروں کی عزت کرنا آسان ہو جائے گا۔ جو آدمی اپنی عزت نہیں کرتا، دنیا بھی اس کی عزت نہیں کرتی۔ لوگوں کے عہدے بڑے ہو جاتے ہیں، مقام بڑا ہو جاتا ہے، لیکن عزت نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ خود اپنی عزت نہیں کرتے۔

☆ اپنے کام کی عزت کیجیے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو کوئی کام، کوئی کاروبار، کوئی فن، کوئی ذمے داری دی ہے تو اس کی عزت ضرور کیجیے، کیونکہ اگر آپ اپنے کام کی عزت نہیں کریں گے تو پھر آپ کو دوسروں سے عزت بھی نہیں ملے گی۔

☆ جس کو اللہ تعالیٰ نے عزت دی ہے، اس کی عزت کیجیے۔ ہمیں عادت ہوتی ہے کہ ہم جب پرانے دوستوں سے ملتے ہیں جو بڑے عہدوں پر پہنچ چکے ہوتے ہیں تو اُن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ بہ حیثیت قوم، ہمارا یہ بہت عام مسئلہ ہے کہ ہم دوسروں میں کیڑے نکالتے ہیں۔

☆ قدر کرنا سیکھیے۔ جو آدمی اپنی چیزوں، اپنے پیسوں، اپنی فیملی، اپنی اولاد، اپنے گھر اور اللہ تعالیٰ نے جو آسانیاں دے رکھی ہیں، اُن کی قدر نہیں کرتا تو اللہ تعالیٰ ان نعمتوں کو چھین لیتا ہے۔ جو آدمی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو اہمیت دیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں برکت ڈال دیتا ہے۔ ہم اس بات کی بہت کوشش کرتے ہیں کہ جو ہمارے پاس نہیں ہے، وہ ہمیں مل جائے۔ لیکن، ہمارے پاس اللہ کا دیا پہلے سے جو کچھ ہے، ہم اس پر شکرگزار ہوتے ہیں اور نہ اس کی قدر کرتے ہیں۔ معروف مصنف جان گرے جو "مین فرام مارس، ووِمن فرام وینس" کا مصنف بھی ہے، اس نے اس موضوع پر بھی کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے، How to Get What You Want; and Want What You Have۔ یہ کتاب موقع لگے تو ضرور پڑھیے۔

☆ ہمیشہ اپنی اوقات یاد رکھیے۔ جب بھی آپ کو اپنا آغاز یاد ہوگا تو آپ

شکر گزار رہیں گے۔ لوگوں پر مہربان ہوں گے۔ ملازموں پر مہربان ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کامیابیوں اور نعمتوں کی قدر کریں گے۔ اپنی صلاحیتوں اور مہارتوں پر اترانے کی بجائے عاجز رہیں گے۔

4۔ ملنے والے لوگ

انسان اپنی دوستی سے پہچانا جاتا ہے۔ اپنی دوستیوں اور اپنی نفرتوں کا مشاہدہ کیجیے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کوئی قدر والا انسان ہو اور آپ اسے دور کر رہے ہوں۔ اور کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کوئی آپ کا دشمن ہو اور آپ نے اس سے ہاتھ ملایا ہوا ہو۔ حضرت واصف علیؒ فرماتے ہیں، ''انسان عجیب مخلوق ہے۔ اس کی آدھی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ پر اور آدھی تقدیر اُس کے ہاتھ پر لکھی ہوتی ہے جس سے وہ ہاتھ ملاتا ہے۔'' آپ جس سے ہاتھ ملاتے ہیں، وہ آپ کو یا تو بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے یا پھر پستیوں میں گرا دیتا ہے۔ خوشبو کی دکان پر جائیں تو اگر وہاں کچھ نہیں خریدیں گے، تب بھی کپڑوں میں خوشبو بس جائے گی۔ کوئلے کی دکان پر جائیں گے تو کوئلہ نہیں خریدیں گے، تب بھی کپڑوں پر کالک لگ جائے گی۔

قدر دینے والے بنیں۔ لوگوں کی قدر کیجیے اور ان لوگوں کو اپنی زندگی میں شامل کیجیے جو آپ کی قدر میں اضافے باعث کا ہوں۔ وہ لوگ جن کی شمولیت سے آپ کی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ آپ کے دوست نہیں ہیں۔ ایسا فرد جس کی وجہ سے آپ کی زندگی، آپ کی سوچ، نظریات و یقین اور عادات بدل جائیں، آپ کیلئے بہت اہم ہے۔ ایسے افراد کو اپنی زندگی میں ضرور شامل کیجیے۔

اپنے خیالات کے پہرہ دار رہیں، کیونکہ سوچ مستقبل کو تباہ کر دیتی ہے اور سنوار بھی دیتی ہے۔ بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ دل کے دروازے پر دربان بن کر بیٹھو اور دیکھو کہ کون سا خیال آتا ہے اور کون سا خیال جاتا ہے، کیونکہ جو بھی خیال آتا ہے وہ مستقبل کو متاثر کرتا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے لوگوں کا کہنا ہے کہ یقین سے زندگی بنتی ہے اور بگڑتی ہے۔ آپ کے یقین اچھے ہوں گے تو زندگی اچھی ہوگی۔ سید سرفراز شاہ

صاحب فرماتے ہیں، ''مجھے کسی کے مستقبل کی کوئی خبر نہیں ہے، لیکن اتنا پتا ہے کہ جس کے عادات و خصائل آج اچھے ہیں، تو پھر اس کا مستقبل بہت اچھا ہے۔ جو آج میں اچھا انسان ہے، اللہ تعالیٰ اس کے آنے والے وقت کو اچھا کر دیتا ہے۔ جو آج میں اچھا نہیں ہے، اس کا مستقبل خطرے میں ہے۔''

اپنے حال کو بدلیے، مستقبل خود بدل جائے گا۔



اسٹریس مینجمنٹ

"آج کی بھیڑ چال میں ہم بہت زیادہ سوچتے ہیں، ہم بہت زیادہ کھوجتے ہیں، بہت زیادہ چاہتے ہیں...اور موجودہ لمحے سے لطف اٹھانا بھول جاتے ہیں!"

ایکھارٹ ٹولے

ذرا اُن چیزوں کی فہرست بنایئے جو ہم زندگی میں مینج کرتے ہیں:

☆ نوکری
☆ بزنس
☆ خاندان
☆ بیوی
☆ بچے
☆ نیکیاں
☆ آخرت
☆ مستقبل
☆ ذرائع
☆ صحت

اس فہرست پر غور کیجیے تو پتا چلے گا کہ ان میں سے کوئی چیز ایسی نہیں جو قیمتی نہ ہو۔ پتا چلا کہ انسان ان چیزوں کو مینج کرتا ہے جو قیمتی ہوتی ہیں۔ تو کیا اس پیمانے پر اسٹریس کو مینج کیا جاسکتا ہے؟ کیوں کہ اسٹریس () یا ذہنی کرب قیمتی شے نہیں ہے۔ لہٰذا،

اسٹریس کو مینج نہیں کیا جاسکتا، البتہ اسٹریس سے نمٹنے کیلئے خود کو ضرور مینج کیا جاسکتا ہے یعنی سیلف مینجمنٹ (Self Management)۔

جو آدمی خود کو جتنا اچھا مینج اور منظم کرسکتا ہے، اس کی زندگی میں اتنا ہی اسٹریس کم ہوتا ہے۔ کوئی بھی اپنے اسٹریس کو سنبھال کر نہیں رکھنا چاہتا۔ جب آدمی باہر کی چیزوں کو مینج کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر اسٹریس سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ یہ ہمیشہ تب ہی مینج ہوتا ہے کہ جب آدمی خود کو مینج کرتا ہے۔ کوئی ماہر نفسیات کے پاس جائے اور کہے کہ مجھ سے اسٹریس مینج نہیں ہو رہا تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ اس میں سیلف مینجمنٹ کی کمی ہے۔ اسٹریس مینجمنٹ ہر اس فرد کا مسئلہ ہے جس کے پاس سیلف مینجمنٹ کی کمی ہے۔

کوئی بھی شخص اسٹریس سے نہیں بچ سکتا۔ یہ ایک فطری عمل ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر رکھا ہے۔ کیونکہ زندگی میں سو طرح کے مسائل ہیں۔ کاروبار ہے تو اسٹریس ہے، جاب کا اسٹریس ہے، فیملی کی ذمے داریوں کا اسٹریس ہے۔

اکیسویں صدی کی وبا۔ اسٹریس

طبی تحقیقات و مطالعات کے مطابق، موت کی سب سے بڑی وجہ دہشت گردی نہیں ہے، اسٹریس ہے۔ عالمی ادارہ صحت (WHO) نے اسٹریس کو اکیسویں صدی کی وبا قرار دیا ہے۔ اس لیے اسٹریس کو معمولی سمجھ کر اس سے بے اعتنائی برتنے کی بجائے اس پر توجہ کرنے اور اس سے درست انداز میں نمٹنے کی ضرورت ہے۔

جب آدمی خود کو مینج نہیں کر پاتا تو اسٹریس اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور پھر تعلقات سب سے زیادہ اسٹریس کی وجہ سے خراب ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ کاروبار اسٹریس کی وجہ سے تباہ ہوتے ہیں۔ انسانی صحت اسٹریس ہی کی وجہ سے برباد ہوتی ہے۔ ہارٹ اٹیک کا سب سے بڑا سبب اسٹریس ہے۔

جو لوگ اسٹریس کا شکار ہوتے ہیں اُن کی زندگی اتنی تکلیف دہ ہو جاتی ہے کہ انھیں موت کی تکلیف نہیں رہتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مرنا آسان ہے کہ روز روز کی تکلیف سے تو جان چھوٹے گی۔ یاد رکھیے کہ جب کبھی اسٹریس آگھیرے تو سمجھ لیجیے کہ سیلف

مینجمنٹ کم ہوگی ہے۔ لہٰذا سیلف مینجمنٹ پر توجہ کیجیے اور اسے سیکھئے۔

ان واقعات یا چیزوں کی فہرست بنائیے جن کی وجہ سے آپ ماضی میں اسٹریس میں مبتلا ہوئے:

☆ شرم و جھجک

☆ ہٹ دھرمی

☆ لڑائی

☆ امتحان کی ناکافی تیاری

☆ دفتر میں باس کا ناخوش ہونا یا شکایت کرنا

☆ کاروبار میں نقصان

☆ کوئی گھریلو مسئلہ

☆ مزید کوئی مسئلہ یا مسائل جو آپ کے خیال میں آپ کے اسٹریس کا باعث ہوئے

یہ فہرست ترتیب دے لیں تو ان چیزوں پر نشان لگائیے جو آپ کے اختیار میں نہیں تھیں۔ جیسے کوئی حادثہ یا سانحہ... جو انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ غیر اختیاری واقعات زندگی میں بے شمار بار آتے ہیں۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دیوار سے ٹکریں مارتا ہے، لیکن راستہ نہیں ملتا۔ ایسا اس لیے بھی ہوسکتا ہے کہ کسی چیز یا واقعے کی نیچر کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ ایسے میں اسٹریس کہیں زیادہ ہو جاتا ہے، کیوں کہ آدمی وہ کرنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ آدمی کا اپنا قصور ہوتا ہے۔ غیر اختیاری واقعات اور اسباب کو بدلا نہیں جا سکتا، ان سے صرف سیکھا جا سکتا ہے۔ یہ غیر اختیاری واقعات زندگی میں مثبت احتیاط لے کر آتے ہیں اور بعض اوقات استاد سے زیادہ موثر ہوتے ہیں۔

اپنے تجربات سے سیکھئے

ان واقعات و سانحات میں اکثر ہمارے لیے سبق پوشیدہ ہوتے ہیں۔ آپ کی

زندگی میں بھی ایسا کئی بار ہوا ہوگا کہ کسی سانحے نے آپ کو بہت قیمتی سبق دیا اور آپ کو اس سبق سے آئندہ زندگی میں بہت فائدہ ہوا۔ ایک فہرست بنائیے کہ آپ نے اپنی زندگی میں غیر اختیاری واقعات یا غلطیوں سے کیا سیکھا ہے:

- ☆ اپنی جیب کی حفاظت کرنی ہے
- ☆ اجنبی لوگوں سے بات نہیں کرنی
- ☆ راہ چلتے سیلز مین سے کوئی چیز نہیں لینی
- ☆ ذاتی زندگی کے بارے میں ہر ایک سے بات نہیں کرنی
- ☆ ہمدردی پرائے سے نہیں لینی، ہمیشہ اپنے سے لینی ہے
- ☆ چادر دیکھ کر پیر پھیلانا ہیں
- ☆ وقت سے پہلے تیاری کرنی ہے
- ☆ کبھی کوئی شے دیکھے اور چھوئے بغیر نہیں پینی یا نہیں کھانی

جو آدمی اس مزاج کے ساتھ زندگی گزارتا ہے کہ میری زندگی کا تمام تجربات میرے لیے سیکھنے کا ذریعہ ہیں تو اس کا اسٹریس کم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جو لوگ یہ جذبہ رکھتے ہیں کہ انھیں جو کچھ معلوم ہے، وہ دوسروں کو منتقل کریں گے تو ایسے افراد بھی کبھی کم اسٹریس کا شکار ہوتے ہیں۔ کیونکہ قدرت کا اصول ہے کہ جو بانٹتا ہے، قدرت اس کو نوازتی ہے۔

جتنا زیادہ قدرت ہم سے مخاطب ہوتی ہے، اتنا تو ہم بھی اپنے آپ سے نہیں بولتے۔ جو آدمی زندگی میں وہ کرتا ہے جو اسے پسند ہے تو وہ اس دنیا کو جنت بنا لیتا ہے، کیونکہ پسند اور شوق میں زندگی کے مسائل اور مشقتیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ پاتیں۔ ایسے انسان کو پیش آمدہ مسائل کی پروا نہیں ہوتی۔ اسے لوگوں کی تنقید کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ تو اپنی مستی میں مست ہوتا ہے۔ وہ اپنے پسندیدہ کام میں مگن رہتا ہے اور اپنے جنون میں مجنوں ہوا جاتا ہے۔ زندگی میں زیادہ تر وہی لوگ اسٹریس کے مارے ہوتے ہیں جو اس دنیا میں اپنی پسند اور ناپسند اور جنون کو دریافت نہیں کر پاتے۔ انھیں معلوم ہی نہیں ہو پاتا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں کس قسم کی شخصیت اور ڈھانچے کے ساتھ اس دنیا میں بھیجا ہے۔

جو لوگ اپنی فطرت کو دریافت کر لیتے ہیں، وہ اسٹریس سے بہت دور رہتے ہیں۔ کیوں کہ اسٹریس کاموں کی زیادتی یا تھکن سے نہیں ہوتا، عدم دلچسپی سے ہوتا ہے۔

آدمی زندگی سے جو کچھ سیکھتا ہے، اگر اسے دیکھا جائے تو پوری کتاب بن سکتی ہے۔ بعض اوقات کتاب وہ کچھ نہیں سکھاتی جو زندگی سکھا دیتی ہے۔ اپنی ''زندگی کی کتاب'' (Life Book) بنائیے اور اس میں وہ تمام باتیں، وہ تمام نکات لکھئے جو آپ نے اب تک اپنی زندگی سے سیکھے ہیں۔

بعض اوقات زندگی میں ایسا شدید اسٹریس آتا ہے کہ آدمی کو دعا کرنے کا سلیقہ آ جاتا ہے۔ اس سے پہلے اسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ دعا کیا ہے اور اللہ تعالیٰ سے کیسے مانگا جاتا ہے۔ لیکن، جب وہ عاجز آ جاتا ہے تو اس کا دل گریہ وزاری شروع کر دیتا ہے اور بے اختیار اُس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے پیاروں کی سنتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میرا بندہ میری طرف آ جائے۔ کسی اسٹریس کی صورت میں جب آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اللہ کو بڑا پیار اور رحم آتا ہے۔ ایسے میں بندے کے آنسوؤں کے ساتھ اس کا تمام اسٹریس بہہ جاتا ہے اور جو راحت و طمانیت نصیب ہوتی ہے، وہ ناقابل بیان ہے۔ اگر زندگی میں ایسی تکلیف آئے کہ اس کے بعد کسی کی تکلیف دیکھی نہ جائے تو وہ تکلیف بہت قابل رشک ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''ایسا گناہ جو توبہ کرا دے، اس گناہ کا شکریہ۔''

حضرت بابا فریدؒ فرماتے ہیں، ''آنسو بہا'' کیونکہ وہ جو ریت ہے اس کے نیچے سونے کی ڈلی ہے۔ آنسوؤں کی ریت ہٹے گی تو نیچے سے سونا نکلے گا۔ انسان جتنا تکلیف میں خود کو جانتا ہے، خوشی میں نہیں جان سکتا۔ خود شناسی کا مرحلہ تکلیف کے ایام ہی میں طے ہوتا ہے۔ جب ساری دنیا بے قدری کرتی ہے، اُس دن اپنی قدر پہچانی جاتی ہے۔ بعض اوقات خود کو جاننے کیلئے ٹریجڈی ضروری ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بغیر انسان کے فرعون بن جانے کا ڈر ہوتا ہے۔ انسان بھول جاتا ہے کہ قدرت بھی کوئی شے ہے۔ پھر، خدا اپنے بندے کو چھوٹی بڑی تکالیف دے کر اسے فرعون بننے سے روکتا ہے۔

ان چیزوں کی فہرست بنایئے جن کو بدلا جا سکتا تھا:

☆ میں ہی کمزور تھا

☆ میں اس قابل نہیں تھا

☆ صلاحیت میں کمی تھی

☆ معاشی طور پر آزاد نہیں تھا

آپ کتنا پیسہ کماتے اور کتنا خرچ کرتے ہیں؟

اسٹریس کا معاشی کیفیت سے گہرا تعلق ہے۔ جو لوگ معاشی طور پر فعال ہوتے ہیں، ان میں نسبتاً اسٹریس کم ہوتا ہے۔ جن لوگوں کی لاٹری نکلی ان پر تحقیق کی گئی تو پتا چلا کہ کچھ عرصہ بعد وہ پھر اسی حالت میں چلے گئے، یعنی معاشی طور پر بدحال۔ جب ان سے پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ کاش ہماری لاٹری نہ نکلتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ روپیہ تو آ گیا، لیکن پیسہ استعمال کرنے کی اہلیت نہیں آ سکی۔ زندگی میں اہلیت یا ٹیلنٹ کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ لوگ پیسہ کمانا آسان سمجھتے ہیں، مگر اس سے زیادہ مشکل کام پیسہ خرچ کرنا ہے۔ عموماً لوگوں کے پاس پیسہ تو خوب ہے، مگر پیسہ خرچ کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ لہٰذا، وہ خوب کماتے ہیں لیکن پھر بھی معاشی مسائل میں پھنسے رہتے ہیں۔ اگر آپ کو پیسہ کمانا آتا ہے مگر پیسہ خرچ کرنے کا ٹیلنٹ آپ کے پاس نہیں تو آپ بہت محنت سے کمایا ہوا پیسہ تھوڑی سی محنت سے ضائع کر دیں گے۔ نتیجہ؟ پیسہ کمانے کا اسٹریس اور پھر پیسہ ختم ہو جانے کا اسٹریس۔

ان چیزوں کی فہرست بنایئے جن کو بہتر کر کے اسٹریس کم کیا جا سکتا ہے:

☆ لوگوں کو منظم کرنا

☆ ٹیم بنانا

☆ وقت کو منظم کرنا

☆ روپے کو منظم کرنا

☆ اپنے کام کو سیکھنا

ہمارے ہاں بے شمار لوگ ایسے ہیں جنھیں خود تو زندگی گزارنی نہیں آتی اور ساتھ ہی ساتھ ان سے جڑے ہوئے لوگوں کی زندگی بھی ابتر ہوتی ہے۔ ہر شخص کی شخصیت کا ایک ایسا حصہ ضرور ہوتا ہے جو دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ یہ اُن کی شخصیت کا کمزور پہلو ہوتا ہے۔ لیکن جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے، شعور آتا ہے اور اچھے لوگ زندگی میں آتے ہیں تو وہ حصہ کم ہوتا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہوتا ہے تو وہ اس کمزور حصے کو چھپا دیتا ہے۔ وہ اپنے بندے کو دوسروں کے سامنے اتنا اچھا بنا دیتا ہے کہ پھر لوگ اس تک پہنچ نہیں پاتے۔ البتہ کمزور پہلو کے پیچھے چلے جانے سے کچھ چیزوں میں اسٹریس ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں زندگی میں سیکھنے کے ذرائع بڑھائیے۔ اچھے لوگوں کو زندگی میں لائیے تاکہ کمزور حصے کے اثرات کم سے کم ہو سکیں۔

انسانی تعلقات اور اسٹریس

جن لوگوں کو تعلقات بنانا آتے ہیں، اُن کی زندگی میں اسٹریس کم ہوتا ہے۔ تعلقات میں بہتری کیلئے کشادہ ظرفی ضروری ہے۔ اپنے اندر ظرف پیدا کیجیے۔ ظرف پیدا کرنے کا ایک موثر طریقہ دوسروں پر خرچ کرنا ہے۔ کبھی اپنی پوری کمائی بانٹ کر دیکھیے بلکہ وہ چار دفعہ دل سے بانٹیے۔ اللہ تعالیٰ سخی بنا دے گا اور سخی اللہ تعالیٰ کا دوست ہوتا ہے۔ کنجوس انسان اپنا اسٹریس مینج نہیں کر سکتا جبکہ سخی انسان کیلئے اسٹریس کو مینج کرنا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ بلکہ سخی کو دیکھ کر تو اسٹریس دور سے بھاگتا ہے۔

فہرست بنائیے کہ آپ کا اسٹریس کہاں سے آتا ہے:

- ☆ کوئی فرد ہو سکتا ہے
- ☆ آئیڈیاز کا واضح نہ ہونا
- ☆ یقین (منفی)
- ☆ ---------
- ☆ ---------
- ☆ ---------

بعض اوقات ایک عامل (فیکٹر) ایسا ہوتا ہے جو بار بار اسٹریس کا باعث بنتا ہے۔ کھوجئے کہ اس کے پیچھے اصل میں کیا عامل ہے۔ کیا قدرت مجھے کچھ سکھانا چاہتی ہے۔ کیا میرے ذریعے سے دوسرے کو فائدہ ملنا ہے۔ کیا کسی ہدف کی تکمیل باقی ہے۔ اسٹریس سے بھاگنے کی بجائے شعوری طور پر اس پر کام کیجیے اور جانچئے کہ جن لوگوں نے اسٹریس کا سامنا کیا تھا، انھوں نے اسے کیسے کامیابی سے ہینڈل کیا۔ سدھارتھا (گوتم بدھ) کے پاس ایک عورت آئی اور کہا کہ میرا جوان بیٹا مر گیا ہے، مجھے بڑی تکلیف ہے۔ کسی طرح میری اس تکلیف کو کم کردو۔ گوتم بدھ نے اسے مٹی کا برتن دیا اور کہا کہ شہر جاؤ اور اس گھر سے دانے لے کر آنا جہاں کبھی موت نہ ہوئی ہو۔ کئی دنوں کے بعد وہ واپس آئی تو برتن خالی تھا۔ اس نے کہا، مجھے ایک بھی گھر ایسا نہیں ملا جہاں موت نہ ہوئی ہو۔ گوتم نے پوچھا، تو پھر تمہاری تکلیف کہاں ہے؟ اس نے کہا، مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ گوتم نے پوچھا، کیوں نہیں ہے؟ عورت نے جواب دیا کہ دوسروں کے دکھ دیکھ کر میرا دکھ ختم ہوگیا۔ کبھی اپنا دکھ بڑا لگے تو اپنے سے بڑے دکھ والے کو دیکھئے۔ اپنا دکھ چھوٹا لگنے لگے گا۔ ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ جایا کیجیے۔ یہ ایمرجنسی بہت کچھ سکھاتی ہے۔ قبرستان بہت کچھ سکھاتا ہے۔ حوالات بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ یہ تمام ذرائع اسٹریس کم کرتے ہیں۔ اگر کسی کی تکلیف آپ کو مزید تکلیف میں مبتلا کردے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ آپ نارمل نہیں ہیں۔ اس کو حل کرنے کیلئے کسی ماہر معالج سے رابطہ کرنے کی ضرورت ہے۔

موٹیویشن اور تحریک

ہر فرد کیلئے موٹیویشن مختلف ہوتی ہے، کیونکہ ہر فرد کا مزاج مختلف ہوتا ہے۔ ان عناصر کو تلاش کیجیے جو آپ کو موٹیویٹ کرتے اور تحریک دیتے ہیں۔ لوگوں کی زندگی میں اسٹریس اس لیے بھی زیادہ ہوتا ہے کہ ان کے پاس وہ ذرائع ہی نہیں ہوتے جن کی وجہ سے موٹیویشن ملتی ہے اور اسٹریس کم ہوتا ہے۔ کوئی ایسا کام تلاش کیجیے جو آپ کیلئے تسکین کا باعث ہو۔ ممکن ہے، آپ دکان چلائیں اور ساتھ ہی کسی کو اچھی بات بھی

بتا دیں۔ آدمی جس کام کیلئے پیدا کیا جاتا ہے، عموماً وہی کام موٹیویشن کا باعث بنتا ہے۔

زندگی میں کچھ لوگ ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو آپ سے بے لوث ہوں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے آپ خود قابل بھروسا انسان بنیں، پھر بھروسے والے لوگ بھی ملنا شروع ہو جائیں گے۔ آدمی اپنے کاروباری لوگوں کو کھلاتا ہے تاکہ کاروبار میں ترقی ہو، لیکن جس سے موٹیویشن ملتی ہے، سکون ملتا ہے، اسے پوچھا ہی نہیں جاتا۔ اگر آپ کو کسی سے موٹیویشن ملتی ہے تو اس کی حفاظت کیجیے اور عزت۔ شعوری طور پر کوشش کر کے موٹیویشن حاصل کیجیے جس کیلئے لیکچرز، سیمینارز، ورکشاپس میں شرکت کیجیے۔ کتابیں پڑھیے۔ بعض اوقات کوئی ویڈیو یا تحریر ایسی ہوتی ہے جو موٹیویشن کا باعث بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے موٹیویشن مانگا کیجیے کہ وہ آپ کو یہ احساس عطا کر دے کہ اس واحد محدود زندگی کو بہترین طریقے سے گزارنے کا غم اور فکر آپ کے اندر پیدا ہو جائے۔

ان واقعات کی فہرست بنایئے جو موٹیویشن کا باعث بنے:

☆ ____________________

☆ ____________________

☆ ____________________

ایسے لوگ بھی ہمارے اردگرد ہوتے ہیں جو موٹیویشن سے محروم کر دیتے ہیں۔ ان سے محتاط رہیے۔ ایسے لوگوں کی فہرست بنایئے اور ان سے حتی المقدور دُور رہنے کی کوشش کیجیے۔ موٹیویشن کے ذریعے اسٹریس کو مینج کیا جاسکتا ہے۔ موٹیویشن کو ایسے بچانا پڑتا ہے جیسے اندھیری رات میں چلتی آندھی کے دوران میں جلتے چراغ کی لَو کو بچایا جائے۔ جو شخص آپ کے اندر مایوسی اور یاسیت پیدا کرے، اس سے بچنے کی کوشش کریں اور اسے پیار یا سختی سے کہہ دیں کہ اس موضوع پر بات نہیں ہو سکتی۔ ساری زندگی ہر ایک سے "ہاں" کہنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ "نہ" کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے زندگی میں انکار کرنا سیکھیے۔

حال سے لطف اٹھایئے

میں عرض کر چکا ہوں کہ عالمی ادارہ صحت کے مطابق، اسٹریس اکیسویں صدی کی وبا ہے۔ تو پھر اس کا حل کیا ہے؟ اس کا حل بھی ماہرین صحت نے دیا ہے، اور آپ کو جان کر حیرانی ہوگی کہ یہ حل دواؤں میں نہیں، ایک فطری طریقہ میں ہے.. مائنڈفلنس۔ اس وقت دنیا بھر میں جتنی زیادہ تحقیقات اور اطلاقات صرف ایک موضوع یعنی مائنڈفلنس پر ہو رہے ہیں، کسی اور موضوع پر نہیں ہو رہے۔ دنیا کی اعلیٰ ترین یونیورسٹیز میں نہ صرف اس پر تحقیقات ہوئی ہیں، بلکہ زندگی کے تمام شعبوں میں اسے داخل کر دیا گیا ہے۔

مائنڈفلنس کیا ہے؟ خود کو ماضی کے غموں اور مستقبل کی تشویشوں سے نکال کر حال میں رہنا۔ یہ آج کے انسان کیلئے بہت ضروری ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہم ماضی کی غلطیوں سے نالاں رہتے ہیں یا مستقبل کی ادھیڑ بن میں دن رات گزار دیتے ہیں اور یوں، اللہ تعالیٰ نے آج کی جو نعمت ہمیں عطا کی ہے، اس کی شکر گزاری نہیں کر پاتے۔ اسٹریس سے بچاؤ کیلئے مائنڈفلنس کی باقاعدہ ٹریننگ کسی ماہر سے لیجیے۔

درج ذیل سوالوں کے جواب تلاش کیجیے:

سوال مجھے کن باتوں پر غصہ آتا ہے؟

جواب

سوال لاشعوری طور پر میں کیا زیادہ سوچتا رہتا ہوں؟

جواب

سوال اپنی ذات کی بہتری کیلئے کوئی کورس کیا ہے؟

جواب

سوال عام طور پر میرے اسٹریس کی وجہ کیا ہوتی ہے؟

جواب

سوال میری ذات کی بہتری میں کس فرد کا کردار سب سے زیادہ ہے؟

جواب

سوال وہ کون سی کتاب ہے جس نے میری زندگی میں اثر ڈالا؟

جواب

سوال میری پانچ انسپاریشن کون سی ہیں؟

جواب

سوال کون سے پانچ لوگ ہیں جو میری کوشش سے زندگی میں داخل ہوئے ہیں؟

جواب

سوال رات کو سونے سے پہلے میں زیادہ تر کیا سوچتا ہوں؟

جواب

سوال صبح اٹھتے وقت میں لاشعوری طور پر کیا سوچتا ہوں؟

جواب

سوال آخری بار تنہائی میں دل سے کب رویا تھا؟

جواب

سوال　میں آخری دفعہ ایسا کون سا بے لوث کام کیا تھا جس کا مجھے کوئی کریڈٹ نہیں ملا تھا؟

جواب

سوال　میں آخری دفعہ وقت کی قید سے کب نکلا تھا؟

جواب

سوال　اپنے سٹریس کے بارے میں میری رائے کیا ہے؟

جواب

سوال　کوئی ایسا شخص جو بہت برا لگتا تھا، لیکن وقت نے ثابت کیا کہ وہ تو قابل رحم تھا؟

جواب

ان سوالوں کے جوابات تلاش کیجیے۔ جب یہ جوابات مل جائیں تو ایک ماہ بعد دوبارہ ان سوالوں کو لکھ کر ان کے جواب دیکھیے۔ اس سے پتا چلے گا کہ کتنی تبدیلی آ رہی ہے۔ اگر اپنی ذات میں بہتری دیکھنی ہے تو پھر ایک سال بعد ان سوالوں کے دوبارہ جواب لکھیں اور جواب دیکھیں۔ غالب امکان ہے کہ وہ مکمل بدل چکے ہوں گے ۔ اگر آپ کے ان سوالوں کے جواب مختلف ہوں تو پھر اس کا مطلب ہے کہ اسٹریس منیج ہونے لگا ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں، "پتھر نہیں بدلتا اس لیے اس کا نصیب نہیں بدلتا۔ صرف انسان بدلتے ہیں، اس لیے بدلنے والا ان کا نصیب بدل دیتا ہے۔"

دن کے کسی حصے میں تنہائی میں بیٹھ کر غوروفکر کیا کیجیے اور دیکھیے کہ کہاں غلطی

ہے۔ اپنے اوپر تھوڑی تنقید بھی کیا کیجیے۔ اگر آپ اپنے پر تنقید نہیں کر سکتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ میں ٹھیک ہوں تو پھر بہتری آنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ تنہائی میں بیٹھ کر غور و خوض کرنے سے ساری پھوں پھاں نکل جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کال کوٹھری کی سزا سب سے سخت سزا ہے، کیونکہ ایسے میں غور و فکر انسان کو عاجز بنا دیتا ہے اور نئی شناخت ملتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکنا سیکھیے۔ انسان اپنی خوشی اور کامیابی کیلئے طرح طرح کی پلاننگ کرتا ہے، لیکن سب سے زیادہ بہتر پلاننگ اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے۔ لہٰذا، خود کو اپنے اللہ کی پلاننگ کے حوالے کر دیجیے۔ آپ کے بہت سے اسٹریس خود ہی ختم ہو جائیں گے۔

اسٹریس سے بچاؤ کے چند عملی مشورے

☆ ۔زندگی کا ہر واقعہ اور سانحہ ایک تجربہ ہے۔ تجربے کا کوئی مول نہیں ہے۔ اپنی زندگی کے ہر تجربے سے سیکھیے۔

☆ ۔جس طرح آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی زندگی میں کوئی دخل اندازی نہ کرے، اسی طرح دوسرے بھی چاہتے ہیں کہ اُن کے معاملات میں دخل اندازی نہ کی جائے۔

☆ ۔کبھی کسی دوسرے کے محتاج نہ بنیں، بلکہ اپنے ٹیلنٹ اور صلاحیتوں پر بھروسا کیجیے جو اللہ نے آپ کو دی ہیں۔

☆ ۔کسی بھی بات کو حتمی نہ سمجھئے۔ تبدیلی کی گنجائش رکھیے۔ آپ جس بات کو درست سمجھ رہے ہیں، اس بات کا پورا امکان ہے کہ وہ ویسی نہ ہو، اس سے یکسر مختلف ہو۔

☆ ۔یہ شعور رکھیے کہ زندگی میں کس کو شامل کرنا ہے اور کس کو نہیں۔ جسے شامل رکھنا ہے تو کتنا۔

☆ ۔صرف اسے ذمے داری سونپئے جو اُس کام کا اہل ہے۔ جو ذمے داری لینا

نہیں چاہتا یا اس کام کا اہل نہیں، آپ کیلئے بلا وجہ اسٹریس کا باعث ہوگا۔

☆۔اپنے اور لوگوں کے درمیان مناسب فاصلہ رکھیے... نہ بہت دور ہوں اور نہ بہت قریب۔

☆۔پیسہ کمانے کے ساتھ ساتھ پیسہ خرچ کرنے کی صلاحیت بھی اپنے اندر پیدا کیجیے۔

☆۔زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھیے، یعنی جن قدرتی اصولوں کے مطابق زندگی گزار کر اسے خوش اور فراواں کیا جا سکتا ہے، اُن اصولوں کو جانیے اور سیکھیے۔

☆۔آپ دوسروں کے بارے میں جیسا چاہتے ہیں، ویسے خود بن جائیے۔ آپ اچھے ہوں گے تو لوگ بھی اچھے ملیں گے۔

☆۔زندگی کو دیکھنے کا موجودہ زاویہ بدلیے۔ کالے رنگ کی عینک سے دنیا کو دیکھیں گے تو پوری دنیا میں تاریکی ہی تاریکی دکھائی دے گی۔ زاویہ نظر کے بدلنے سے چیزیں بدل جاتی ہیں اور اُن کے اثرات بھی بدل جاتے ہیں۔

☆۔یہ بھی یاد رکھیے کہ اسٹریس ہمیشہ برا نہیں ہوتا، بعض اوقات اسٹریس اچھا بھی ہوتا ہے۔ مثبت اسٹریس کا مقصد آپ کو اپنے خطہ آرام سے نکال کر اظہار جرات کے قابل کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اسٹریس کا سوچ کر اسٹریس میں نہ آئیں۔ اس توانائی کو استعمال میں لائیے۔



جذبات کو منظم کیجیے

''اگر آپ کے جذبات آپ کے قابو میں نہیں، اگر آپ کو خود آگہی نہیں، اگر آپ پریشان کن جذبات کو منظم نہیں کر سکتے، اگر آپ کے اندر شفقت نہیں، اگر آپ کے تعلقات استوار نہیں... تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کتنے ذہین ہیں، آپ زیادہ دُور نہیں چل سکیں گے!''

ڈینیل گولمین

جب انسان مختلف لوگوں کو دیکھتا اور اُن سے ملتا ہے تو اس سے اس کی قوت مشاہدہ بڑھتی ہے اور یوں اس کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔ جب آدمی زمانہ طالب علمی سے نکل کر عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے اور چند سال گزارتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ کتاب کا علم تو بڑا محدود ہے۔ اس سے نمبر تو اچھے آجاتے ہیں، لیکن زندگی کے مسائل و معاملات میں اس کا عمل دخل زیادہ نہیں ہے۔ زندگی گزارنے کیلئے کلاس روم کی مشقیں اور لیب کے تجربات سے کہیں زیادہ اہم حقیقی زندگی کے تجربات ہیں۔

علم مختلف ذرائع سے آتا ہے۔ تجربہ ہوتا ہے، تجربے سے رائے بنتی ہے اور وہ رائے غلط بھی ہوسکتی ہے اور درست بھی۔ ایک علم آدمی کے اپنے مشاہدے سے آتا ہے۔ مثال کے طور پر، ایک آدمی لمبے عرصے تک لوگوں کو پڑھاتا ہے تو وہ لوگوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اسے پتا چلتا ہے کہ کس طرح کے لوگ زیادہ کامیاب ہوتے ہیں اور کس طرح کے ناکام ہوتے ہیں۔ یہ تمام علوم زندگی گزارنے میں معاون ہوتے ہیں۔

علم بڑھتا ہے تو انسانی ذہانت بھی بڑھتی ہے۔ دیکھا جائے تو ہم بچے کے اسکول میں داخلے سے لے کر مرتے دم ذہانت بڑھانے کے طریقے جاننے اور انھیں اختیار کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔

انسانی ذہانت: ایک پیچیدہ موضوع

ایک زمانہ تھا کہ ماہرین صرف دو قسم کی ذہنی کیفیت کی بات کرتے تھے: ذہین اور غبی۔ لیکن، سائنسی تحقیقات اور انسانی علوم نے آج یہ بات آشکار کی ہے کہ انسانی ذہانت کا موضوع اتنا سادہ نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا رہا ہے۔

انیس سو تیراسی میں دنیا میں انسانی ذہانت کے حوالے سے ایک نئی تھیوری آئی جسے ''ملٹی پل انٹیلی جنس'' (Multiple intelligence) کا نام دیا گیا۔ یہ تھیوری ہاورڈ گارڈنر نے پیش کی جو ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انسان میں آٹھ طرح کی ذہانتیں پائی جاتی ہیں:

☆ الفاظ کی ذہانت

☆ اعداد کی ذہانت

☆ خاکوں کی ذہانت

☆ جسمانی حرکات کی ذہانت

☆ موسیقی کی ذہانت

☆ لوگوں سے میل جول کی ذہانت

☆ اپنے آپ کو سمجھنے کی ذہانت

☆ فطرت کی ذہانت

انھوں نے پاگل بچوں پر بھی تحقیق کی اور بتایا کہ دنیا اگرچہ انھیں پاگل کہتی ہے، لیکن ان میں کئی طرح کی ذہانتیں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر، ایک پاگل شخص ہے مگر وہ گانا بہت اچھا گا لیتا ہے۔ یہ ذہانت کی ایک قسم ہے جس میں وہ اپنی آواز کے پیچ وخم کو بہت اچھے طریقے سے تبدیل کر لیتا ہے۔

اس تھیوری سے پہلے ایک ہی تھیوری چلی آ رہی تھی کہ ذہانت صرف یادداشت یا آئی کیو کا نام ہے۔آئی کیو جانچنے کیلئے فرد کی عمر پوچھی جاتی ہے۔اگر عمر بائیس برس ہے تو اس کے کچھ ٹیسٹ لیے جاتے ہیں۔ پھر اس سے جو رزلٹ بنتا ہے،اس سے پتا چلتا ہے کہ اس کے ذہن کی عمر اس کی جسمانی عمر سے زیادہ یا کم ہے۔

جذباتی ذہانت

انیس سو چھیانوے میں یونیورسٹی آف میساچوسٹس کے ڈینیل گولمین نے ایک قدم آگے بڑھ کر ذہانت کے بارے میں ایک اور تھیوری پیش کی اور بتایا کہ انسان کی کامیابی اور ناکامی کا بہ راہِ راست تعلق اس کی جذباتی ذہانت (Emotional Intelliegence) سے ہے۔گزشتہ تیس دہائیوں میں کامیابی کے موضوع پر جتنی تحقیق کی گئی ہے،اس کے مطابق کسی فرد کی کامیابی میں آئی کیو کا کردار صرف پندرہ سے بیس فیصد ہوتا ہے جبکہ اسی سے پچاسی فیصد کا انحصار آدمی کی جذباتی ذہانت پر ہوتا ہے۔ کیوں کہ انسان جو کچھ عمل کرتا ہے،اس کا انحصار اس کی اُس وقت کی جذباتی کیفیت پر ہوتا ہے یعنی وہ کیسا محسوس کرر ہا ہے۔

جذباتی ذہانت کا علم ہمیں بتاتا ہے کہ جذبات 27 قسم کے ہوتے ہیں۔ ان ستائیس جذبات میں دو بہت اہم ہیں۔ غصہ اور محبت۔ ایک شخص میں اگر 26 جذبات ہوں،لیکن غصہ نہ ہوتو اس کی شخصیت متاثر ہونا شروع ہو جائے گی۔

جذبات زندگی کا ایندھن ہوتے ہیں۔ جو آدمی جذباتی طور پر ذہین نہیں، وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ وہ خطرے میں ہے اور اس سے بھی زیادہ خطرے میں وہ ہے جو جذبات کو دباتا ہے۔ ہمیں یہی سکھایا جاتا ہے کہ اپنے جذبات کو کنٹرول کریں۔ یہ بات غلط ہے۔ صحیح یہ ہے کہ جذبات کو دبایا نہ جائے ، بلکہ انھیں منظم یا مینج کیا جائے۔ جذبات کو دبانے سے نقصان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر کسی کو دفتر میں ڈانٹ پڑنے پر غصہ آ گیا، مگر اس نے اپنے غصے کو دبا لیا تو وہ غصہ کہیں اور نکلے گا۔ وہ یہ غصہ اپنے گھر والوں پر نکالنے کا باعث بنے گا۔

محبت اور غصہ

نپولین ہل نے اٹھائیس برس تحقیق کے بعد ایک کتاب لکھی، Think and Grow Rich۔ اس کتاب میں وہ کہتا ہے کہ "میں نے دو ہزار سال کی سوانح عمریاں پڑھ کر دیکھی ہیں۔ جتنے بھی کامیاب لوگ ہیں، ان کی کامیابی میں محبت کا نہایت اہم کردار ہے۔" محبت واحد جذبہ ہے جو انسان کو انسانیت کی معراج پر لے جاتا ہے۔ یہ واحد جذبہ ہے جو انسان کو فوکس کرنا سکھاتا ہے۔ یہ اتنا طاقت ور جذبہ ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ پھانسی کو قبول کر لیتے ہیں۔ دنیا میں بڑے بادشاہ اسی جذبے کی وجہ سے فقیر ہوئے۔ امیر لوگوں نے اپنی جاگیریں اس کے پیچھے لٹا دیں۔ کسی نے آئن سٹائن سے پوچھا کہ آپ نے "نظریہ اضافیت" پیش کیا ہے۔ اسے ذرا آسان لفظوں میں سمجھا دیں۔ اس نے جواب دیا کہ انسان اگر کسی خوبصورت لڑکی سے محبت کرتا ہے اور وہ سارا دن اس کے پاس بیٹھا رہے تو شام کو پوچھا جائے کہ کتنا وقت گزرا ہے تو وہ جواب دے گا کہ ابھی تو لمحہ گزرا ہے، لیکن اس کو گرم توے پر بٹھا دیا جائے تو ایک سیکنڈ کے بعد کہے گا کہ ایک صدی گزر گئی۔

بہت کم گانے ایسے ملیں گے جس میں محبت، پیار اور عشق کے الفاظ نہ ہوں۔ وہ گانا گانا ہی نہیں ہے جس میں محبت بھرے الفاظ نہ ہوں، جس میں دکھ درد نہ ہو، جس میں لگن اور کڑھن نہ ہو، جس میں جنون نہ ہو۔ کچھ نہ کچھ تو ایسا ہے کہ جس کی وجہ سے ساری شاعری یہاں سے شروع ہوتی ہے اور یہیں ختم ہوتی ہے۔ زندگی کے ابتدائی بارہ تیرہ برس کی عمر سے اگلے بارہ تیرہ سال تک کی عمر یہ جذبات اپنی انتہا پر ہوتے ہیں۔ محبت میں انسان اپنا وقت دیتا ہے، اہمیت دیتا ہے اور قربانی کیلئے تیار رہتا ہے جس شخص میں یہ تین چیزیں پائی جائیں تو سمجھ لیجیے کہ اسے کسی سے محبت ہے۔ یہی محبت اگر صنف مخالف ہو جائے تو عموماً جوانی کو برباد کر ڈالتی ہے اور یہی محبت اگر کسی عظیم مقصد سے ہو جائے تو زندگی سنور جاتی ہے۔

وقتی محبت کا انجام

میں مجازی محبت کی بات کر رہا ہوں تو یہاں یہ حیران کن حقیقت بھی بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ عموماً جو شادیاں محبت کی بنا پر ہوتی ہیں، وہ شدید جذباتی بھونچال کا شکار ہو جاتی ہیں۔ کیوں؟ دراصل، لڑکا اور لڑکی جس جذبے کی شدت کے باعث آپس میں شادی کرتے ہیں، وہ جذبہ تو وقتی ہوتا ہے اور شادی کے بعد جب ازدواجی زندگی کے مسائل کھڑے ہوتے ہیں، آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا ہے تو دوسرے بہت سے کرخت جذبات اس جذبے پر غالب آ جاتے ہیں۔ یوں، پریم کہانی کچھ ہی عرصہ میں Blame کہانی بن جاتی ہے۔ محبت کی شادی کرنے والے اکثر جوڑے لڑائی جھگڑوں میں پھنس جاتے ہیں۔

محبت ایک توانائی ہے اور اس توانائی کو کام میں لانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے اعلیٰ تر مقصد پر لگا دیا جائے۔ بندہ عشق مجازی سے عشق حقیقی کے قابل ہو جاتا ہے۔ یوں، اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا تعلق بنتا ہے تو اسے صحیح سمت مل جاتی ہے۔ یہ کائنات کا واحد راستہ ہے جس میں کوئی سزا نہیں، جہاں کوئی خطا نہیں ہوتی۔ یہ واحد جذبۂ محبت ہے کہ جس میں انسان کو وہ مزہ آتا ہے کہ جس سے پہلوتہی ممکن نہیں ہوتی۔ ہماری بے شمار طرح کی کوچنگ کا کسی اور جگہ انعام ملنا ہوتا ہے۔ محبت واحد جذبہ ہے کہ اس سے نکلنے کے بعد انعام ملنا شروع ہوتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''غم چھوٹے انسان کو کھا جاتا ہے اور بڑے انسان کو بنا جاتا ہے۔''

غصہ اور مشرقی دانش

بعض لوگ چہرے سے بہت غصیلے لگتے ہیں۔ یہ زیادہ تر وہ لوگ ہوتے ہیں جن میں غصہ پایا جاتا ہے، لیکن انھوں نے غصے کو دبایا ہوتا ہے جس وجہ سے غصے کے اثرات ان کے چہرے پر آ جاتے ہیں۔ جتنا زیادہ غصہ دبایا جائے گا، وہ اتنا ہی شخصیت کو متاثر کرے گا۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''کم ظرف کا غصہ اسے کھا جاتا ہے

اور اعلیٰ ظرف کا غصہ اسے بنا جاتا ہے۔" ایک اور رنگ کہتے ہیں کہ "غصہ ایسا شیر ہے جو تمہارے مستقبل کو بکری بنا کر کھا جاتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی جو خوبیاں بیان کر رہے ہیں، ان میں یہ بھی ہے کہ وہ غصے کو پی جاتے ہیں۔ (سورہ آل عمران، آیت ۱۳۴) غصہ پی جانے کا ہمارے ہاں یہ لیا جاتا ہے کہ اسے دبایا جائے جبکہ عربی کے لفظ "کاظمین" کے ماخذ کی طرف جائیں تو پتا چلتا ہے کہ عرب لوگ بھرے ہوئے کنوئیں کو کاریز کے ذریعے خالی کنوئیں کے ساتھ جوڑتے تھے جس سے خالی کنواں بھی بھر جاتا تھا، یعنی جوڑنے کے عمل کو "کاظمت" کہا جاتا ہے۔ لیکن اُردو میں کاظمت کا کوئی مناسب متبادل نہیں ہے۔ پاکستان میں بلوچستان کے سوا "کاریز" کا رواج نہیں ہے۔ اگر مروجہ لفظ نہ ہو اور نہ کوئی اور لفظ ہو تو پھر قاعدہ یہ ہے کہ جو بھی قریبی لفظ ملے گا، وہ استعمال کیا جائے گا۔ اس لیے کاظمین کے معانی کا اُردو میں جو لفظ ملا وہ "پی جانا" لیا گیا۔ لہٰذا، اس معانی کے ساتھ ہمیں یہ سکھایا گیا کہ جب بھی غصہ آئے تو اسے پی جانا ہے۔ البتہ، مولانا احمد علی لاہوری نے اس کا ترجمہ "جو غصے کو ضبط کرنے والے ہیں" کیا ہے جو انگریزی کے لفظ to manage کے زیادہ قریب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ غصہ پیتے پیتے بوڑھے ہو جاتے ہیں وہ دل کے مریض بن جاتے ہیں۔ ان کے مزاج چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ چھوٹے سے چھوٹے مسئلے کو بڑا مسئلہ بنا دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غصہ نکال دینا بہتر ہے، لیکن رکھنا خوف ناک ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ہاتھ میں انگارے ہوں، وہ کسی کو مارنے ہوں، لیکن ساتھ ہی کہہ دیا جائے کہ انھیں پکڑ کر رکھو۔ اگر ان انگارے دوسروں کو مارے جائیں گے تو جسے مارے جانے ہیں، اس کا شاید تھوڑا ہی نقصان ہو، ہاتھ میں انگارے پکڑے رہنے کے باعث ہاتھ ضرور جل جائیں گے۔

آپ کا ردِ عمل کیسا ہے؟

جذبہ... محبت ہو یا غصہ، منفی ہو یا مثبت... سب سے اہم اس کے بارے میں ہمارا اپنا موقع پر اختیار کیا جانے والا ردعمل ہے۔ یاد رکھیے، زندگی میں آنے والی چیز اہم نہیں ہوتی، جتنا اہم اس کے بارے میں ہمارا ردعمل ہوتا ہے۔ اگر غصے کو کنٹرول کر کے مثبت ردعمل دیا جائے تو اس کے خاطر خواہ نتائج ملتے ہیں۔ غصے کا مثبت ردعمل دینے کیلئے کوئی ایسا کام تلاش کیجیے جس پر غصہ استعمال ہو سکے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ ہی نہیں ہوتا کہ جس پر غصہ منتقل کیا جا سکے۔ پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ الٹا نقصان ہو جاتا ہے۔ عموماً بے مقصد لوگوں کے ساتھ ایسا ہوا کرتا ہے۔ لیکن جس شخص کی زندگی میں کوئی مقصد ہے، وہ اپنے غصے کی توانائی کو مقصد پر لگائے گا۔

انسان دنیا میں اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتا ہے۔ جو آدمی محبت کرتا ہے، لڑتا مشقت کرتا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس میں جذبات پائے جاتے ہیں۔ اب آپ کا کام یہ ہے کہ ان جذبات کو بگٹٹ چھوڑنے کی بجائے ان سے کام لینا سیکھیے۔ جانیے کہ کس جذبے کو کہاں استعمال کرنا بہتر ہے اور کہاں نقصان دہ ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل کا مثبت ردِعمل دینا سیکھیے۔ یوں جذبات فائدہ دینے لگتے ہیں۔ شخصیت میں اعتماد آتا ہے اور زندگی کو مینج کرنا آسان تر ہو جاتا ہے۔



سماجی ذہانت

"سچی ہمدردی صرف یہ نہیں کہ آپ کو دوسروں کے درد کا احساس ہو، بلکہ اس درد کو دُور کرنے کی تدبیر بھی کیجیے!"

ڈینیل گولمین

اس میں دو رائے نہیں کہ انسان اس کائنات کی سب سے ذہین مخلوق ہے۔ انسانی ذہانت پر دنیا میں بے تحاشا تحقیقات ہوئی ہیں۔ آج ہم انسانی ذہانت کے بارے میں تاریخ سے کہیں زیادہ واقف ہیں۔ ہم جذباتی ذہانت کا ذکر کر چکے ہیں اور اب ہم آپ کو انسان کی سماجی ذہانت (سوشل انٹیلی جنس) کے بارے میں بتانا چاہتے ہیں۔

جتنی تحقیقات انسانی مزاج پر ہوئی ہیں، شاید ہی کسی اور چیز پر ہوئی ہوں۔ آج ان تحقیقات کی بدولت ہم جانتے ہیں کہ جینئس یا ذہین کی کئی قسمیں ہیں اور ان میں ایک بڑی ذہانت "سماجی ذہانت" ہے۔ جن لوگوں میں یہ ذہانت پائی جاتی ہے، انھیں دوسروں سے بات چیت کرنا آتا ہے، اٹھنا بیٹھنا آتا ہے اور وہ زیادہ ترقی کرتے ہیں۔ جو لوگ بات چیت نہیں کر سکتے، اپنی بات سمجھا نہیں پاتے اُن میں سماجی ذہانت کم تر ہوتی ہے۔ وہ زیادہ ترقی بھی نہیں کر پاتے۔

سماجی ذہانت اور آپ کا کیریر

معاشرے میں جن لوگوں کا واسطہ دوسرے لوگوں سے زیادہ رہتا ہے، وہ زیادہ سماجی ذہانت رکھتے ہیں۔ جو لوگ دفتر میں ایک ہی میز کرسی پر بیٹھے بیٹھے کام کرتے ہیں، جو ہر وقت کمپیوٹر پر کام کرتے ہیں، فائلیں دیکھتے رہتے ہیں یا جو خاموشی سے اپنا کام

کرتے رہتے ہیں ان میں یہ ذہانت کم ہوتی ہے۔ عام طور پر یہ پہلے سے آدمی میں زیادہ موجود ہوتی ہے، لیکن کچھ لوگوں میں وقت اور حالات و واقعات کے ساتھ بڑھتی اور سامنے آتی ہے۔

آپ کی سماجی ذہانت کا لیول

جو لوگ اپنی ذات کے اندر محدود رہتے ہیں ان میں سماجی ذہانت کم ہوتی ہے لہٰذا ان کیلئے سماج میں گھلنا ملنا، موثر ابلاغ کرنا اور تعلقات بنانا مشکل ہوتا ہے۔ سماجی ذہانت کا کیریر میں کامیابی سے بھی گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ ایسا کیریر جس میں سماجی ذہانت کی زیادہ ضرورت ہو، اور آپ سماجی ذہانت کم رکھتے ہوں تو اس کیریر میں کامیابی کے امکانات کم تر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً، ایک نوجوان ٹرینر بننا چاہتا ہے اور اس میں سماجی ذہانت کی کمی ہے تو اس کیلئے ٹرینر بننا مشکل ہوگا، کیونکہ ٹرینر کا کام ہی لوگوں سے ملنا جلنا اور بولنا ہے۔ اچھے ٹرینر میں جو خوبیاں درکار ہیں، ان کیلئے سماجی ذہانت درکار ہے۔ یہ تمام خوبیاں سوشل جینئس کی علامتیں ہیں۔ جس میں یہ علامتیں نہیں پائی جاتیں، وہ ٹریننگ میں زیادہ آگے نہیں جا سکتا۔

ایسے بے شمار لوگ ہیں جنھیں موقع ہی نہیں ملا ہوتا کہ اُن کی سماجی ذہانت سامنے آئے۔ چنانچہ انھیں جیسے ہی سماجی ذہانت کے اظہار کا موقع ملتا ہے، وہ اپنے جوہر دکھانا شروع کر دیتے ہیں۔ جب آدمی اپنے اردگرد لوگوں کو دیکھتا اور محسوس کرتا ہے کہ وہ بات کرنا جانتے ہیں اور میل جول میں ماہر ہیں تو پھر وہ بھی لاشعوری طور پر ان کے رویوں کو اپنانا شروع کر دیتا ہے۔ اس میں بھی یہ ذہانت پیدا ہونے لگتی ہے۔

لیڈرز کا لازمی وصف

کچھ لوگ اپنے آپ کو بہت جلد تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ لیڈ کرنا شروع کر دیتے ہیں، کسی فیکٹری میں ہوں تو یونین بنا لیتے ہیں، سیاست میں آجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی سماجی ذہانت پہلے سوئی ہوتی ہے اور جب جاگتی ہے تو اس کے اثرات ظاہر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کو اپنے ساتھ ملا کر ادارہ کھڑا

کرنے یا تحریک شروع کرنے میں جواب نہیں رکھتے۔ عموماً کاروباری افراد میں سماجی ذہانت کی فراوانی ہوتی ہے۔ وکالت کے پیشے سے منسلک لوگ بہت سماجی ذہین ہوتے ہیں۔ ٹیچرز میں سوشل جینئس ہوتی ہے۔ جن لوگوں کا تعلق سیل یعنی خرید وفروخت سے ہوتا ہے، وہ بھی بہت سوشل جینئس ہوتے ہیں۔ وہ لوگ جنھیں اپنی بات منوانی آتی ہے اور اپنی موثر گفتگو کے ذریعے اپنا کاروبار خوب چلاتے ہیں، سماجی ذہین ہوتے ہیں۔ بنیادی طور پر سماجی ذہانت لیڈرشپ کی خوبی ہے۔ جو لوگ لیڈ کرنا چاہتے ہیں، اُن کیلئے اس ذہانت کا حصول بہت ضروری ہے۔

ہر شعبے میں بہت کامیاب، اوسط اور ناکام لوگ ہوتے ہیں۔ دنیا کے جتنے بڑے لیڈرز ہیں ان کے اندر سماجی ذہانت بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ مارٹن لوتھر کنگ کو پڑھ لیجیے یا تاریخ کے کسی دوسرے لیڈر کی زندگی کا مطالعہ کیجیے، آپ دیکھیں گے کہ انھیں بات کرنی آتی تھی، ان کو بات سمجھانی آتی تھی۔ جتنا بڑا لیڈر ہوتا ہے، اس کی سماجی ذہانت کی سطح اتنی زیادہ ہوتی ہے۔ خاندان کے وہ لوگ جن کے بغیر فیصلے نہیں ہوتے، جن کے ساتھ چل کر سارے خوش رہتے ہیں، جن کی ہاں سب کی ہاں ہوتی ہے، وہ سوشل جینئس ہوتے ہیں۔ معاشرے میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو تنازعات کو چٹکیوں میں حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسے افراد بھی سماجی سطح پر بلا کے ذہین ہوتے ہیں۔

سماجی ذہانت سیکھنے کی چیز ہے

ہم سب کو سماجی ذہانت سیکھنا چاہیے، کیوں کہ یہ بنیادی انسانی ذہانت ہے۔ معروف مصنف ڈیل کارنیگی نے اس شعبے پر بہت کام کیا ہے۔ اس کی کتابیں بازار سے مل جاتی ہیں۔ انھیں پڑھیے۔ اکیسویں صدی کے مزاج اور ضروریات کے مطابق اس موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور کورسز کرائے جاتے ہیں۔ اپنی سماجی ذہانت بڑھانے کیلئے ان کتابوں کا مطالعہ اور کورسز میں شرکت بہت ہی مفید ہے۔ ان کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ سماج میں کیسے کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے، معاملے کو کیسے

بہتر کیا جا سکتا ہے، تعلق کو کیسے نباہا جا سکتا ہے۔ کام کو انجام تک پہنچانے کیلئے لوگوں کا ساتھ درکار ہوتا ہے، یہ تعاون کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

سماجی ذہانت سیکھی جا سکتی ہے، اسے پیدا کیا جا سکتا ہے اور اس کو بہتر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم، سب سے پہلے یہ سمجھ لیجیے کہ آپ کیلئے اس دنیا میں انسانوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے واسطے سماجی ذہانت کا حصول کتنا ضروری ہے۔ جب کسی شے کا فائدہ مستحضر ہو تو اس پر محنت کرنا، وقت صرف کرنا اور پیسہ اور توانائی کی سرمایہ کاری کرنا آسان بھی ہوتا ہے اور پُر لطف بھی۔



اب تو جاگ

"انسانی روح کا جو پہلو.. رحمانی یا شیطانی.. جاگتا ہے، انسان اسی کے مطابق زندگی میں چیزوں کا انتخاب کرتا ہے!"

رومی

ایک شخص نہایت سادہ اور ایمان دار تھا۔ اس نے دینی تعلیم کی اور پھر کسی دوسرے گاؤں میں مسجد کا خطیب لگ گیا۔ اسی گاؤں کی ایک عورت سے اسے محبت ہوگئی۔ وہ محبت پروان نہ چڑھ سکی۔ عورت کی شادی کسی اور جگہ ہوگئی۔ اس شخص کو جدائی کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن اس جدائی نے اس کا رُخ مجاز سے حقیقت کی طرف موڑ دیا۔ جب وہ واپس اپنے علاقے کی طرف پلٹا تو اس کے پاس نسخہ کیمیا آچکا تھا۔ دنیا کے جس شخص کے بھی پاس وہ نسخہ کیمیا آجاتا ہے، پھر اس کا کام چاہے گانا ہو، پینٹنگ ہو، شاعری ہو، خطابت ہو، لکھنا ہو، بولنا ہو یا دنیا کا کوئی اور میدان، وہ بہترین نتائج دینے لگتا ہے۔ اس کے پاس یہ ہنر تھا کہ اس کے پاس شاعری تھی۔ جدائی نے اسے پنجابی شاعری کا شیکسپیئر بنادیا۔ پھر اس نے اتنا شان دار کلام لکھا کہ چھیالیس زبانوں میں اس کلام کا ترجمہ ہوا۔ ہم انھیں حضرت وارث شاہؒ کے نام سے جانتے ہیں۔

حال سے بے حال

کسی بھی بڑے انسان کی زندگی کو دیکھ لیجیے، اس کی زندگی میں ایک وقت ایسا ضرور آیا ہے کہ اس کی اپنے اصل سے ملاقات ہوگئی۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ "انسان کی دو پیدائشیں ہیں۔ ایک جب وہ اس دنیا میں آتا ہے، دوسرا جب اس کی

اپنے آپ سے ملاقات ہوتی ہے۔'' انسان کو اپنے آپ سے ملاقات کیلئے لمبا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔ ایک وہ سفر ہوتا ہے جسے کلومیٹر میں ناپا جاتا ہے، اور ایک سفر انسان کے اندر کا سفر ہوتا ہے۔ اس سفر میں انسان کی چلتے چلتے اپنے آپ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔

روحانی بیداری

بیداری صرف یہ نہیں کہ صبح اٹھ کر نماز ادا کر لی جائے۔ یہ تو انسان کا فطری تقاضا ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ نیند پوری ہونے کے بعد جاگ جاتا ہے۔ اصل بیداری یہ ہے کہ بندہ اپنے آپ سے آشنا ہو جائے۔ اس بیداری کے متعلق حضرت بابا بلھے شاہؒ فرماتے ہیں کہ ''فیر نئی ہوسن آون تیرا...اب تو جاگ مسافر پیارے'' زندگی گزر رہی ہے۔ یہ ختم ہونے کو ہے۔ اس سے پہلے کہ یہ ختم ہو جائے، اگر تو بیدار ہوئے بغیر چلا گیا تو پھر تو نے دنیا میں آنے کا حق ادا نہیں کیا۔ بسا اوقات انسان سے اعلیٰ کام چڑیا کرتی ہے۔ وہ دانے کھاتی ہے، لیکن سارے دانے ہضم نہیں کرتی۔ کچھ بچا کر فضلے کی صورت میں زمین پر پھینک دیتی ہے جس سے اعلیٰ شان دار درخت تیار ہوتا ہے۔

ایک شخص اپنے کاروبار میں مصروف تھا۔ بھیک مانگنے والا آیا اور بھیک مانگی۔ اس نے کہا، تھوڑی دیر انتظار کرو۔ انتظار لمبا ہو گیا تو فقیر نے کہا، دینا کچھ نہیں ہے؟ اس نے کہا، باباجی انتظار کرو، میرے پاس وقت نہیں ہے۔ فقیر نے کہا، کیا تمہارے پاس مرنے کا وقت بھی نہیں ہے۔ اس شخص نے کہا، باباجی کیا آپ کے پاس ہے؟ فقیر نے کہا، میرے پاس تو وقت ہی وقت ہے۔ میں تو پہلے سے ہی تیار بیٹھا ہوں۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اس شخص نے کہا، میں سمجھا نہیں۔ فقیر نے کہا، میں جانے لگا ہوں۔ اس نے اس شخص کو السلام علیکم کہا، لیٹا اور فوت ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اس شخص نے اپنا کاروبار چھوڑ دیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس دکان دار کو اس واقعے نے بیدار کر دیا اور اسی بیداری نے اسے حضرت فرید الدین عطارؒ بنا دیا۔

تاریخ کے ایک بہت بڑے استاد کے مدرسے میں کتابیں لکھی جاتی تھیں۔ وہ

استاد اپنی لکھی ہوئی کتابوں سے روزانہ درس دیا کرتے تھے۔ ایک دن ایک فقیر آیا اور پوچھا، کیا پڑھا رہے ہیں؟ استاد نے جواب دیا، بابا جی، یہ آپ کے کام کی باتیں نہیں ہیں۔ فقیر نے غصے میں آ کر کتابوں کو تالاب میں گرا دیا۔ استاد نے کہا، آپ نے میری زندگی کی محنت غارت کر دی۔ فقیر نے کہا، روتا کیوں ہے۔ انھوں نے تالاب میں ہاتھ ڈالا اور کتابیں جھاڑ جھاڑ کر نکالنی شروع کر دیں۔ استاد نے کہا، بابا جی، یہ کیا ہے؟ فقیر نے کہا، یہ باتیں تمہارے کام کی نہیں ہیں۔ تمہارا کام صرف پڑھانا ہے۔ فقیر کا یہ کہنا تھا کہ استاد کی اپنے آپ سے ملاقات ہو گئی۔ اسی ملاقات نے انھیں حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ بنا دیا۔ مولانا رومی نے اس بیداری کے بعد اپنا مدرسہ چھوڑ دیا اور فقیر کو تلاش کرنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ فقیر کی تلاش میں تین سال لگ گئے۔ جب فقیر ملا تو آپؒ اس کے قدموں میں گر گئے اور کہا کہ مجھے آپ کو تلاش کرتے ہوئے تین سال لگ گئے۔ فقیر نے گلے لگا کر کہا، بیٹا تجھے تین سال لگے ہیں اور مجھے تمہیں تلاش کرنے میں تیس سال لگ گئے۔

بے خبر دنیا

یہ خبر کسی کو نہیں ہے کہ کب قدرت کسی وارث شاہ کو مجاز سے بیداری عطا کر دے۔ کس کو خبر ہے کہ کسی کی موت بیداری پیدا کر دے۔ کس کو خبر ہے کہ زندگی میں آنے والا سانحہ بعد کی زندگی کا شکریہ بن جائے۔ قدرت چھوٹے چھوٹے واقعات سے بیداری دیتی ہے۔ بڑے لوگ ایسے بھی ہیں جنھیں جیل کی سزا ہوئی اور انھیں خود شناسی مل گئی۔ اللہ تعالیٰ نے جب بھی کسی کو بیدار کرنا ہوتا ہے تو اُس کے پاس اس عطا کے سو بہانے ہوتے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی بہانے آدمی کو بیدار کر دیتا ہے۔

ایک درویش روز دریائے راوی کے کنارے کھڑے ہو کر قرآن پاک ختم کیا کرتے تھے۔ بادشاہ وقت کو تمنا ہوئی کہ اس درویش سے ملا جائے۔ اس نے پیغام بھیجوایا۔ درویش نے کہا، اگر بادشاہ کو ملنے کی تمنا ہے تو وہ دریا کے کنارے پر پالکی پھینک دے، میں اس پالکی پر بیٹھ کر اوپر آ جاؤں گا۔ اس وقت دریائے راوی شاہی قلعہ

لاہور کے ساتھ بہتا تھا۔ بادشاہ نے شاہی قلعہ سے پالکی پھینک دی اور انتظار کرنے لگا۔ درویش پالکی میں بیٹھ گیا اور اوپر آ گیا۔ جب وہ اوپر آیا تو بادشاہ نے ہاتھ باندھ لیے اور درخواست کی کہ مجھے بتائیں کہ آپ اللہ تعالیٰ تک کیسے پہنچے۔ انھوں نے کہا، یہ جواب میں پہلے دے چکا ہوں۔ بادشاہ نے حیران ہوا اور پوچھا کہ آپ نے کب اس سوال کا جواب دیا؟ درویش نے کہا، جواب یہ تھا کہ جیسے ہی تو نے پالکی کو اوپر کی طرف کھینچا تو اسی طرح اللہ تعالیٰ نے میرے دل کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا۔ بیداری کا کمال یہ ہے کہ قدرت جب بیدار کرنا چاہتی ہے تو وہ ایسی مہربانی کرتی ہے کہ بندے کی اپنے چہرے سے شناسائی ہو جاتی ہے۔

غم تو میٹھا خوان ہیں

لوگوں کی بہت بڑی تعداد دُنیا سے شناسا ہے، لیکن اپنی ذات سے شناسا نہیں ہے۔ انھوں نے کبھی ایک لمحہ بھی اپنے ساتھ نہیں گزارا۔ انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں ہوتا کہ میرا اصل کیا ہے اور میری پہچان کیا ہے۔ ہم لوگ اپنے غم کو ضائع کر دیتے ہیں، حالانکہ قدرت نے ہمارے لیے میٹھا خوان بھیجا ہوتا ہے۔ ہم اس خوان سے فیض یاب ہی نہیں ہوتے۔ کچھ واقعات ہماری ذات کو پختہ کرنے کیلئے ہوتے ہیں، لیکن ہم انھیں ضائع کر دیتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہمیں اس کے ضائع ہونے کا بھی پتا نہیں چلتا۔ جب آدمی خود کو تلاش کرنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے تو پھر آنے والا ہر واقعہ اسے نکھارتا ہے۔

جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی ہے، اس کی ضروریات بھی بدلتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پہ، ایک عمر میں کھلونے انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہوتے ہیں، کیونکہ اسے اتنا ہی شعور ہوتا ہے۔ یہی شعور جب ترقی کرتا ہے تو یہ سوال اٹھنا شروع ہو جاتے ہیں کہ مجھے دنیا کے نئے رنگ دیکھنے اور نئے ذائقے چکھنے ہیں۔ وہ ان رنگوں دیکھتا اور ذائقوں کو چکھتا ہے۔

لیکن جب یہ رنگ اس کیلئے بے لذت اور بے معنی ہو جائیں تو اس کے بعد اگلی

اسٹیج آتی ہے۔ پھر وہ سوال کرتا ہے کہ میں کون ہوں اور مجھے جانا کدھر ہے۔ یہ شعور کی انتہا ہے۔ یہ شخصیت کی پختگی کی علامت ہے۔ آدمی میں جب بیداری آتی ہے تو اندر اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ قدرت کے فیصلوں پر شاکر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ ایسی صورت میں جب آدمی کے دل میں خیال آتا ہے کہ میرا اللہ تعالیٰ سے رابطہ ہونا چاہیے تو اس وقت اس کو ہر قدم اطمینان ہوتا ہے۔ اس کا ایک ایک قدم اسے بتاتا ہے کہ مجھ پر میرے اللہ کا کرم ہو گیا ہے۔ اگر آپ کا راستہ اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے تو پھر وہ آپ کو راستہ دکھانے کا بندوبست کرتا ہے۔

ذرا اس مقام پر جا کر سوچیے کہ گلیوں کے لڑکے پتھر مار رہے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مبارک لہولہان ہے۔ آپ بستی سے باہر نکلتے ہیں تو جنوں کی جماعت آتی ہے اور عرض کرتی ہے کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام سنا ہے۔ اس سے اعلیٰ اور خوب صورت کلام سنا ہی نہیں۔ کیا یہ صبر اور استقلال اللہ کے فضل اور خودشناسی کے بغیر ممکن ہے؟ نہیں، قطعاً ممکن نہیں!

اللہ کے راستے کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے کہ آنکھ نم رہتی ہے۔ سخت دل لوگ اللہ تعالیٰ کے راستے پر نہیں ہوتے۔ بابا جی اشفاق احمدؒ فرماتے ہیں، ''درد، وہ نہیں ہے کہ چوٹ لگے اور خود کو محسوس ہو، بلکہ درد وہ ہے کہ درد کسی کو ہو رہا ہو لیکن محسوس آپ کو ہو رہا ہو۔''

چالیس سال، فصل کی تیاری میں

دنیا کے زیادہ تر عظیم افراد دیکھا یہ گیا ہے کہ اوسطاً چالیس سال کی عمر کے بعد غیر معمولی ہوئے ہیں۔ چالیس سال کے بعد اس لیے نام بنتا ہے کہ چالیس سال تک اپنے آپ کو فتح ہی نہیں کیا گیا ہوتا۔ اس سے پہلے تو زمین ہموار ہوتی ہے، بیج ڈالا جاتا ہے، شخصیت کو سینچا جاتا ہے اور کہیں چالیس برس کی عمر میں وہ پھل دیتا ہے جب دنیا کہتی ہے کہ واہ، وہ رہا کامیاب آدمی، عظیم انسان۔

اونچا وہ نہیں ہوتا جو خود اونچا ہوتا ہے، بلکہ اونچا وہ ہوتا ہے جو دوسرے کو اونچا

کر کے خوش ہو۔ اگر آپ کے دماغ کے کسی نہاں گوشے میں یہ خیال موجود ہے کہ میرے پاس بہت علم ہے، دوسروں کے پاس نہیں ہے تو پھر آپ کی روحانیت پر سوال ہے، کیونکہ یہ مالک کا کرم ہوتا ہے کہ کسی کو زیادہ نواز دے اور کسی کو کم۔ اگر انسان اپنی اوقات دیکھے تو اس کی کوئی اوقات نہیں ہے۔ یہ اس کا کرم ہوتا ہے کہ کسی کی محنت سے پھل میں ذائقہ آجاتا ہے۔

خلوت کی عادت ڈالیے

خلوت یعنی تنہائی ایسا ذریعہ ہے جس میں انسان اپنے آپ سے آشنا ہوتا ہے۔ اپنی ذات اس وقت نکھر کر سامنے آتی ہے کہ جب آدمی تنہا ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں تنہائی میں غور وفکر کرنا سکھایا ہی نہیں ہوتا۔ ہماری خوبی یہ تصور کی جاتی ہے کہ ہم لوگوں سے گھل مل کر جئیں۔ لہٰذا، ہم تنہائی میں اپنا اپریشن کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ ہم اگر تنہا ہوتے بھی ہیں تو یہ پلان کر رہے ہوتے ہیں کہ فلاں کو کس طرح نقصان پہنچانا ہے، فلاں سے کیوں کر آگے نکلا جاسکتا ہے، وغیرہ۔ لیکن، تنہائی دوسروں کو کریدنے کیلئے نہیں، اپنا پوسٹ مارٹم کرنے کیلئے استعمال کیجیے۔ تنہائی دنیا کا واحد مدرسہ ہے جہاں آپ کو اپنی شناسائی ہوتی ہے، جہاں اپنی قربت ملتی ہے اور آدمی اپنی ذات کو سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔ کیا کسی نے خوب کہا کہ "اب تو جاگ مسافر پیارے... فیر نئی ہوی آون تیرا۔"

شعور کے بغیر کچھ نہیں ملتا

جب تک یہ شعور نہ ہو کہ مجھے اس دنیا میں کیا چاہیے، کہاں سے ملے گا اور کیسے ملے گا، اس وقت تک استقامت بہت مشکل ہے۔ یہ نہ ہو تو پورا بازار چھان مارا جاتا ہے۔ گھوم پھر کر آخر میں ایک دکان سے چیز لی جاتی ہے اور تب بھی یقین نہیں ہوتا کہ آیا یہ سودا ٹھیک ہے یا نہیں... اس لیے کہ ہمیں یہ پتا ہی نہیں ہوتا کہ زندگی میں میری اصل ضرورت کیا ہے۔ دنیا کے درباروں پر اس لیے رکتے ہیں کہ ہم نے اللہ کا دربار کبھی کھٹکھٹایا ہی نہیں ہوتا۔ ہم کبھی سچے دل سے اس چوکھٹ پر گئے ہی نہیں ہوتے۔ پوری

دنیا تلاش کر لیجیے، اللہ تعالیٰ کے در سے بہتر کوئی دربار نہیں ملے گا۔ جس دن یہ پتا چل گیا کہ سب سے اچھا دربار اللہ تعالیٰ کا دربار ہے تو پھر استقامت خود بہ خود آ جائے گی۔ حضرت امام زین العابدینؒ فرماتے ہیں، ''اے میرے مالک، اگر تو مجھے اپنے دربار سے نکال دے تو پھر بتا کہ وہ کون سا دربار ہے جو مجھے بٹھائے گا؛ اگر تو نکال دے گا تو کچھ نہیں بچے گا۔''

استقامت چاہے دنیا کے معاملات میں ہو یا دین کے معاملات میں، ہمیشہ کلیرٹی (Clarity) پر ہوتی ہے۔ کلیر ہونے کا مطلب ہے کہ میرا اس ذات کے سوا کچھ اور تعلق نہیں۔ جب یہ یقین ہو جائے کہ میرا تعلق صرف اسی سے ہے تو پھر وہ بھی آپ کو نہیں چھوڑتا۔

ایک بندہ دعا مانگ رہا تھا فرشتہ پاس سے گزرا اس نے کہا کہ میں اللہ تعالیٰ کا فرشتہ ہوں مجھے بتایئے کہ آپ کو کیا چاہیے بندے نے فرشتے کے سامنے ایک فہرست بیان کی۔ فہرست سننے کے بعد فرشتے نے کہا، رہنے دے، میں سمجھ گیا ہوں۔ اس کو جا کر میں بتا دوں گا کہ تیرا بندہ تیرے سوا ہر شے مانگ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کیجیے کہ اے میرے مالک، وہ تمام چیزیں اور واقعات عطا کر دے جو تیرے قریب کر دیں۔

آپ کیا چاہتے ہیں

اگر آپ کی تلاش کا مقصد اللہ کو پانا ہے تو پھر ہر چیز اللہ تعالیٰ کی طرف لے جائے گی۔ وہی جگہ جو کسی کو نماز کا ثواب اور بندگی دے رہی ہے، وہی جگہ کسی کو جوتیوں کا نیا جوڑا دے رہی ہوتی ہے۔ آپ جو چاہتے ہیں، وہی آپ کو ملے گا۔ حدیث کا مفہوم ہے کہ ''ہدایت اس کا خزانہ ہے۔'' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں ہدایت اس کو ضرور دیتا ہوں جو اندر سے ہدایت طلب کرتا ہے۔ اگر آپ سچے دل سے ہدایت طلب کرتے ہیں تو پھر وہ ضرور نواز ے گا۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''حضرت داتا علی ہجویری کے عرس پر جا کر میں نے پوچھا، آج تو بڑا میلہ لگا ہوا ہے۔ آواز آئی کہ وہ سارے

بھائی کی مٹھائی کھا کر واپس چلے گئے۔ میرے پاس تو کوئی آیا ہی نہیں۔ پوچھا، کیوں نہیں آیا؟ جواب ملا، اگر کپڑے کی دکان پر جا کر لوہا مانگو تو نہیں ملے گا۔ اسی طرح ہم اللہ والے کے پاس ہم اپنا کام کرانے جاتے ہیں، ہمیں اللہ نہیں چاہیے ہوتا۔ ہمیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق نہیں ہوتا، ہمارا تو کوئی کام پھنسا ہوتا ہے وہ نکلوانا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے یہ دعا ضرور کیا کیجیے کہ اے اللہ پاک، ہمیں مجبور ہونے سے بچا کیونکہ جیسے مردار پر گدھ ٹوٹتے ہیں، اسی طرح مجبور شخص بھی کسی جھوٹے پیر کیلئے آئیڈیل ہوتا ہے اور اس مجبوری کے باعث وہ ایسے راستے پر چل پڑتا ہے کہ جس میں ماسوائے گمراہی کے کچھ نہیں ملتا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ فقر (غربت، مجبوری، پریشانی) آدمی کو کفر تک پہنچا دیتی ہے۔ بتوں کے راستے پر اللہ نہیں ملتا، اللہ صرف اللہ والوں کے راستے پر ملتا ہے۔

اللھم انی اسئلک العفو والعافیہ

بیداری کا بہترین معیار

بیداری کا بہترین معیار ہمیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا ہے کہ "دوسروں کیلئے بھی وہی چاہو، جو تم اپنے لیے چاہتے ہو۔" یہ چھوٹا سا جملہ اپنے اندر بہت گہرائی رکھتا ہے۔ یہ بہت مشکل کام ہے۔ کیا آپ نے کبھی اپنے ملازم کیلئے عید پر اپنے ہی معیار اور قیمت کا اعلیٰ جوڑا خریدا؟ کیا کبھی یہ چاہا کہ آپ اپنے گھر والوں کے ساتھ جیسا کھانا کھاتے ہیں، ویسا ہی کھانا آپ کا غریب پڑوسی کھائے؟ کبھی کوشش کی کہ آپ کے بچے جس اسکول یا یونیورسٹی میں ٹھاٹ سے تعلیم حاصل کرتے ہیں، ویسی ہی تعلیم کچرا چننے والا بچہ بھی حاصل کرنے کے قابل ہو جائے جو آج فٹ پاتھ کنارے بیٹھ کر باسی روٹی پانی میں بھگو کر کھاتا ہے۔ آپ کو یقیناً رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت محبت ہے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت کو اپنے سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ کیا کبھی اس معیار پر بھی سوچنے کی زحمت گوارا کی؟ کیا کبھی اس سنت پر بھی عمل کی کوشش کی کہ "جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، وہی دوسروں کیلئے بھی پسند کرو"؟

ہم لمبا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چلے کاٹنا چاہتے ہیں۔ ہم دھمال ڈالنا چاہتے ہیں۔ ہم کوسوں کا سفر کرتے ہیں۔ جبکہ اصل بیداری یہ ہے کہ آپ سچے دل سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس معیار کو اپنی زندگی کا معیار بنا لیجیے کہ "جو اپنے لیے پسند کرتے ہو، وہی دوسروں کیلئے بھی پسند کرو"۔ پھر فقیری بھی آپ کی، درویشی بھی آپ کی، دنیا بھی آپ کی، آخرت بھی آپ کی۔

یہی حقیقی بیداری ہے... اب تو جاگ جا!



پردیسی

''میں زندہ رہنا چاہتا ہوں، تمام عمر پردیسی کی طرح اجنبی رہنا نہیں چاہتا!''

جان ماہونی

ہجرت کے دو بڑے اسباب ہوتے ہیں: ایک اپنی بقا اور دوسرا من پسند زندگی۔ ہمارے ہاں لوگوں کی اکثریت جو ہجرت کرتی ہے اس کا تعلق محنت مزدوری سے ہوتا ہے، یعنی ہم اسے دوسری قسم کی ہجرت میں شامل کر سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں خوداعتمادی کی کمی ہوتی ہے۔ انھیں لگتا ہے کہ شاید ہم وہاں جائیں گے تو کامیاب ہوجائیں گے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ انسان جہاں بھی چلا جائے، لیکن اپنا نصیب ساتھ لے کر جاتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ علاقہ بدل جائے تو نصیب بدل جائے۔ بس، ایک فرق ضرور ہوتا ہے کہ جو آدمی یہاں اپنے دیس میں رہ کر کچھ نہیں کرتا، باہر جا کر وہی آدمی کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہاں سے جانے والے باہر جا کر وہ تمام کام کرنا شروع کر دیتے ہیں جو یہاں رہ کر کسی قیمت کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

آدمی جب ملک سے باہر جاتا ہے تو پیسہ تو مل جاتا ہے، لیکن وہ اپنی زندگی کی سب سے قیمتی شے جو والدین اور پیاروں کی صورت میں ہوتے ہیں، انھیں گنوا دیتا ہے۔ اس سے شخصیت میں خلا پیدا ہوجاتا ہے۔

ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ جیسے انسانی زندگی کی بقا کیلئے آکسیجن بہت ضروری ہے، اسی طرح زندگی میں خوشی اور راحت کیلئے اپنوں کا ساتھ بھی بنیادی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنی ماں کی محبت چاہیے، ہمیں اپنے باپ کی شفقت چاہیے، ہمیں بھائی کا ساتھ اور بہن

کی رحمت چاہیے۔ باہر جانے والے ان تمام چیزوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔

پیسے کیلئے پیاروں کی قربانی عقل مندی نہیں

برصغیر کے لوگوں میں ایک عادت یہ بھی پائی جاتی ہے کہ وہ اپنے عزیزوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ برصغیر کے باسی سوشل بہت ہوتے ہیں۔ یہ بہت ہی مثبت عادت ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جو آدمی یہاں رہ کر کام نہیں کرنا چاہتا، وہ پردیس جا کر اپنے سوشل سرکل سے باہر نکل جاتا ہے اور وہاں جا کر ہر قسم کا کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ یہ ایک شدید ظلم ہے جو وہ اپنے ساتھ کرتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی شخص کو روز یہ باتیں سننے کو ملیں کہ تم پڑھتے نہیں ہو، تم کام نہیں کرتے...تو اس طرح کی باتوں سے بچنے کیلئے وہ تعلیمی ویزے کا سہارا لے کر باہر چلا جاتا ہے۔ لیکن وہاں جا کر پتا چلتا ہے کہ زندگی کتنی تلخ ہے۔ وہاں روبوٹ کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ جو لوگ تعلیم کی غرض سے باہر جاتے ہیں وہ وہاں پر تعلیم بھی حاصل کرتے ہیں اور ساتھ کام بھی کرتے ہیں تاکہ معاشی بوجھ کو ہلکا کیا جاسکے۔ پھر اکثر کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ معاش کے دھندے میں ایسے پھنستے ہیں کہ تعلیم ادھوری رہ جاتی ہے۔

دیہاڑی والی سوچ

مزدوری (لیبر) کوئی ہنر نہیں ہے۔ مزدوری کی غرض سے باہر جانے والے جب برسوں بعد واپس لوٹتے ہیں، وہ تب بھی مزدور ہی رہتے ہیں۔ قیصر عباس صاحب کہتے ہیں کہ جس آدمی کی سوچ دیہاڑی والی ہوتی ہے، وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دیہاڑی والے کا ویژن صرف ایک دن کا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھ صرف ایک دن کو دیکھتی ہے۔ اس کی آنکھ یہ دیکھتی ہے کہ بس، آج کی روٹی پوری ہو جائے۔ اس کی آنکھ یہ دیکھتی ہے کہ بس شادی ہو جائے۔

اگر ترقی کرنی ہے تو پھر اپنے اندر سے دیہاڑی والا مزاج اور ویژن ختم کرنا ہوگا۔ یہ مزاج ختم کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ اپنی زندگی پر سرمایہ کاری (انوسٹمنٹ) کی جائے۔ سرمایہ کاری کا نتیجہ فوری نہیں آتا۔ بعض لوگ ایسا کام کرتے ہیں کہ انھیں پتا ہوتا

یہ کری کر کے وہ بڑا انسان بن جاتا ہے۔ یہ لوگ فوری نتیجے کے پیچھے نہیں بھاگتے، بلکہ دیرپا نتائج کیلئے سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ انھیں اپنے کام اور اس کے نتیجے پر یقین ہوتا ہے۔

سرمایہ کاری کیجئے

سرمایہ کاری میں ذہانت کی انتہا یہ ہے کہ ہاتھ میں کچھ نہ ہو، لیکن یقین یہ ہو کہ ضرور وہ ملے گا جو میں چاہتا ہوں۔ حسرت ناک انسان ہے وہ جو آج ہی حاصل کرنا چاہتا ہے اور آج میں صرف دیہاڑی ملتی ہے۔ مزدور کو دیہاڑی تو مل جاتی ہے، لیکن اس میں کوئی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس کی شخصیت میں کوئی بہتری نہیں آتی۔ اس کے اندر کوئی نئی سوچ نہیں آتی۔ اس کے اندر نیا مزاج نہیں آتا۔ پروگریسو رویہ ختم ہو جاتا ہے جو انسان کی بہت بڑی صفت ہے۔ جب یہ چیزیں کسی کے اندر نہ ہوں تو پھر وہ کولھو کے بیل کی طرح مشقت میں لگا رہتا ہے اور شام کو وہیں پہنچتا ہے جہاں سے صبح کام شروع کیا تھا۔ انسانی زندگی کا یہ بہت بڑا المیہ ہے۔

شادی کے بعد ایک اور ظلم

ایک المیہ یہ ہے کہ بیٹا کمانے کیلئے باہر گیا۔ دو سال بعد اس کی واپسی ہوئی تو شادی کر دی گئی۔ ایک مہینہ اس نے بیوی اور والدین کے ساتھ گزارا، چھٹی ختم ہوئی تو ولایت کو واپس ہوا۔ شادی کے بعد سب سے بڑا ظلم یہ ہوتا ہے کہ اس کے بیوی بھی اس سے بچھڑ جاتی ہے۔ بچے ہوں تو وہ بھی اپنے باپ کی محبت اور تربیت سے محروم رہتے ہیں۔ ذرا تصور کیجیے اس خاندان کی محرومی کا کہ جہاں بوڑھے والدین اپنے جوان بیٹے سے محروم، بیوی اپنے خاوند سے محروم، بچے اپنے باپ سے محروم۔ کئی برس گزارنے کے بعد جب مرد کسی کمائی کے قابل نہیں رہتا تو سفید بالوں کے ساتھ گھر واپس لوٹتا ہے۔ اب وہ بیوی کے قابل ہوتا ہے اور نہ بچوں کے۔

انسان کو یادوں سے محبت ہوتی ہے۔ جس انسان میں یادوں کی کمی ہوتی ہے یا جس کی یادیں بنی ہی نہ ہوں تو پھر وہ چاہے اپنا باپ ہی کیوں نہ ہو، اس کی کمی محسوس

نہیں ہوتی۔ بچوں کو باپ کا ساتھ چاہیے، انھیں ماں کا ساتھ چاہیے، انھیں والدین کی کمی چاہیے۔ یہی ساتھ یادیں بناتا ہے۔ پھر یہی یادیں محبت۔ جب محبت نہ ہو تو بوڑھا باپ گھر آئے تو گھر والے بجائے اسے ملنے کے اس کے سامان کو دیکھتے ہیں کہ ہمارے لیے کیا لایا ہے۔

ملازم کاروبار نہیں کرسکتا

بعض لوگ واپس آکر ملک میں چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرتے ہیں۔ لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ زیادہ تر بری طرح ناکام ہوتے ہیں۔ پھر، شکایت کرتے ہیں کہ یہاں کاروبار کا ماحول نہیں ہے۔ اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ انھوں نے زندگی کے چالیس سال مزدوری کی ہوتی ہے جس سے سوچ بھی مزدوروں والی تشکیل پاتی ہے۔ ایسے آدمی میں پیسہ سنبھالنے اور پیسے سے پیسہ بنانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یاد رکھیے، کاروبار ایک مزاج کا نام ہے، محض پیسہ ہونا کاروبار میں کامیابی کی ضمانت نہیں ہے۔ چنانچہ مزدور مزاج آدمی رسک نہیں لے سکتا۔ وہ درست وقت پر، درست کاروباری فیصلے نہیں کرسکتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کا پیسہ ڈوب جاتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ یہاں کے لوگ ٹھیک نہیں ہیں۔

لوگ اپنی بے وقوفی سے پیسہ گنواتے ہیں، پھر لوگوں کو برا کہتے ہیں۔ حماقت میری ہو، قصور کسی اور کا؟ بڑی عجیب بات ہے۔

بے یقینی کی بہتات

یہ سارے مسائل بے اعتماد اور بے یقین انسانوں کے مسائل ہیں۔ یہ طاقت ور اور بااعتماد انسان کے مسائل نہیں ہیں۔ طاقت ور، پُر اعتماد، پُر یقین انسان کیلئے آنا جانا مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی لغت میں تو پردیسی کا لفظ ہی نہیں ہے۔ جو آدمی منٹوں میں اسلام آباد چلا جائے، منٹوں میں لاہور آجائے اور منٹوں میں دبئی کا چکر لگا آئے، وہ پردیسی نہیں ہے۔ پردیسی وہ ہے جو ایک دفعہ جائے اور اسے یہ فکر لاحق ہو کہ واپس کیسے جاؤں گا۔

بچوں کو شروع سے کام کرنے کی تربیت دینی چاہیے۔ انھیں کام کی عظمت بتانی چاہیے۔ ہم اسے کام کی عظمت کا مضمون تو پڑھا دیتے ہیں، لیکن اس کے دل میں کام کی عظمت پیدا نہیں کرتے۔ اسے کام کرنے کے قابل نہیں بناتے۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کہ اگر کوئی ابتدا میں ملازم بن کر کام کرے۔ اللہ تعالیٰ مالک بنا دے گا۔ پھر مالک بن کر ملازموں کی طرح کام کیجیے تاکہ عاجزی باقی رہے۔ یہاں پر کام سے شرم آتی ہے جبکہ باہر جا کر مالکوں کے کتے بھی نہلاتے ہیں۔ یہاں رہ کر چھوٹے کام کو بڑا نہیں کیا جاتا۔

اپنی فطرت کے مطابق اپنی قابلیت بڑھایئے

سب بچے ایک جیسے نہیں ہو سکتے، سب ڈاکٹر نہیں بن سکتے، سب انجینئر نہیں بن سکتے، سب پائلٹ نہیں بن سکتے، لیکن ہنر ہر کوئی اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے۔ کوئی ایسا ہنر سیکھیے جو بظاہر معمولی ہی ہو، لیکن آپ کو اس میں مہارتِ تامہ حاصل ہو جائے۔ اس ہنر کو اتنا پالش کیجیے کہ پھر آپ جیسا اس ہنر میں کوئی اور نہ ہو۔ کتنا بڑا دھوکا اور عجیب بات ہے کہ اولاد والدین کے سامنے کام نہ کرے، لیکن باہر جا کر برتن دھوئے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ وہ والدین کے سامنے کام کرے اور یہیں بڑا انسان بنے۔ جیسے جیب میں سو روپے کے نوٹ سے کئی طرح کی چیزیں آسکتی ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ ہماری جیب میں زندگی ڈالتا ہے جس کے ساتھ لاکھوں مواقع جڑے ہوتے ہیں۔ اگر سوچ یہی رہے گی کہ انجینئرنگ کر کے صرف نوکری کرنی ہے تو پھر یہ اپنی زندگی ضائع کرنا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم نے مواقعوں کو محدود کر دیا ہے۔ قابلیت بڑھانے والا فرد سسٹم کے ہاتھوں اغوا نہیں ہوتا۔ اپنی قابلیت بڑھانے والا آدمی اندر سے مضبوط ہوتا ہے۔ جو قابل ہوتا ہے، اسے اپنی نوکری چھوٹنے کی پروا نہیں ہوتی۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ مجھ میں صلاحیت ہے اور میں کام کر لوں گا۔

مزدور ہونا بری بات نہیں ہے، لیکن مزدور بن کر ترقی نہ کرنا یہ بڑا ظلم ہے۔ معروف شاعر اور ادیب احسان دانش مزدور تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی دیواریں بناتے

تھے۔ ایک وقت آیا کہ انہی دیواروں کے پیچھے ان کے مشاعرے ہوئے۔ یہ ہوتی ہے عظمت۔ اگر باہر جانا ہے تو پھر قابلیت پر جایئے۔ جسے اپنی قابلیت پر یقین نہیں ہوتا، وہ واہمہ پیدا کر لیتا ہے کہ میں باہر جاؤں گا تو کامیاب ہوں گا۔ پردیسی ہونے میں حرج نہیں ہے، لیکن اپنے آپ کو کم قیمت پر نہ بیچیے۔ جو چیز کم قیمت میں آسکتی ہے اس کیلئے اپنے آپ کو کم قیمت میں فروخت نہ کیجیے۔ ہم ان چیزوں کے بدلے میں پیسہ کما رہے ہیں جو واپس نہیں آسکتیں۔ والدین کے ساتھ بہت تھوڑا وقت گزرتا ہے۔ جب وہ دنیا سے چلے جاتے ہیں پھر ساری زندگی کسک رہتی ہے۔ انسان کی سب سے بڑی خوش نصیبی یہ ہوتی ہے کہ جیسے انسان دنیا میں آتا ہے تو اس کے پیارے اس کے ارد گرد ہوتے ہیں، اسی طرح جب وہ دنیا سے جائے تو اس کے اپنے اس کے پاس ہوں۔

گھر کا سربراہ کہاں گیا؟

گھر کو سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہر گھرانے کو ایک ایسے لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے جو سمت متعین کرنے والا ہو، شعوری فیصلے کرنے والا ہو۔ یہ خوبی مرد ہی میں ہو سکتی ہے۔ گھر کا سربراہ نہ ہو تو عورتوں سے غلط فیصلے ہو جاتے ہیں، کیوں کہ عورتیں فطرتاً باہر کے معاملات کو درست نہیں سمجھ پاتیں۔

پردیس ضرور جایئے، لیکن اس کیلئے جواز بڑا ہونا چاہیے۔ صرف روٹی روزگار کیلئے پردیس جانا حماقت ہے۔ اگر محمد بن قاسم نے سترہ برس کی عمر میں سندھ فتح کیا تو اس کے پیچھے بہت بڑا جواز تھا۔ سوکھی روٹی اپنی فیملی کے ساتھ کھانا سیکھیے۔ اس میں بہت خوشی ہے۔ سوکھی روٹی کے ساتھ بڑے خواب دیکھنا سیکھیے۔ تکلیف میں اچھے خواب دیکھنا سیکھیے۔ تکلیفوں کا مطلب ہے کہ قدرت آپ کو اشارہ دیتی ہے کہ سوچو، آگے جانے کا سوچو۔ ہم بجائے سوچنے کے باہر چلے جاتے ہیں... فرار، کبھی حل نہیں دیتا۔

حقیقت کو تسلیم کرنے کی جرات پیدا کیجیے

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھایا ہے کہ زندگی اپنی ذمے داریوں کے ساتھ گزارو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ پڑھیں تو پتا چلے گا کہ کیسے انھوں

نے ذمے داریاں نبھائیں، محنت کیسے کی، خندق کیسے کھودی، بیٹیوں کی کیسے شادی کی۔ اتنا بڑا مرتبہ ہونے کے باوجود آپ میں عاجزی کس طرح کی تھی۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم کسی ایسی سنت کو پورا کرنا نہیں چاہتے جس میں ہمیں مشقت کرنا پڑے۔

اپنا ملک سب سے بہتر ہے

کچھ بننا چاہتے ہیں یا کچھ کرنا چاہتے ہیں تو اپنے ملک میں رہ کر محنت کرنا سیکھیے۔ اپنے اندر ہنر پیدا کیجیے۔ یہاں پاکستان میں رہ کر بھی آپ کھوکھے سے بڑے اسٹور کے مالک بن سکتے ہیں۔ وہ نسخہ تلاش کیجیے کہ کیسے مزدور سے مالک بنا جا سکتا ہے۔ وہ نسخہ ڈھونڈیے کہ کیسے اکاؤنٹنٹ سے فیکٹری کا مالک بنا جا سکتا ہے۔ جو آدمی چھوٹی سیٹ سے بڑی سیٹ پر نہیں جا سکتا، وہ اہل انسان نہیں ہے۔ پاکستان میں اگر آپ کو اچھی انگریزی بولنی آتی ہے، آپ بہ آسانی ترقی کر جاتے ہیں۔ ہمیں تو وہ بھی بولنی نہیں آتی۔ اگر آپ اچھی طرح بات کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں تو آپ ترقی کر سکتے ہیں۔ اگر آپ کو لوگوں سے خوش اخلاقی سے ملنا آتا ہے تو آپ ترقی کر سکتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام والدین کی ذمے داری ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو سکھائیں۔ جب تک والدین یہ ذمے داری قبول نہیں کریں گے، بچے قابل نہیں بنیں گے۔

فرار اختیار کرنے سے مسائل حل نہیں ہوتے

فرار کے رویے سے بچنا بھی نیکی ہے۔ ذمے داری قبول کرنا بھی نیکی ہے۔ ہر گھر کے فرد کو کمانے کے قابل ہونا چاہیے۔ ہم کتنا ظلم کرتے ہیں کہ ابا جی کماتے ہیں اور چودہ چودہ بچے کھاتے ہیں۔ بچے بڑے ہو جاتے ہیں، تب بھی باپ کے پیسے کے بل پلتے ہیں۔ بچوں کو اہل بنائیے۔ انھیں بچپن سے کام کا عادی بنائیے۔ چھوٹے چھوٹے ہنر سکھائیے۔ جو شخص زندگی گزارنے کا ہنر (Life skills) سیکھ جاتا ہے، وہ چاہے ڈاکٹر ہو، انجینئر ہو، وہ کچھ بھی ہو... وہ ترقی کر جاتا ہے۔ دوسری طرف لائف اسکلز سیکھے بغیر کچھ بھی بن جائیں، وہ ناکام اور پریشان رہتا ہے۔

کوئی نہ کوئی ہنر ضرور سیکھیے، کیوں کہ زندگی کے نشیب و فراز کا پتا نہیں ہوتا۔ ہنر

ہاتھ میں ہو تو آدمی بھوکا نہیں مرتا۔ زندگی کی اصل آزادی یہی ہے کہ آدمی اپنے ہنر کے بل بوتے پر زندگی گزارے۔



منفی سوچ کیسے ختم کی جائے

"اگر تم اپنی زندگی بدلنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے تمہیں اپنی سوچ کو بدلنا ہوگا!"

لاطینی کہاوت

سوچ۔ انسانی زندگی کے اہم ترین عوامل میں سے ہے۔ آپ ویسے ہی ہیں جیسی آپ کی سوچ ہے۔ لہٰذا، سوچ کے طریقہ کار کو سمجھنا اور اسے قابو میں رکھنے کا فن سیکھنا بہت ضروری ہے۔ کامیابی کے ماہرین آج سوچ کی اہمیت سے واقف ہیں، اس لیے اس وقت خودنموئی (پرسنل ڈویلپمنٹ) کے موضوع پر جتنا کام ہو رہا ہے، اس میں سب سے زیادہ تحقیق سوچ پر کی جا رہی ہے۔

منفی سوچ کیوں پیدا ہوتی ہے

سوچ دو طرح کی ہوتی ہے۔ مثبت سوچ اور منفی سوچ۔ ہم یہاں منفی سوچ کی بات کریں گے۔ سوچ منفی اس لیے ہوتی ہے کہ آدمی کو سوچنا نہیں آتا۔ اگر سوچنا آجائے تو مثبت اور منفی سوچ کا آپشن مل جاتا ہے۔ عام طور پر، ہمارے پاس ایک ہی انتخاب (آپشن) ہوتا ہے اور وہ منفی سوچ ہے۔ اس وجہ سے ہم ہمیشہ منفی سوچتے رہتے ہیں۔

منفی سوچ کی ایک بہت بڑی وجہ ابتدائی زندگی کے واقعات و سانحات بھی ہیں۔ بعض حادثات ایسے ہوتے ہیں جن کے نتائج منفی ہوتے ہیں اور وہ فرد کی شخصیت پر گہرے منفی اثرات مرتب کرتے ہیں۔ یہ اثرات آگے چل کر منفی سوچ کا ذریعہ بنتے ہیں۔ جس سے انسان شعوری یا لاشعوری طور پر منفی سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر پندرہ

تک سال منفی سوچ سوچ کر منفی سوچنے کا ماہر بن جاتا ہے۔ اکثریت کے ساتھ ایسا ہے۔ چنانچہ منفی سوچنا آسان تر ہو جاتا ہے، جبکہ مثبت سوچ اختیار کرنا مشکل تر ہوتا ہے۔

اپنی زندگی کے پہلے بارہ پندرہ سال جس ماحول میں آدمی پرورش پاتا ہے، یعنی اس کا گھر بار بھی آدمی کے سوچ کا خاص انداز (Thought Pattern) تشکیل کرتے ہیں۔ یہ انداز خیال آدمی کی عمر کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک گھر کے تمام افراد کی سوچ میں عموماً مماثلت پائی جاتی ہے۔

فطرتاً سوچ مثبت ہوتی ہے اور نہ منفی

پیدائشی طور پر سوچ نہ مثبت ہوتی ہے اور نہ منفی ہوتی ہے۔ جیسا کہ حدیث شریف میں بیان فرمایا گیا، ہر انسان فطری سوچ رکھتا ہے۔ پھر اس کا ماحول (والدین، اساتذہ، رشتے دار وغیرہ) اس کی فطری سوچ کو گہنا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا انسان پر خاص کرم ہے کہ اس نے انسان کی جبلت میں سیکھنا رکھا ہے۔ ہم کسی چیز کو پہلی بار سوچتے ہیں تو وہ کچھ اور طرح کی لگتی ہے، پھر سوچتے ہیں تو کچھ اور طرح کی ہوتی ہے۔ جب ایک شے کو بار بار سوچا جاتا ہے تو اس کی ایک واضح صورت بن جاتی ہے۔ پھر اس کے متعلق سوچنا آسان ہو جاتا ہے اور پہلے سے بہتر بھی۔

پہلی سوچ کسی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کوئی واقعہ ہو سکتا ہے، کوئی حادثہ ہو سکتا ہے۔ اس واقعے یا اس حادثے کے متعلق جو بھی سوچ بنتی ہے، آدمی اسی طرح سوچنا شروع کر دیتا ہے۔ یہی سوچ کا انداز ہے۔ بعض اوقات کوئی بولتا ہے تو ہم اس کی آواز سن کر ویسا ہی سوچنا شروع کر دیتے ہیں۔ البتہ بار بار کا سوچنا سوچ کے عمل کو آسان کر دیتا ہے، تاہم شرط یہ ہے کہ یہ سوچنا... شعوری ہو۔

منفی سوچ کا تازیانہ

عام طور پر ہمیں پتا ہی نہیں لگتا کہ کسی موضوع پر ہم غیر محسوس طور پر منفی ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ٹی وی پر کسی شخصیت کے بارے میں کوئی غلط رائے

قائم کی گئی۔ اب وہ رائے خواہ کتنی ہی غلط ہو، ہم اسے حقیقت تسلیم کرتے ہیں اور پھر ہر محفل، ہر موقع پر جب بھی اس شخصیت کے بارے میں کوئی ذکر چھیڑا گیا، ہم اسی غلط رائے کی بنیاد پر بحث شروع کر دیتے ہیں۔ ہم Judgemental ہو جاتے ہیں۔

ہمارے اندر منفی سوچ کے راستے بنے ہوئے ہیں اور ہم انہیں بھی روکنے کی کوشش نہیں کرتے۔ ہم اپنی منفی سوچ کو مثبت بنانے کی خواہش کرتے ہیں اور نہ کوشش۔

سوچ پر صحبت کے اثرات

آدمی کی صحبت کا ہماری سوچ پر گہرے اثرات پڑتے ہیں۔ چنانچہ کسی منفی سوچ والے شخص کے پاس رہنے سے کچھ ہی عرصے میں آپ کی سوچ بھی منفی ہو جائے گی۔ جس کے ساتھ رہتے ہیں، اس کی سوچ کا اثر پڑتا ہے اور وہیں سے منفی سوچ قوی ہونا شروع ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ منفی سوچنا آسان ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی معاملہ الٹ بھی ہوتا ہے۔ جب آدمی مثبت یا منفی سوچ کو ایک عرصے تک برقرار رکھتا ہے تو اس کے اندر کی شعاعیں بھی مثبت یا منفی ہو جاتی ہیں۔ اپنے دل، دماغ اور ذات کو شعوری طور پر مثبت رکھنا سیکھیے۔ جس طرح آدمی گھر میں کوڑا کرکٹ کو برداشت نہیں کرتا، یہ برداشت نہیں کرتا کہ اس کے گھر کا دروازہ کھلا رہے اور آوارہ کتا اس کے گھر میں داخل ہو جائے۔ جس طرح آدمی کسی غیر ضروری شے کو اپنے گھر میں لانا پسند نہیں کرتا، اسی طرح منفی سوچ بھی آپ کے ذہن میں نہیں آنے دینا چاہیے۔ یہ پتا ہونا چاہیے کہ اندر آنے والا خیال کیا ہے؟ کیا یہ مثبت ہے یا منفی؟ کیا یہ میرے بھلے کا ہے یا مجھے گمراہ کرنے والا ہے؟ کیا یہ خیال میرے کام کا ہے کہ نہیں؟

مثبت سوچ کے حصول کے ذرائع بہت کم ہیں۔ البتہ ان پر بہت کام ہو رہا ہے۔ جن قوموں اور ملکوں نے سوچ کے فن کو اپنے معاشروں میں پروان چڑھایا، وہ بہت زیادہ ترقی کر گئے۔ ہمیں اپنے ملک میں اس بارے میں ضرور غور کرنا چاہیے اور ایسے پلیٹ فارم بنانے چاہئیں تعمیری سوچ کو پروان چڑھانے والے ہوں۔

ہم دوسروں کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں جو لوگ منفی سوچتے ہیں، وہ مثبت

سوچنا شروع کر دیں۔ سدھار کا یہ طریقہ غلط ہے۔ دوسروں کو بدلنے کی بجائے پہلے خود کو بدلنے کی ذمے داری قبول کیجیے۔ جو شخص منفی سوچ کا حامل ہو چکا ہے، سب سے پہلے اسے مان لینا چاہیے کہ میرے ساتھ یہ مسئلہ ہے اور مجھے یہ مسئلہ حل کرنا ہے، خود کو مثبت سوچ والا بنانا ہے۔ جب آدمی یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ مجھے مثبت سوچنا ہے تو پھر چاہے عمر جتنی ہی کیوں نہ ہو، مثبت سوچ پیدا ہو سکتی ہے۔

سوچ کی ویکسی نیشن

بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کی ویکسی نیشن چار پانچ سال میں مکمل ہوتی ہے۔ اس ویکسی نیشن کا اثر عمر بھر رہتا ہے۔ سوچ کے حوالے سے پہلی ویکسی نیشن یہ ہے کہ ایسا شخص تلاش کیا جائے جو مثبت سوچ کا حامل ہو۔ پھر اس کی پیروی بھی کی جائے۔ ہمیں شعوری طور پر یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جہاں سے بھی مثبت سوچ ملے، اسے ضرور حاصل کیا جائے۔ وہ کتاب کے ذریعے ہو سکتی ہے، وہ انٹرنیٹ کے ذریعے ہو سکتی ہے، وہ کوئی محفل ہو سکتی ہے۔ چار دوستوں کا ایک ایسا گروپ بنا کر روزانہ بیٹھیے اور طے کیجیے کہ ہمیں ایک گھنٹہ صرف مثبت باتیں ہی کرنی ہیں۔ جب یہ عمل روزانہ ہوگا تو پھر مثبت سوچنا، مثبت کہنا اور مثبت بولنا بہت آسان ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی کا مقصد بنائیے۔ جو لوگ مقصد اور ہدف کے مطابق زندگی گزارتے ہیں، وہ ذرا مشکل ہی سے منفیت کا شکار ہوتے ہیں۔

ڈگری سے علم نہیں ملتا

مثبت سوچ کی تشکیل میں کتابوں کا کردار بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ہم کسی نہ کسی شکل میں کتابیں پڑھتے ہیں، چاہے وہ نصابی کتابیں ہوں یا غیر نصابی۔ جس معاشرے میں کتابیں زیادہ پڑھی جاتی ہیں، معلومات زیادہ ہے، علم اور ذرائع علم زیادہ ہیں، وہاں منفی سوچ کم ہوتی ہے۔ جہاں روشنی ہو، وہاں اندھیرا ختم ہو جاتا ہے۔ علم کی روشنی کے ذریعے جہالت کا اندھیرا ختم کیا جا سکتا ہے۔ علم وہ ہوتا ہے جو آپ کی ذات اور آپ سے جڑے لوگوں کو فائدہ دے۔ بعض اوقات آدمی بڑی بڑی ڈگریاں لے لیتا ہے،

لیکن اس کے باوجود سوچ منفی رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے تعلیمی ادارہ سے علم حاصل نہیں کیا گیا، سند حاصل کی گئی ہے۔ بعض اوقات تعلیم کچھ ہوتی ہے اور علم کچھ اور ہوتا ہے۔ اگر آپ نصابی اور غیر نصابی کتابوں کی وجہ سے مثبت بن گئے ہیں تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ آج ہمارے لیے خوش قسمتی ہے کہ ہمارے ہاں اشفاق احمد، بانو قدسیہ، حضرت واصف علی واصفؒ اور دیگر دانشوروں کا علم دستیاب ہے جو موٹیویشن پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ مثبت سوچ پیدا کرتا ہے۔ کوشش کیجیے کہ جو لیٹریچر پڑھیں، وہ مثبت ہو۔ اس معاشرے کو مثبت لوگ چاہئیں۔ اس ملک کو اُن لوگوں کی ضرورت ہے جو ذمے داری قبول کریں اور تحریک کا سبب بنیں۔

اسلام منفی سوچ سے منع کرتا ہے

اسلام میں ہر وہ شے حرام ہے جو مثبت سوچ چھین لے، جو منفی سوچ والا بنا دے، جو گمان خراب کر دے۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ "اللہ تعالیٰ تم سے ویسا ہی معاملہ کرے گا جیسا تم نے اللہ تعالیٰ سے گمان کیا۔" اگر آپ کا گمان ہی درست نہیں ہے، سوچ ہی مثبت نہیں ہے تو پھر اپنے ایمان کی فکر کیجیے۔ قرآن مجید میں یہ فرمایا گیا ہے کہ کثرت بدگمانی سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ جو لوگ زیادہ شکی مزاج ہوتے ہیں، زیادہ منفی سوچتے ہیں، ایک دن آتا ہے کہ وہ شعوری یا لاشعوری طور پر کفر کی طرف چلے جاتے ہیں۔ پامسٹری چونکہ انسانی سوچ میں دیمک لگاتی ہے، اور طرح طرح کے واہمے پیدا کرتی ہے، اس لیے اسلام میں پامسٹری حرام ہے۔ یہ منفی سوچ ہے۔ یہ تب ہی ختم ہو سکتی ہے کہ جب منفی سوچ کی جگہ مثبت سوچ اختیار کی جاتی ہے۔ مثبت سوچ میں اتنی طاقت ہے کہ وہ آپ کا ایمان قوی کرتی ہے اور ایک اچھا انسان بناتی ہے۔

جہاں مثبت سوچ نہیں ہوگی، شعوری یا لاشعوری طور پر وہاں منفی سوچ آجائے گی۔

منفی سوچ ختم کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ ایسے ذرائع سے جڑ جائیں جہاں سے مثبت سوچ ملے۔ اگر آپ مثبت سوچنے والے بن گئے تو پھر منفی سوچ کو جگہ ہی نہیں ملے گی اور آپ کے مسائل گویا خود حل ہونے لگیں گے۔ آپ کی زندگی میں

بہت لوگ بھی آ کر شریک ہو گئے اور آپ کے ساتھ [illegible]
گے۔

*

میرا رانجھن

''اگر تم اپنی زندگی بدلنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے تمہیں اپنی سوچ کو بدلنا ہوگا!''

لاطینی کہاوت

کسی نے اپنے مرشد سے پوچھا، سیانا کون ہوتا ہے؟ جواب ملا کہ جو مر کر بھی نہیں مرتا۔ ''میرا رانجھن ہن کوئی ہور'' یہ فلسفہ ایسا فلسفہ ہے جو دو سو سال گزرنے کے بعد بھی زندہ ہے۔ ''میرا رانجھن ہن کوئی ہور'' کا مطلب ہے کہ میں جس کو خدا سمجھ بیٹھا تھا، اصل میں وہ خدا نہیں ہے، اصل خدا تو کوئی اور ہے۔ وہ چیزیں جنھیں میں نے بہت وقعت دی تھی، جنھیں میں نے مجسم خدا بنایا تھا، اصل میں وہ خدا ہونے کے لائق نہیں تھیں۔ یہ میری غلطی تھی۔ میری ترجیحات غلط تھیں کہ میں نے جن چیزوں کو اولین ترجیح پر رکھا تھا، وہ ترجیح کے قابل نہیں تھیں جبکہ ترجیحات کچھ اور ہونی چاہیے تھیں۔

شعور کے ساتھ ترجیحات بدلتی ہیں

زندگی میں ایک وقت وہ ہوتا ہے کہ جب کھلونے ترجیح اول ہوتے ہیں۔ پھر وقت گزرتا ہے، شعور آتا ہے اور ساتھ ہی نئی خواہشیں بھی آتی ہیں۔ ایک شخص جوان ہوتا ہے تو اس کا شعور بھی جوان ہوتا ہے۔ ایک اچھا اور پختہ شعور وہ ہوتا ہے جو صحیح وقت پر صحیح چیز کا انتخاب کرے۔ مثال کے طور پر، کئی لوگوں میں کپڑا خریدنے کی صلاحیت

بہت اچھی ہوتی ہے۔ ممکن ہے، یہ پیدائشی صلاحیت ہو۔ ممکن ہے، تجربات سے سیکھا ہو۔ زندگی میں انتخاب واحد عمل ہے جو ساری زندگی جاری رہتا ہے۔ ہم بچپن میں منتخب کرتے ہیں، بڑے ہوتے ہیں، تب بھی منتخب کرتے ہیں، شادی کرنے لگتے ہیں، تب بھی منتخب کرتے ہیں۔ اسی طرح، زندگی میں جگہ جگہ انتخاب کرتے ہیں۔ یہ انتخاب بتاتا ہے کہ شعور جوان ہوا ہے یا نہیں۔

اہم چیز یہ نہیں کہ عمر کتنی ہے، اہم چیز یہ ہوتی ہے کہ جس عمر میں ترجیحات کا تعین کر لینا چاہیے، کیا اس عمر میں تعین کیا جا رہا ہے؟ جب ہم کسی چیز کا انتخاب کرتے ہیں تو پیچھے کسی اور کی عقل ہوتی ہے۔ وہ عقل فیصلہ کرتی اور بتاتی ہے کہ ادھر جانا ہے اور اُدھر نہیں جانا۔ وہ عقل جو فیصلہ کراتی ہے کہ مجھے کدھر جانا ہے۔ اصل میں، یہ عقل اہم ہے۔ اس دنیا میں حافظہ اتنا اہم نہیں، زبان اتنی اہم نہیں، جتنا کہ عقل اہم ہے۔

کوئی شخص سقراط کی زبان نہیں جانتا، لیکن سقراط کے جملوں پر سر دھنتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ شعور کی اہمیت ہے، عقل کی اہمیت ہے۔ وہ شخص کتنا اہم ہے جس نے اتنی بڑی بات کہی ہے کہ کئی سو سال بعد بھی اگر اس کے فقرے زندہ ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ جملے آج بھی زندہ ہیں۔ کیا تاثیر ہے ان جملوں میں کہ وہ جملے آج بھی ترجیحات میں ہیں۔

ترجیحات کا انتخاب سیکھیے

بات یہ ہے کہ اس شخص نے صحیح وقت میں اپنی صحیح عقل کا استعمال کیا اور دانش ور بن گیا۔ اس نے کہا کہ جتنا مرنے والا سانس کا طلب گار ہوتا ہے، علم کیلئے میری طلب بھی اتنی ہے۔ اس لیے کہ اس نے شعوری یا لاشعوری طور پر اپنی ترجیحات میں دانش کا انتخاب کیا تھا۔

ہم اپنی زندگی میں مار تعلیم کی وجہ سے نہیں کھاتے بلکہ ہم مار اس وجہ سے کھاتے ہیں کہ ہم وقت پر اپنی ترجیحات طے نہیں کرتے۔ ہم بہت سارا وقت گزارنے کے بعد ترجیحات کی طرف آتے ہیں۔ اس وقت پتا لگتا ہے کہ ترجیحات بنانے کی عمر ہی گزر

گی۔ مثال کے طور پر، ایک عمر ہوتی ہے کہ آدمی اس وقت تک زیادہ رسک لے سکتا ہے۔ ایک عمر میں زیادہ نقصان برداشت کیا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات آدمی بڑا ہو جاتا ہے، لیکن اس کا شعور بڑا نہیں ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ آپ کی عمر کے ساتھ شعور بھی بڑھے۔ شخصیت میں پختہ کاری آئے۔ فہم کی انتہا یہ ہے کہ آپ کی سوچ، آپ کے افکار آپ کی عمر سے آگے آگے ہوں۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ فرماتے ہیں، ''بلھے شاہ اسی مرنا ناہیں... گور پیا کوئی ہور'' انھیں سمجھ آ گئی کہ جسم کی زندگی اصل زندگی نہیں ہے۔ روح کی زندگی حقیقی زندگی ہے بلکہ اس سے بھی آگے ایک اور زندگی ہے جو افکار کی زندگی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''میں نے اپنی نبیؐ کا ذکر بلند کر دیا۔'' جس طرح کوئی انسان قرآن پاک جیسی کوئی آیت نہیں بنا سکتا، اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرما دیا، پھر کوئی شخص ایسا نہیں کہہ سکتا کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حکمت و دانش اس معیار کی ہے کہ کائنات میں ایسا کوئی انسان نہیں آیا اور نہ آ سکتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے کی حکمت اس کے پاس ہو۔

انسانوں سے بھیک تو اللہ سے فضل ملتا ہے

حضرت بابا بلھے شاہؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی کو پوجا کے لائق سمجھنا ہے تو اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھو۔ اگر تم کسی اور کو اس کی جگہ پر رکھو گے تو دنیا سے ملے گا تو ضرور، لیکن بھیک کی صورت میں ملے گا۔ جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے بھیک نہیں ملتی بلکہ اس کا فضل ملتا ہے۔ اور وہ فضل اپنی شان کے مطابق عطا کرتا ہے۔ بھیک مانگنے اور چھوٹے چھوٹے دروازوں پہ دستک دینے سے بدرجہا بہتر ہے کہ تم اللہ سے مانگو۔ جس ذات کیلئے تک دی جا سکتی ہے، جس کیلئے خود کو مارا جا سکتا ہے، جس کیلئے اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹا جا سکتا ہے وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

ہم اپنی زندگی میں ارد گرد کے لوگوں کیلئے اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹتے ہیں۔ مثال کے طور پر، باپ اپنا پیٹ اور اپنی خواہشیں کاٹ کر بچوں کو پالتا ہے۔ پتا لگا کہ بچے اس کی محبوب ہیں جس کیلئے انسان خود کو بیچ دیتا ہے۔ انسان اپنے اقتدار کیلئے اپنے خاندان کو

تباہ کرکے رکھ سکتا ہے۔ پتا چلا کہ اقتدار کیلئے خاندان کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ بعض لوگ دولت کیلئے پیسہ اتنی بڑی ترجیح ہوتا ہے کہ وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر پیسہ کماتے ہیں۔ بعض لوگ شہرت پانے کیلئے وہ وہ حرکتیں کرتے ہیں شاید ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ یوں انہیں بدنامی کی صورت میں شہرت مل جاتی ہے۔ اقتدار مل جائے اگر آپ کا تعلق دینے والے سے رابطہ ہے تو پھر آپ بڑے انسان ہیں۔ جس نے زندگی میں اپنی ترجیحات طے نہیں کیں، وہ زندوں کی طرح زندگی نہیں گزار رہا بلکہ مردوں کی طرح گزار رہا ہے۔

اپنے غموں کو خوش آمدید کہیے

ترجیحات کا بہترین وہ وقت ہوتا ہے جب انسان بے بس ہوتا ہے کیونکہ اس وقت انسان سوچتا ہے کہ میں نے اپنی خواہشوں کی خاطر اپنی زندگی برباد کر ڈالی۔ اب وقت ہے کہ ان خواہشوں کے بتوں کو توڑ کر اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق بنایا جائے۔ جس طرح ملکہ سبا کے دربار میں جب ہدہد خط لے کر آیا تو ملکہ سبا نے کہا کہ ہمیں اس بادشاہ کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑیں گے، کیونکہ یہ بہت طاقتور بادشاہ ہے۔ ملکہ کے درباری کہنے لگے کہ آپ کیوں ڈر رہی ہیں، ہمارے پاس بھی بہت فوج ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے اس بات پر ڈر نہیں ہے کہ اس نے خط طاقتور چیز کے ذریعے بھیجا ہے بلکہ جو ہدہد کے ذریعے خط بھیج سکتا ہے، اس کے پاس کتنی طاقت ہوگی۔ جب بادشاہ علاقہ فتح کرتا ہے تو مسند پر بیٹھنے سے پہلے بڑوں کے سر اتار کر پھر مسند پر بیٹھتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادرؒ جیلانی فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی دستور ہے کہ وہ جب کسی کے دل پر بیٹھتا ہے تو پھر خواہشوں کے بتوں کے سر اتارنے پڑتے ہیں۔ ہم نے اپنی خواہشوں کے بتوں کو اتنا بڑا کیا ہوتا ہے کہ وہ ذات گرامی ہماری ترجیحات میں پہلے نمبر نہیں آتی۔ ہم اپنی انا کے بت گرنے نہیں دیتے۔ ہم اپنے مقام سے پیچھے آ کر کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ”غم دل جانے کا اعلان بھی کیفیت ہے“

بندہ غم کو قبول کر لیتا ہے، وہ عام انسان نہیں رہتا، ولی بن جاتا ہے۔ قدرت اس کے اندر وسعت پیدا کر دیتی ہے۔ جو بندہ غم پر گلہ کرتا ہے، وہ فارغ ہو جاتا ہے۔ لیلیٰ لنگر بانٹ رہی تھی۔ جب مجنوں کی باری آئی تو اس نے مجنوں کا کاسہ توڑ دیا۔ مجنوں بڑا خوش ہوا۔ سب نے کہا، تمھیں لنگر نہیں ملا اور اوپر سے تمہارا کاسہ بھی توڑ دیا۔ اس نے پوچھا، کیا کسی اور کا کاسہ توڑا ہے؟ انھوں نے کہا، نہیں۔ مجنوں نے کہا، اس نے میرا کاسہ توڑ دیا، اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھے کاسے کے ساتھ نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ مجھے کاسے کے بغیر دیکھنا چاہتی ہے۔

آپ کی ذات اور اس کا مقام

ہر شے کا ایک مقام ہے۔ آپ اپنی سواری کو اسی جگہ رکھتے ہیں، جہاں وہ محفوظ ہے۔ کیا آپ نے کبھی ایسی جگہ اپنی گاڑی پارک کی ہے جہاں آپ کو پتا ہو کہ یہاں پہ غیر محفوظ ہے؟ نہیں، کیونکہ آپ کو پتا ہے کہ اس کا مقام کیا ہے۔ ذرا غور کیجیے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی ذات کو کہاں رکھا ہے۔ جس ذات گرامی سے پہلے، یہاں اور بعد میں بھی واسطہ ہے، کیا وہ ہماری ترجیحات میں شامل ہے۔ آپ کی زندگی کے معلومات اس کی گواہی دیں گے۔

غم بہت بڑی نعمت ہے، کیوں کہ جس حالت میں غم آتا ہے، اس میں بہت امکان ہوتا ہے کہ آدمی اپنے انتخابات کو بدل ڈالے۔ وہ دنیا کی ترجیحات کو چھوڑ کر خدا کو اپنی اولین ترجیح میں شامل کر لے۔ جب تک غم رہتا ہے، اس وقت تک یہ انتخاب ہوتا ہے کہ بندہ ٹھیک ہو جائے۔ غم زندگی میں آیا اور ترجیحات بدلنے کا سبب بن گیا تو یہ بڑی نعمت ہے۔

صحبت کا انتخاب بہت اہم ہے

اگر آپ کی صحبت کسی مایوس شخص سے ہے تو اس سے تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ خاص کر ایسے مایوس سے تو فوراً خلاصی اختیار کیجیے جو کہنے سننے کے باوجود مایوسی چھوڑتا نہیں چاہتا۔ اس کی وجہ ہے کہ وہ صحبت میں آپ کو ناامیدی کا شکار کر جاتا ہے۔ کئی لوگوں

چھوٹے چھوٹے غموں کو مایوسی میں بدل رہے ہوتے ہیں، یعنی وہ کام بھی کر رہے ہوتے ہیں اور مایوس بھی ہوتے ہیں۔

اس کے برخلاف، بعض لوگ مشکلات کا سامنا کرنے کے ساتھ ساتھ بہت پر امید ہوں گے۔ عظیم انسان وہ ہوتا ہے جو مشکل دن کو بھی اچھا بنالیتا ہے۔ غم کے دوران مثبت یا منفی ہونے کا مکمل انتخاب آپ کے پاس ہوتا ہے۔ صوفیائے کرام ہی راز خوب جانتے ہیں کہ کیوں کر اپنے غم کو امید کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ ان کا تعلق غموں اور خوشیوں کے خالق، اللہ سے جڑا ہوتا ہے۔

ضروری نہیں کہ عمر میں اضافے سے عقل بھی بڑھے

انسان یہ کی عمر بڑھتی ہے یا وہ کچھ سیکھ جاتا ہے تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ سیانا ہو گیا ہے۔ لیکن، اس کی حرکات وسکنات اور افکار یہ بتاتے ہیں کہ وہ بچپن میں ہے یا پھر بڑا ہو چکا ہے۔ بچپن کے ساتھ کچھ چیزیں جڑی ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے خوبصورت شے معصومیت ہے جسے ہم بہت جلد کچل دیتے ہیں۔ گورے اپنے اٹھارہ سالہ لڑکے کو ''مین'' کہتے ہیں جبکہ ہم پچیس سال والے شخص کو بھی ''کاکا'' کہہ پکارتے ہیں۔ بڑی بات یہ ہوتی ہے کہ آپ سمجھ جائیں کہ وہ وقت میرا بچپن کا وقت تھا، وہ ختم ہو چکا۔ بچپنا ایک ایسی عمر میں ہے کہ جس میں انسان کا انتخاب کمزور ہوتا ہے۔ وہ اتنا معیاری نہیں ہوتا۔ انسان کا انتخاب ظاہر کرتا ہے کہ بچپنا ہے۔ بچپن کی کچھ چیزیں ضرور زندہ رہنی چاہئیں جیسے بابا جی اشفاق احمد فرماتے تھے کہ کبھی اپنے اندر کا بچہ نہ مارو، وہ بچہ جو سیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔

اپنے اندر چھپے بچے کا دم نہ گھونٹئے

اس سے مراد بچوں میں موجود وہ تجسس کی تڑپ ہے جو بچے رکھتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بچے بہت زیادہ سوال کرتے ہیں، کیوں کہ سوال ہی کی مدد سے آدمی کچھ نیا جانتا اور سیکھتا ہے۔ معروف کوچ اور مصنف انتھونی روبنس کہتا ہے، ''سوالات ہی جوابات ہیں۔'' بچے میں کبھی سوال کی موت نہیں ہونی چاہیے۔ سوال زندہ رہنا چاہیے۔

یعنی ہم بچوں میں سوال کرنے کی تڑپ کا دم گھونٹ دیتے ہیں۔ بچہ جب سوال کرتا ہے تو اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ بند کرو اپنی بکواس، ہر وقت ٹر ٹر... کبھی خاموش بھی ہو جایا کرو۔

جو آدمی سوال کر سکتا ہے، وہ خوش قسمت انسان ہے کیونکہ جو سوال کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ گویا سوچتا ہے۔ سوال کا مطلب ہے کہ جستجو اور کھوج کی خواہش ہے۔ یہ خواہش جیسے بچپن میں زندہ ہوتی ہے، ویسے ہی پوری زندگی باقی رہنی چاہیے۔

آپ کا امتحان

جیسے ہی انسان کے اندر کوئی صلاحیت آتی ہے، عموماً ساتھ ہی امتحان ہو جاتا ہے۔ بابے کہتے ہیں کہ انسان کی ہر حالت امتحان ہے، اس لیے جب صلاحیت و مہارت آ جائے تو اس پر مغرور ہونے کی بجائے اس حالت کے امتحان سے سرخرو ہونے کی کوشش کیجیے۔ اس امتحان میں وہی پاس ہو سکتے ہیں جو اللہ سے ملا رہے۔ اگر آپ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ملا ہوا ہے تو یہ آپ کی بڑی خوش بختی ہے۔ اس ساتھ کی مدد سے آپ کو استقامت بھی مل جائے گی۔ رانجھے کا مطلب وہ ذات ہے جس کیلئے اپنا وقت اور اپنے وسائل لگانے کیلئے تیار رہتے ہیں۔ اس تعریف سے ہر ایک کا اپنا رانجھا ظاہر ہو جائے گا کہ کس کا رانجھا کون ہے۔



دل دریا

''اگر تم اپنی زندگی بدلنا چاہتے ہو تو سب سے پہلے تمہیں اپنی سوچ کو بدلنا ہوگا!''

لاطینی کہاوت

دل دریا سمندروں ڈونگے

اللہ تعالیٰ کی جہاں بے شمار رحمتیں اور نوازشیں ہیں وہاں پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک اس صلاحیت سے بھی نوازا ہے کہ وہ اندازہ لگاتا ہے پھر اس اندازے کے پیمانے بناتا ہے اس صلاحیت کے بغیر انسان زندگی نہیں گزار سکتا۔ دنیا کی دوسری مخلوق کے پاس بھی یہ صلاحیت نہیں ہے کہ پیمانہ بنا سکے مثال کے طور پر شاہین دیکھ کر اپنے شکار کا اندازہ لگا لیتا مگر وہ پیمانہ نہیں بناتا کہ میں نے یہ جو شکار کیا ہے اس کے لیے کتنے کلومیٹر سفر کیا ہے۔ انسان کی تاریخ میں اس کی سب سے بڑی ایجاد ''صفر'' یعنی زیرو ہے اور پیمانے ہیں یہ پیمانے کلومیٹر کی شکل میں، وزن کی شکل میں اور بہت سی دوسری شکلوں میں ہیں اس کی واضح مثال یہ ہے کہ ہم اپنے بچے کو اس کی ناسمجھی کی بنا پر سڑک پر اکیلا نہیں چھوڑتے۔ دنیا میں جتنی بھی ترقی ہو رہی ہے وہ انہیں پیمانوں کی وجہ سے ہی ہو رہی ہے۔ زندگی میں وہ لوگ بہت آگے جاتے ہیں جن کی اندازے کی صلاحیت بہت اچھی ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ جو شخص اہل نہیں ہوتا اس کو ذمہ داری نہیں دی جاتی۔ زندگی میں جہاں اندازے کے اتنے فائدے ہیں وہاں اس کے نقصان بھی ہیں اور وہ نقصان یہ ہے کہ ہمیں بندوں پر اندازہ نہیں لگانا چاہیے کیونکہ یہ ہماری ذمہ داری

نہیں ہے یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ دلوں کے حال میں جانتا ہوں۔ انسان عام طور پر چیزوں کا اندازہ تو لگا سکتا ہے لیکن انسان اتنا گہرا ہے کہ اس کے بارے میں اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ہم یہ تو اندازہ لگا سکتے ہیں کہ فلاں شخص کے ساتھ کام کرنا چاہیے اور فلاں کے ساتھ نہیں لیکن ہم یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ گناہگار ہے یا نیک۔ جب ہم یہ اندازہ لگاتے ہیں کہ فلاں نیک ہے یا گناہگار تو یہ بدی بن جاتی ہے اور ہماری نیکی اس کے پاس چلی جاتی ہے اس سے زندگی میں دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ہماری زندگی میں بندے کم ہونے لگ پڑتے ہیں۔

معاشرے میں مختلف رویے پائے جاتے ہیں جن لوگوں میں یہ رویہ زیادہ پایا جاتا ہے وہ اپنی طرف سے سمجھتے ہیں کہ فلاں بندہ نیک ہے اور فلاں نہیں ہے یعنی جو کام اللہ تعالیٰ کا ہے وہ انہوں نے اپنے ذمہ لیا ہوا ہے یہ اتنی بڑی خرابی ہے کہ جس کی وجہ سے معاشرہ زوال کی طرف جا رہا ہے۔ ہر بندہ دوسرے پر شک کر رہا ہے کہ وہ گناہگار ہے جب اس سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں تو جواب ملتا ہے کہ میرا دل کہہ رہا ہے،اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا اس طرح شک کرنے سے تمہیں کوئی فائدہ ہوگا جواب ملتا ہے نہیں، پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا اس شخص سے کوئی واسطہ ہے جواب ملتا ہے نہیں، پوچھا جاتا ہے کہ تمہارا اس طرح سے شک کرنے سے اس کا کوئی نقصان ہوگا جواب ملتا ہے نہیں۔ جس بندے میں یہ رویہ ہوتا ہے وہ اپنے جنازے میں بندے کم کر لیتا ہے یعنی وہ بندہ زندگی میں اکیلا رہ جاتا ہے،اس طرح کے لوگ باہر کی دنیا سے گلہ کرتے ہیں جب کہ گلہ ان کے اندر ہوتا ہے وہ اس وجہ سے یہ کر رہے ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جو صلاحیت عطا کی ہوتی ہے وہ اس کا منفی استعمال کر رہے ہوتے ہیں حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں "انسان ساری زندگی دوسروں کو ماپنے کے پیمانے بناتا رہتا ہے اس لیے خود کو ماپنے کا وقت نہیں ملتا"۔

لوگوں کی عاقبت کے حوالے سے ہمیں کوئی بات نہیں کرنی چاہیے اللہ تعالیٰ جانے اور وہ بندہ جانے۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے "وہ شخص جنت میں نہیں جا سکتا جس کے شر کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑنا شروع کر دیں" ایسے دنیا میں بہت سے لوگ ملیں گے

جن میں اور تو کوئی خامی نہیں پائی جاتی لیکن یہ خامی پائی جاتی ہے کہ ان کے شر سے لوگ محفوظ نہیں ہیں، ایسے لوگوں نے اپنی طرف سے خود ساختہ اصول وضوابط بنائے ہوتے ہیں۔ تعلقات کے احساسات ہوتے ہیں ان کا زبان سے پتا نہیں چلتا صرف محسوس ہوتا ہے کسی کے ساتھ کتنا تعلق ہے اس کا آسان سا حل یہ ہے کہ اپنے اندر سے پوچھا جائے جواب مل جائے گا۔ یہ گھاٹے کا رویہ ہے کوئی بھی شخص گھاٹے کا سودا نہیں کرنا چاہتا۔ کوئی بھی شخص اپنی چیز کسی ایسے بینک میں نہیں رکھوانا چاہتا ہے یہاں پہ چوری ہونے کا گمان ہو، کوئی ایسی گاڑی نہیں خریدنا چاہتا جس کے بارے میں گمان ہے اس کا لازمی ایکسیڈنٹ ہونا ہے، کوئی ایسا کپڑا خریدنا نہیں چاہتا جس کے بارے میں گمان ہے کہ یہ پھٹ جائے گا اور کوئی ایسی شادی نہیں کرنا چاہے گا جس کے بارے میں گمان ہے کہ اس کا انجام اچھا نہیں ہے۔ اگر کسی کو دوست بنانے کے لیے یہ شرط رکھ دیں کہ اپنے آپ تھوڑا ٹھیک کریں تو وہ کبھی بھی دوست نہیں بن سکتا دوستی کے لیے وہ جیسا بھی ہے اس کو قبول کرنا پڑے گا۔ سمجھ دار انسان دوست بنا کر اپنے رویئے سے اسے تبدیل کرتا ہے۔

جو دوسروں میں عیب تلاش کرتا ہے اس کے ماضی میں جا کر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ رویہ اس میں شروع سے بنا ہوا تھا۔ ویسے یہ رویہ زیادہ تر تنگ دل لوگوں کا ہوتا ہے۔ بہت سارے رویے ایسے ہوتے ہیں جو ہم نے لاشعوری طور پر کاپی کیے ہوتے ہیں۔ جس گھر کے بڑے سب سے چھوٹے کے بارے میں احساس کر رہے ہوں تو اللہ تعالیٰ انہیں بہت نوازتا ہے ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہم اچھے بھلے بندے کو چھوٹا کر دیتے ہیں جبکہ اللہ کے ہاں اس کا مقام بڑا ہوتا ہے۔ ہر بندہ اہم ہوتا ہے کسی کی اہمیت جاننے کے لیے گھر میں کام کرنے والی کو دس دن کی چھٹی دے دیں اوقات یاد آجائے گی۔ جو بندہ کسی کو قدر نہیں دیتا وہ خود بے قدرہ ہو جاتا ہے، بندہ دوسروں کی قدر کرتا ہے جس کے صلے میں اللہ تعالیٰ اس کی قدر کرواتا ہے یہ واحد چیز ہے جو دی کہیں جاتی ہے اور صلہ کہیں ملتا ہے۔ ہم بندے کی قدر کرتے ہیں اور اسی سے صلہ چاہ رہے ہوتے ہیں۔ جب کسی کی قدر کی جاتی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں چلی جاتی

ہے پھر اللہ تعالیٰ ایسی جگہ پر صلہ دیتا ہے جس کی توقع نہیں ہوتی۔

رویہ زیادہ تر ریفلیکشن سے بنتا ہے اور یہ زیادہ تر گھروں سے بنتا ہے دوسرے نمبر پر ممبر سے بنتا ہے تیسرے نمبر پر استادوں سے بنتا ہے چوتھے نمبر پر معاشرے سے بنتا ہے۔ شرعی طور پر لوگ ٹھیک ہوتے ہیں لیکن لوگ انہیں سماجی طور پر برا کہہ رہے ہوتے ہیں مثال کے طور پر ایک بندے کی عمر پچاس برس ہے اس کی بیوی کا انتقال ہو جاتا ہے اب شرعی طور پر وہ ایک لڑکی سے شادی کر لیتا ہے جس کی عمر اٹھائیس برس ہے اس کے اس عمل پر پورا معاشرہ باتیں کرے گا۔ لوگ اتنے گندے نہیں ہوتے لیکن ان کا ذہن بہت گندہ ہوتا ہے۔ جب بندہ غلاظت تلاش کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ سب سے زیادہ غلاظت تو میرے ہی اندر ہے۔ جب پتہ لگ جائے کہ یہ میرا رویہ بنا ہوا ہے تو پھر جتنی جلدی ممکن ہو سکے اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کریں۔ لوگوں کے دلوں کے اندر گھس کر نہ دیکھیں بندہ جانیں اور اللہ تعالیٰ جانیں صرف نصیحت ہو سکتی ہے، ہاتھ سے روکا جا سکتا ہے، دل میں برا کہا جا سکتا ہے لیکن مہر نہیں لگائی جا سکتی کیا پتا وہ توبہ کر کے بخشا جائے اور جو فتویٰ لگانے والا ہے وہ رہ جائے۔

اللہ تعالیٰ کا انعام ہے کہ ہم تجدید کرتے ہیں ہمیں جب بھی احساس ہوتا ہے کہ ہمارا رویہ غلط ہے ہم اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شعور کی ایک نشانی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ ماضی میں لے جاتا ہے جس کی وجہ سے غلطیوں کی نشاندہی آسان ہو جاتی ہے۔ جس کے پاس شعور نہیں ہوتا وہ اپنی غلطیوں کی نشاندہی نہیں کر سکتا۔ جتنا ہم دوسروں کے کیڑے اور دل کا حال جاننے کی کوشش کرتے ہیں اگر اس سے آدھا بھی اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کریں تو بہت ساری غلطیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے، جو رویہ ہم دوسروں پر لگاتے ہیں اس کو اپنے اوپر لگانا چاہیے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دوسروں کی غلطی پکڑی جائے جبکہ ہماری معاف ہو جائے یہ رویہ جب دوسروں کی طرف جاتا ہے تو پھر یہ کھانے کا سودا بن جاتا ہے۔

انسان اپنے جیسے لوگ تلاش کر لیتا ہے اچھے بندے کے ساتھ ہمیشہ اچھے دوست ہوتے ہیں جو جتنا اعلیٰ انسان ہے اس کی مقناطیسیت اپنی طرح کے لوگوں کو اپنی طرف

کھینچ لیتی ہے جسے پنجابی میں کہا جاتا ہے کہ "کاواں دے یار کاں۔۔۔ تے عقاباں دے یار عقاب" کبھی دنیا میں کوے اور عقاب کی دوستی نہیں ہوتی۔ اگر آپ کوے ہیں تو پھر زندگی میں کبھی بھی آپ کو عقاب نہیں ملے گا اگر مل بھی جائے گا تو آپ اسے کوا بنانے کی کوشش کریں گے۔ اگر آپ عقاب ہیں تو پھر کووں کو بھی عقاب بنا دیں گے۔ ڈاکٹر رشید احمد کہتے ہیں کہ بچپن میں نے ایک دفعہ چینی چوری کی میری ماں نے میرے دونوں کان پکڑ کر مجھے اتنا کھینچا جتنا آج میں دنیا کو بلند نظر آ رہا ہوں۔ جب آپ عقاب بن جاتے ہیں تو پھر آپ کا دل کرتا ہے کہ میں ہر ایک کو پکڑ کر عقاب بنا دوں یہ بڑی مثبت بات ہے۔ بندے میں عادتیں بڑے انسانوں والی ہونی چاہئیں کیونکہ عادتیں اچھی ہوں گی تو اچھے لوگ زندگی میں آنا شروع ہو جائیں گے۔ عام طور پر لوگ یہ کہتے ہیں کہ مجھے گھر مل گیا، مجھے گاڑی مل گئی، مجھے پیسہ مل گیا یہ بڑے لوگوں والی باتیں ہیں بلکہ جس دن یہ دل سے نکل جائے کہ اے اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے اچھے لوگوں کی سنگت دی تو پھر سمجھ لیں کہ آپ انعام یافتہ ہیں۔ کیونکہ اچھے بندے کا برا بندہ بھی فائدہ کر جاتا ہے طارق بلوچ صحرائی اپنی کتاب "سوال کی موت" میں کہتے ہیں میرے والد مجھے میلہ دکھانے لے گئے جب سرکس کی ٹکٹ خریدنے لگے تو پاس ہی میاں بیوی آپس میں باتیں کر رہے تھے بیوی کہہ رہی تھی ہم بچے ملا کر سات بنتے ہیں جبکہ ٹکٹیں پانچ ہیں ہم کیا کریں شوہر نے کہا کہ ایک بچہ مجھے دے دو تم جا کر دیکھ لو میں اور بیٹا تمہارا انتظار کرتے ہیں پھر کہتا ہے کہ نہیں ہم یہی رہتے ہیں بچوں کو بھیج دیتے ہیں یہ سن کر میرے والد نے ان کے پاس پیسے گرا دیئے اور اس عورت سے کہنے لگے باجی یہ آپ کے پیسے گرے ہیں انہیں اٹھا لیں اس نے کہا یہ میرے نہیں ہیں والد صاحب نے کہا کہ میں نے خود انہیں گرتے دیکھا ہے عورت نے پھر کہا نہیں یہ ہمارے نہیں ہیں خیر والد صاحب نے ان کو پیسے دے دیئے انہوں نے اس کے ٹکٹ خرید لیے۔ والد صاحب مجھے کہنے لگے بیٹا آج نہیں ہم پھر سرکس دیکھیں گے دیکھا جائے تو بظاہر نقصان ہوا ہے لیکن جتنا فائدہ ہوا ہے اس کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ جو بندہ شعوری طور پر قربانی دینے کے لیے تیار ہوتا ہے وہ کبھی نہیں روتا۔

بڑی کامیابی کے ساتھ اگر بندہ شعوری طور پر بھی بڑا ہوا ہے تو پھر اصل کامیابی ہے۔ بندے کو اعلیٰ انسان بننا چاہیے اس کی عادات اعلیٰ ہونی چاہئیں۔ جیسے بھی ہو اپنے اندر بڑے انسانوں والی عادات پیدا کریں اگر آپ عادتیں نہیں مل رہیں تو حضور اکرمؐ کی سیرت مبارک پڑھیں۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ ایک شخص پر تلوار چلا رہے تھے سامنے والے شخص نے کلمہ پڑھ لیا انہوں نے پھر بھی تلوار ماردی جب آپ ﷺ کو اس بات کا پتا چلا تو آپ نے ان صحابی رضی اللہ عنہ سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اس نے موت کے ڈر کی وجہ سے کلمہ پڑھا آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا ہے تم کون ہوتے ہو یہ فیصلہ کرنے والے کہ اس نے کلمہ خوف سے پڑھا تھا یا خوف کے بغیر پڑھا۔

ہمارے معاشرے میں شاہینوں کو پھلنے پھولنے نہیں دیا یہاں پر لوگ سونے کی قینچی پہنے ہوئے سیٹھ سے اپنے کاروبار کا افتتاح کرواتے ہیں۔ ہم اپنے سکولوں میں ایسے منسٹرز سے بچوں کو انعام دلواتے ہیں جن کے بارے میں ہمیں پتا ہوتا ہے یہ ملک کا نقصان کر رہا ہے۔ ہمارے گھر میں جو بڑھیا ہوتی ہے جس کو ہم ماں کہتے ہیں اس سے انعام نہیں دلواتے حالانکہ ان کا سب سے زیادہ حق ہوتا ہے کیونکہ اصل منسٹر تو ماں ہوتی ہے۔ جو بندہ اپنے والدین کو وزیر اعظم والی عزت نہیں دے سکتا تو وہ بہت چھوٹا انسان ہے۔ یہ ٹرینڈ بننا چاہیے کہ شاہینوں کے گروپ بنیں جو لوگوں کو شاہین بنائیں اور لوگ انہیں دیکھ کر شاہین بنیں جب تک یہ ٹرینڈ نہیں بنتا معاشرہ گھاٹے کی طرف جاتا رہے گا اور مردار پیدا ہوتے رہیں گے۔ یہ معاشرہ کبھی کھلاڑی کو ہیرو سمجھتا ہے، یہ کبھی فلم بنانے والے کو ہیرو سمجھتا ہے، کبھی ہیروں کو ماننے لگ پڑتا ہے جب تک ہم طے نہیں کرتے کہ اصل ہیرو حکیم سعید ہیں، عبدالستار ایدھی ہیں، ٹیپو سلطان ہیں تب تک اس معاشرے میں کوے پیدا ہوتے رہیں گے اس کا صرف ایک طریقہ ہے پہلے خود شاہین بنیں کیونکہ خاندان میں ایک شاہین بننے سے پوری نسل شاہین بن جاتی ہے پھر غیرت اور خودداری نسلوں تک جاتی ہے۔

انسان بڑی مشکل سے سوا لاکھ ہو کر یہاں تک پہنچا ہے یہاں تک پہنچنے میں اس

کے ناخن کھرچے گئے ہیں اگر آپ سولائزڈ ہو کر ایک سولائزڈ نسل نہیں دیتے تو پھر اس کا مطلب ہے آپ نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی۔ سولائزیشن کا سب سے بڑا کمال یہ ہوتا ہے کہ کمال انسان بنے اور کمال انسان بنائے۔ ہر بندہ کسی حد تک استاد ہوتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے سے منسلک لوگوں کو تیار کرے۔ چلتے پھرتے خاموش نیکی کرنی چاہیے اگر راہ جاتے کوئی بندہ مسئلے میں پھنسا نظر آئے تو اس کے مسئلے کو حل کرنا چاہیے یہ بہت مثبت پہلو ہے۔

دنیا میں مذہب کے پیمانے بہت بعد میں آئے، مذہب کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں ہے۔ انسان کو الہامی کتاب کو سہارنے کیلیے بھی بہت وقت لگا، انسان تو چودہ سو سال پہلے قرآن مجید کو سمجھنے کے قابل ہوا۔ شروع کی کتابوں میں لمبے چوڑے اصول نہیں تھے جبکہ قرآن مجید مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جب انسان اس قابل ہوا کہ وہ زندگی کو سمجھ سکے تب قرآن مجید نازل ہوا۔ شروع میں نہ کوے تھے نہ شاہین تھے یہ معیار بہت بعد میں جا کر بنے ہیں ایسے کمال کے انسان پیدا ہوئے کہ انہوں نے بتایا کہ شاہین کیا ہوتا ہے۔ اقبال نے شاہین کا تصور دیا اس تصور تک آنے میں انسان نے ہزاروں سال کا سفر طے کیا ہے۔ انسان پہلے آیا پیمانے بعد میں بنے ہیں۔ انسان اتنا محدود ہے وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جتنا بھی گمان کرے گا وہ محدود ہی ہوگا کتھے مہر علی۔۔۔ کتھے تیری ثنا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ گمان میں احساس شامل ہونا چاہیے وہ احساس یہ کہ جس طرح ماں بچے سے پیار کرتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔

کورا اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ایک بندہ ساحل سمندر پر جا رہا تھا اور اللہ تعالیٰ سے گلہ کرتا ہے کہ اس وقت تو میرے ساتھ نہیں تھا اسے جواب ملتا ہے تو نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تیرے قدموں کے علاوہ بھی نشان تھے اس نے کہا ہاں تھے جواب ملا وہ میرے ہی تو تھے، بندہ کہتا جب تیز لہر آئی تو اس وقت تو صرف میرے ہی قدموں کے نشان تھے اس وقت تیرے قدموں کے نشان کہاں تھے جواب ملتا ہے تب میں نے تمہیں اٹھا لیا تھا اس کا مطلب ہے زندگی میں جب ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

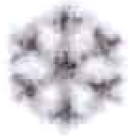
کی ذات ہمارے ساتھ نہیں ہے اس وقت وہ سب سے زیادہ ہمارے ساتھ ہوتی ہے۔ ہم اپنے مخلص دوست سے کتنی توقعات لگاتے ہیں اور بات آئے اللہ تعالیٰ کی تو توقعات کی اور معیار گر جائے کتنی عجیب بات ہے۔ لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی ذات سے تعلق کا معیار بہت کم تر ہوتا ہے قصور وار وہ خود ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ کی ذات تو رحمت ہی رحمت ہوتی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے اس کی رحمت ہو رہی ہو اور جواب میں بندہ گلہ کر رہا ہو وہ سراپا محبت ہو اور بندے کے شکوے ختم نہ ہوں۔

یہ فیض ہوتا ہے آپ اپنے سے بہتر ویژن اور یقین والے کے پاس بیٹھیں تو آپ کو لگے گا کہ اللہ تعالیٰ میرے قریب ہے۔ ایک بزرگ کے پاس ایک شخص چلا گیا اور ان سے کہا کہ مجھے اتنا عرصہ ہو گیا ہے مجھے فیض نہیں ملا بزرگ کا مرید بزرگ کو ہوا دے رہا تھا بزرگ نے اس شخص سے کہا کہ آپ کو ہوا آ رہی ہے اس نے کہا جی آ رہی ہے بزرگ نے کہا یہ ہوا کس کو دے رہا ہے اس شخص نے کہا آپ کو بزرگ نے کہا کہ ہوا کیسے آ رہی ہے اس نے جواب دیا ہم دونوں کو ہوا آ رہی ہے بزرگ فرمانے لگے کہ فیض یافتہ کے ساتھ جڑے ہوئے کو بھی وہی ہوا آتی ہے جو فیض یافتہ کو آتی ہے۔

حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں "فیض یافتہ اپنے فیض میں دوسروں کو شامل کرتا ہے تو فیض قائم رہتا ہے"۔ کیا کمال ہے کہ مجھے پتا ہے میں اپنی روٹی میں شامل کروں گا تو میری روٹی بچے گی تو پھر میں اپنے ساتھ ضرور شامل کروں۔ کسی کا بھی دل نہیں کرے گا کہ وہ اپنے فیض کو کم کرلے۔ بندہ تلاش کریں جس کے پاس اللہ تعالیٰ کی یاد ہے، جس کے پاس توکل زیادہ ہے، جس کے پاس ایمان زیادہ ہے۔ بعض لوگ معاشرے میں چل پھر رہے ہوں لیکن فکر مند لگ رہے ہوتے ہیں لیکن کئی ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کو کوئی فکر نہیں ہوتی ان کا نہ ماضی ہوتا ہے اور نہ مستقبل ہوتا ہے وہ حال میں ہوتے ہیں۔ جو اپنے حال کو بچا نہیں سکتا وہ دوسروں کو حال میں کیسے لا سکتا ہے۔

ایسے لوگوں سے بچیں جو آپ کو جج کرنے والا بنائیں، ایسے لوگوں سے بھی بچیں جو آپ کو چلے کے چکر میں ڈال دے ایسے لوگوں کے پاس جائیں جو آسانیاں پیدا کریں۔ ایک بندہ سو جگہ پر ٹھوکریں کھا کر منزل پر پہنچتا ہے لیکن وہ اپنے شاگرد کو آسان

راستہ بتائے گا۔ سب سے بڑا طوفان وہ ہوتا ہے جو بندے کے اندر کی کفر کی جھوٹیاں اڑا دے اور ایمان کے محل بنادے اور بندے کو پتا بھی نہ لگے پھر وہ بندہ بعد میں بیٹھ کر سوچے کہ وہ شخص میرا استاد نہیں تھا وہ تو کوئی طوفان تھا۔ حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں "اگر تمہاری زندگی میں کوئی صحیح بندہ آ گیا تو پہلے ہی معافی مانگ لینا اور کہنا کہ آپ بہتر ہیں" آپ مزید فرماتے ہیں کہ "جس میں عقل دیکھو اس پر عقل مت لگاؤ"۔



مایوسی کیسے ختم کی جائے؟

"انسان کو زندگی میں کچھ کرنے کیلئے انسپائریشن کی ضرورت ہوتی ہے یا مایوسی کی!"

ٹونی روبنس

یہ فطری قاعدہ ہے کہ زندگی پہلے ملتی ہے اور عقل بعد میں آتی ہے۔ جس طرح انسان کا بچپن سے جوانی تک کا سفر بڑھوتری کے ذریعے ہوتا ہے، بالکل اسی طرح عقل بھی رفتہ رفتہ بڑھتی ہے۔ جیسے جیسے انسان کی ذہنی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا ہے، ویسے ویسے اسے زندگی کے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر انسان کی صلاحیت کم ہو تو مسئلہ بڑا ہو جاتا ہے اور اگر صلاحیت زیادہ ہو تو مسئلہ چھوٹا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ایک مسئلہ کسی کیلئے بہت بڑا ہو سکتا ہے جبکہ وہی مسئلہ کسی دوسرے کیلئے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ کسی مسئلے کے چھوٹے اور بڑا ہونے کا تعلق اس کی عقل سے براہ راست ہے۔

اپنے مسائل کو نفسیاتی عارضہ نہ بننے دیجیے

جب انسان کا مسائل کے ساتھ واسطہ پڑتا ہے اور وہ انھیں حل نہیں کر پاتا تو پھر وہ ناامید اور مایوس ہو جاتا ہے۔ مایوسی عموماً اٹھتی تو اندر سے ہے، لیکن پیدا باہر سے ہوتی ہے۔ نفسیات یہ کہتی ہے کہ نارمل انسان حالات تبدیل ہونے سے پریشان ہوتا ہے۔ کچھ مخصوص لوگ پیدائشی طور پر حساس ہوتے ہیں۔ وہ بغیر کسی سبب کے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پہلے یہ احساس کم ہوتا ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ وہ نفسیاتی مریض بن جاتے ہیں۔

انسان کو پوری زندگی سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو ایک دوسرے کے سہارے اور مدد کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ ماں اس کا پہلا سہارا بنتی ہے اور وہ طویل عرصہ اس کی گود میں کھیلتا ہے۔ پھر اسے باپ کی شفقت ملتی ہے۔ پھر بہن بھائی ملتے ہیں۔ اسکول میں دوست ملتے ہیں۔ جب وہ بڑا ہوتا ہے تو نئے رشتے بناتا ہے۔ یہ ساری چیزیں اسی لیے ہوتی ہیں کہ انسان کا انحصار دوسروں پر ہوتا ہے۔ انسان کو زندگی گزارنے کیلئے دوسرے انسانوں کی ضرورت رہتی ہے۔ لیکن مایوس انسان جب مایوس ہوتا ہے تو وہ دوسروں سے مدد لینے میں شرم محسوس کرتا ہے۔ دوسروں سے مدد لینے کیلئے خود اعتمادی کی ضرورت ہے، لیکن مایوسی اس کے اندر احساسِ کمتری پیدا کردیتی ہے۔

اپنے مسائل ذکر کیجیے

قابل بھروسا لوگوں سے اپنے مسائل ذکر کرنے سے مسائل کی شدت میں کمی آتی ہے۔ انسان میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ جب وہ اپنا دکھ شیئر کرتا ہے تو اس کا دکھ کم ہوجاتا ہے، اس لیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کسی کے کندھے کی ضرورت پڑجائے تو اس سے مدد کا کہنا چاہیے۔ باباجی اشفاق احمدؒ فرماتے ہیں، "پاکستان کے ہر فرد کو ایک کندھے کی ضرورت ہے۔ وہ فرد اس کندھے پر سر رکھے، چند آنسو بہائے اور دوبارہ سے زندگی کی جنگ لڑنے کیلئے تیار ہو اور روانہ ہوجائے۔"

تنہائی پسند لوگ مایوسی کا شکار زیادہ ہوتے ہیں، کیونکہ تنہائی کی وجہ سے ان کی طبیعت میں غبار بن جاتا ہے۔ پھر شیئرنگ نہ کرنے کی وجہ سے ان میں چڑچڑاپن آجاتا ہے۔ نیز، یہ لوگ کسی پر بھروسا بھی نہیں کرتے۔ ایسے لوگ اچھے چہروں کی شناخت نہیں کرپاتے۔ یہ تنہائی نفسیاتی عارضہ بنتے بنتے بڑی اذیت میں لے جاتی ہے۔

دوسروں سے توقعات

مایوسی کا ایک عام سبب انسان کا دوسرے کسی انسان سے توقع رکھنا بھی ہے۔ انسان دوسرے انسانوں سے توقعات لگاتا ہے، لیکن توقعات کا پورا نہ ہونا عام سی بات ہے۔ اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان یہ سمجھے کہ کہاں پر توقع لگانی

ہے اور کہاں نہیں لگانی۔ بہت سے لوگ کسی کے مزاج کو سمجھے بغیر توقع لگا لیتے ہیں تو جب وہ پوری نہیں ہوتی تو انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی توقعات کو کم کرلیں تو انہیں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے انسان موسم کا انتظار کرتا ہے، پھر فصل بوتا ہے، پھر کاٹنے کا انتظار کرتا ہے اور کاٹنے کے بعد اس کا دام لیتا ہے۔

جب انسان پریشان ہوتا ہے تو وہ سمجھ نہیں پاتا کہ جو چیز نہیں ہو رہی وہ کیوں نہیں ہو رہی۔ جب اس کے پاس جواز نہیں ہوتا تو نتیجتاً پریشان ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان خواب دیکھتا ہے اور وہ پورا نہیں ہوتا۔ اس سے بھی وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ اس نے محنت بہت کی ہوتی ہے لیکن اگر نتیجہ حسب توقع نہیں ملتا، تب بھی پریشان ہو جاتا ہے۔

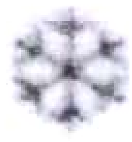
خیالات اور حالات

پریشانی کا تعلق انسانی خیالات اور دنیاوی حالات دونوں سے ہے۔ بعض اوقات حالات سے پریشانی آتی ہے اور خیالات اس پریشانی کو ہوا دے کر بہت زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔ جب انسان کو اپنی صلاحیتوں کا پتا لگ جاتا ہے تو اس کی پریشانی اور مایوسی دونوں کم ہونے لگتی ہیں۔ دنیاوی حالات کے اثرات سے بچاؤ اور خیالات کو کنٹرول کرنے کیلیے مائنڈفلنس کی مشقوں کی عادت ڈالیے۔

مسائل آنے سے پہلے مسائل کو دیکھئے

بعض لوگ ہر سال ایک طرح کے مسائل میں پھنسے رہتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خود کو بہتر نہیں کر رہے۔ انھوں نے اپنے گزشتہ برس اس مسئلے کو حل کرنے کیلیے پیش بندی نہیں کی۔ عقل مند انسان وہ ہے جو آنے والے مسائل کی پیش بندی کرلے۔ "دیکھا جائے گا" یا "اللہ مالک ہے" والا مزاج پریشانیاں لاتا ہے۔ جو لوگ پیش بندی کرتے اور مسائل کے حل کیلیے وقت سے پہلے تدبیر کر لیتے ہیں، وہ بہت سی پریشانیوں سے بچ جاتے ہیں۔

بعض اوقات مسائل کی نوعیت بدلتی رہتی ہے، اس لیے مسئلوں کی شکل کا بدلنا اس بات کی علامت ہے کہ آپ پہلے والے مسئلوں کا شکار نہیں ہیں اور زندگی میں آگے بڑھ رہے ہیں اور نئے نئے چیلنجز کا سامنا کر رہے ہیں۔ یاد رکھیے، مسائل ختم نہیں ہوتے، مسائل بدلتے ہیں۔ اور، بدلتے مسائل کے ساتھ ان سے نمٹنے کیلئے ہمیں اپنی حکمت عملی بھی بدلنے کی ضرورت پڑتی ہے۔



قوموں کی ترقی کا راز

''اگر ٹیکس بڑھتے رہے تو معاشی ترقی گھٹتی رہے گی!''

پال ریان، امریکی سیاستدان

دنیا میں جتنے جذبے ہیں، جتنے افکار ہیں، جتنے نظریے ہیں، ان سب کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اظہار برتاؤ (Behavior) سے ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ تعالی کو ماننا یادداشت کا سوال نہیں ہے، یہ برتاؤ سے ظاہر ہوتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا اظہار آپ کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگر لوگوں کے صرف اظہار کو دیکھ لیا جائے تو اُن کے اظہار سے ان کی شخصیت کا پتا لگایا جاسکتا ہے۔ آج سائنس یہ مان چکی ہے کہ جو بولا جا رہا ہے، اسے آخری نہیں سمجھنا چاہیے اور جو نہیں بولا جا رہا، اسے زیادہ سمجھنا چاہیے۔ کیوں کہ آدمی جو کچھ الفاظ سے ادا کرتا ہے، وہ صرف سات فیصد ہوتا ہے جب کہ باقی ستانوے فیصد پیغام اس کی زبان سے ادا ہی نہیں ہوتا، اس کے اعضا و جوارح بیان کرتے ہیں۔ اسے Non-verbal language کہا جاتا ہے اور یہ ہمارے کل برتاؤ سے ظاہر ہوتا ہے۔

اپنی ذات کی بہتری پر سرمایہ کاری

کسی بھی شعبے کا معیار بہتر کرنے کیلئے ٹریننگ اشد ضروری ہوتی ہے۔ دنیا مان چکی ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزیں سیکھنے کی بہت اہمیت ہے۔ بات کیسے کرنی ہے، گفتگو کے درمیان اپنی بات کیسے رکھنی ہے، کپڑے کس طرح کے پہننے ہیں، کون سا رنگ مناسب ہے، کیسے محسوس کراتا ہے، عام چیز کو خاص کیسے بنانا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ زندگی میں کامیابی اور ہر دل عزیزی کیلئے ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کا کردار بہت اہم ہے۔

پس ماندہ ممالک میں ذاتی بہتری (پرسنل ڈیولپمنٹ) سے متعلق کوئی کام نہیں ہے۔ ترقی پذیر میں اس حوالے سے تھوڑا بہت کام مل جائے گا، جیسے پاکستان کہ جہاں چند گنے چنے لوگوں کو اپنی ذات کو بہتر بنانے کا شعور حاصل ہے۔ لیکن ترقی یافتہ ممالک میں اسے باقاعدہ ''ٹریننگ انڈسٹری'' کا درجہ حاصل ہے، کیونکہ انھیں پتا ہے کہ ہمیں اپنے معاشرے کو آگے لے کر جانا ہے اور معاشرے کو آگے لے کر جانے کیلئے معاشرے کی سوچ بدلنی پڑے گی۔ اور سوچ بدلنے کیلئے کا طریقہ کار یہ ہے کہ اپنی ذاتی نمو اور بہتری پر کام کیا جائے اور کرایا جائے۔ ایک سروے کے مطابق، امریکا میں ایک دن میں ایک لاکھ سیمینارز ہوتے ہیں۔

پاکستان کا شمار بھی ترقی پذیر ممالک میں ہوتا ہے۔ یہاں بھی اس حوالے سوچ بن رہی ہے۔ فی الوقت پاکستان آرمی اور سول سروسز میں یہ ٹریننگ دی جاتی ہے۔ لیکن عام معاشرے میں یہ شعور ناپید ہے۔ ہمیں اگر اپنے معاشرے کو بہتر کرنا ہے اور اپنے ملک کو ترقی دینی ہے تو اپنے اپنے حلقوں میں اس کام کا آغاز کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ جب تک فرد بہتر نہیں ہوگا، معاشرہ نہیں بدلے گا۔ معاشرہ نہیں بدلے گا تو کوئی بھی ملک، کوئی بھی ادارہ، کوئی بھی گھر بہتر نہیں ہوسکتا۔ جس شخص نے اپنی زندگی میں اپنے لیے ٹریننگ کا بٹن دبا دیا ہے تو سمجھئے کہ اس نے ترقی کرنا شروع کر دی ہے۔ وہ بہتری اور اس کے نتیجے میں ترقی کے راستے پر چل پڑا ہے۔

عظیم ترین خدمت

ہمارے ملک کا ڈاکٹر بیماروں کے علاج کے ذریعے ملک کی خدمت کر رہا ہے، ہمارے ملک کا استاد پڑھا کر ملک کی خدمت کر رہا ہے، ہمارے ملک کا بیوروکریٹ اپنی نوکری سے ملک کی خدمت کر رہا ہے۔ ہمارے ملک کا جج انصاف دلا کر ملک کی خدمت کر رہا ہے۔ ہمارے ملک کا سپاہی سرحد پر کھڑا ہو کر ملک کی خدمت کر رہا ہے، ہمارے ملک کا سائنسدان نئی ایجاد کر کے ملک کی خدمت کر رہا ہے، ہمارے ملک کا ادیب اپنے قلم سے ملک کی خدمت کر رہا ہے، ہمارے ملک کے علما منبر پر بیٹھ کر ملک کی خدمت کر

رہے ہیں۔ ان سب خدمات میں سب سے بڑی خدمت تعلیم اور شعور ہے۔ دنیا میں جتنے رسول اور پیغمبر آئے، انھوں نے یہی فریضہ سرانجام دیا۔ انھوں نے اپنے زمانے کے افراد کی سوچ کو بدلا، انہوں نے وقت کے فرسودہ نظریات کو بدلا، انہوں نے غلط افکار کو بدلا۔ اس لیے استاد کا درجہ ان تمام میں سب سے بلند ہے... اگر وہ اپنے مقام کی بلندی کا احساس کرلے۔

تعلیم سے زیادہ اہم تربیت

دوسری جانب یہ بھی بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمارا تعلیمی نظام وہ نہیں جو ہونا چاہیے۔ اس کی بنیاد رٹے پر ہے۔ یہاں طالبعلم اپنی یادداشت کی بنیاد پر ڈگری لیتا ہے، اپنی فہم کی بنیاد پر نہیں۔ اس وجہ سے کوئی تبدیلی نہیں آرہی۔ تبدیلی اس لیے نہیں آرہی کہ آج کی تعلیم رویے اور برتاؤ پر اثر انداز نہیں ہورہی۔ پانی اس زمین تک جا ہی نہیں رہا جہاں تک اسے سیراب کرنا چاہیے۔ وہ راستے ہی میں رک جاتا ہے اور تالاب کی صورت اختیار کرلیتا ہے۔ تعلیم دینے والا علم کو وہاں تک پہنچاتا ہی نہیں ہے جہاں پہنچنے کے بعد انسانی رویے میں تبدیلی آتی ہے۔

باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے

ہمارے تعلیمی نظام میں پڑھانے والے اساتذہ میں نوے فیصد اساتذہ ایسے ہیں جن کا بات چیت کا انداز ہی ٹھیک نہیں ہے۔ جب اس کا کھوج لگایا جاتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ ان کی بنیاد میں یہ بات شامل ہی نہیں ہے۔ کسی کا کورس، کسی کی بیالوجی، کسی کی کیمسٹری، کسی کی فزکس تو چیک کی جاتی ہے، لیکن اس کے ابلاغ کی صلاحیت چیک نہیں ہوتی۔ تیرنے والے کو تیرنا آتا ہے، مالی کو گوڈی کرنی آتی ہے، لیکن استاد کو پڑھانا نہیں آتا۔

کس قدر المیہ ہے کہ جس نے نسلوں کی آبیاری کرنی ہے، اس کی اپنی آبیاری نہیں ہوئی۔ جس نے نسلوں کو شعور دینا ہے، اس کا اپنا شعور سویا ہوا ہے۔ جب استاد کا حال یہ ہے کہ تو وہ اپنے شاگردوں کو کیا "حال" منتقل کرے گا۔ جب استاد ہی

کہ بنیادی اخلاقیات کا پتا نہیں تو وہ آنے والی نسل کو کیسے اعلیٰ تر اخلاق سکھا سکتا ہے۔

رویہ۔ آپ کی توجہ اور محنت کا متقاضی

دنیا میں تمام انقلابات ہمیشہ رویوں سے شروع ہوئے ہیں۔ وہ تمام واقعات جنہیں ہم بڑے فخر سے بیان کرتے ہیں، غور تو کیجیے کہ یہ سب تربیت کا نتیجہ تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شاگردوں یعنی صحابہ کرام کو کوئی ڈگری نہیں دی تھی مگر ان کی تربیت ایسی کی تھی کہ پھر جو کردار بنا، اس نے ارضِ عرب ہی نہیں، پوری کرہ ارض میں انقلاب برپا کر دیا۔ انسانی کردار اصل ہے۔ جب تک کسی نسل کا، کسی قوم کا، کسی ملک کا کردار نہیں بنے گا، اس وقت تک بہتر مستقبل حاصل نہیں ہوگا۔ اسٹیفن آر کوے کہتا ہے، "دنیا میں انسان کا بنایا ہوا قانون توڑا جا سکتا ہے لیکن قدرت کے بنائے ہوئے قانون کو نہیں توڑا جا سکتا۔ جو بھی قدرت کے بنائے ہوئے قانون کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے، وہ خود ٹوٹ جاتا ہے۔" جس طرح گریویٹی یعنی زمین کی کشش کا قانون ہے۔ انسان جتنی مرضی کوشش کر لے، اس قانون کو نہیں توڑ سکتا۔ اسی طرح، قدرت کا قانون یہ ہے کہ سوچ اور افکار اور نظریات بدلے بغیر کچھ بدلا نہیں جا سکتا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھ کر رویا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں وہی عمر ہوں جو بکریاں نہیں چرا سکتا تھا۔ یہ تربیت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ جس نے عمر کو اس قابل بنایا۔

ترقی اور کامیابی کا اصل راز

جب تک ہم سوچ کو، افکار و نظریات کو بدلنے پر کام نہیں کریں گے، اس وقت تک کسی قسم کا انقلاب نہیں آنے والا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس طرح کی توفیق دی ہے، اسے عمل میں ضرور لائیں۔ اسٹیفن آر کوے کے بقول، مچھلی پکڑ کر کھلا دینا بہت بڑی زیادتی ہے کہ اس سے تو ایک وقت کی بھوک ختم ہوتی ہے لیکن بڑی نیکی یہ ہے کہ آپ کسی کو مچھلی پکڑنا سکھا دیں۔ یہ پورا ایک فلسفہ ہے جس میں بہت گہرائی ہے۔ اگر مچھلی دینے کی بجائے اسے مچھلی پکڑنا سکھاتے ہیں تو گویا آپ بھیک دینے کی بجائے اسے

خود کمانے کے قابل بنا دیجیے تا کہ وہ ساری زندگی بھیک نہ مانگتا رہے۔ غیرت مند اور ترقی یافتہ اقوام میں مانگنا ایک جرم ہے اور انسانی خودداری کے خلاف بھی۔ جب آپ کسی کو مچھلی پکڑنا سکھا دیں تو وہ خوددار ہو جائے گا اور اس کی خودداری اسے اس قابل کر دے گی وہ دوسروں کو بھی مچھلی پکڑنے والا بنا دے۔



زندگی کے سات درخت

"کامیاب اور ناکام لوگوں کے درمیان سب سے بڑا فرق اپنی نمو کا ہوتا ہے!"

جان سی میکسویل

ہم درخت سے دو چیزیں لیتے ہیں: ایک چھاؤں، دوسرا پھل۔ چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے جبکہ پھل میٹھا ہوتا ہے۔ جس باغ میں، جس علاقے میں جتنے زیادہ درخت ہوتے ہیں، اتنا زیادہ مواقع چھاؤں اور پھلوں کے حصول کے ہمارے پاس ہوتے ہیں۔ اس شخص کی زندگی میں راحت اور طمانیت ہوگی جس کی زندگی کے آنگن میں یہ سات درخت ہیں۔ لوگ زندگی میں سات درخت نہیں لگاتے۔ اگر ہمیں زندگی میں ٹھنڈی چھاؤں اور میٹھا پھل لینا ہے تو ہمیں زندگی میں مندرجہ ذیل سات درخت لگانے پڑیں گے:

1)۔ معاش کا درخت

عموماً لوگ صرف ایک ہی درخت لگاتے ہیں اور اسی کی چھاؤں اور پھل کو کامیابی سمجھتے ہیں۔ یہ درخت "معاش" کا درخت ہے۔ انسان اپنی زندگی میں سب سے زیادہ اہمیت معاش کے درخت کی چھاؤں اور پھل کو دیتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچے کی تعلیم، نگہداشت، اور اس کے بعد تمام تر کاوشیں پیسہ کمانے کیلئے ہی ہوتی ہیں۔ اسی درخت کی آبیاری پر آدمی اپنی تمام تر توجہ اور توانائیاں صرف کرتا ہے۔ اس درخت سے زیادہ سے زیادہ پھل حاصل کرنا یعنی زیادہ سے زیادہ پیسہ کمانا اس کا مقصد اولیں

ہوتا ہے۔ یہ بہت عام بات ہے کہ روزانہ زندگی کے زیادہ تر اوقات فکر معاش میں گزر جاتے ہیں۔ معاش کے درخت کی دیکھ بھال فطری قوانین کے مطابق کرنا ضروری ہے۔ مثلاً آپ نے بہت سوں کو دیکھا ہوگا کہ دن رات پیسہ کمانے کی فکر میں غلطاں رہتے ہیں اور پھر بھی معاشی مسائل سے پریشان ہوتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ معاش کے درخت کو جس کھاد اور پانی کی ضرورت ہے، وہ فراہم ہی نہیں کیا جا رہا۔

ہم میں سے اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بہت پیسہ کما لیا جائے تو معاشی خوش حالی آ جائے گی۔ یہ خیال غلط ہے۔ معاشی خوش حالی کا تعلق پیسے کی زیادتی سے نہیں، پیسے کی تنظیم سے ہے۔ اگر آپ اپنی زندگی میں معاشی خوش حالی چاہتے ہیں تو پیسہ کمانے کی مہارت سے کہیں اہم یہ ہے کہ Money Management سیکھی جائے۔ آپ جب تک پیسہ کو منظم کرنا نہیں سیکھیں گے، پیسے کے مسائل میں دھنستے چلے جائیں گے۔

2)۔خدمت کا درخت

جو سکون بانٹنے میں ملتا ہے، وہ کمانے میں نہیں ملتا۔ یہ شاید اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت بھی بانٹنا ہے۔ زندگی میں دوسرا درخت ''خدمت'' کا درخت ضرور لگائیے۔ میر حسین صاحب کہتے ہیں کہ جو آدمی یہ کہتا ہے کہ میں امیر ہو جاؤں گا تو بانٹوں گا تو وہ کبھی نہیں بانٹے گا، کیونکہ جب وہ امیر ہو جائے گا تو اُس وقت اسے بانٹنے کا حوصلہ ہی نہیں ہوگا۔ جو شخص آدھی روٹی خود کھاتا ہے اور آدھی بانٹ دیتا ہے، وہ عظیم انسان ہوتا ہے۔

خدمت کا قطعی مطلب یہ نہیں ہے کہ پیسے ہوں تو خدمت ہوگی۔ خدمت تو مزاج سے تعلق ہے۔ حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے، ''غنا (دولت مند ہونا) دل کی کیفیت کا نام ہے اس کا مال کی زیادتی سے تعلق نہیں ہے۔ خدمت کا مطلب ہے کہ میں جو کچھ کسی دوسرے کیلئے کر رہا ہوں، اس کا معاوضہ مجھے اس انسان سے نہیں لینا، نہ اس کی طلب بھی ہے۔ اس کا معاوضہ مجھے اس کے خالق اللہ تعالیٰ سے ملتا ہے۔

خدمت میں چوکیداری نہیں کرنی۔ بس، نیکی کرنی ہے اور دریا میں ڈال دینی ہے۔

خدمت عقل کی زکوۃ ہے۔ یہ فہم کی زکوۃ ہے۔ یہ ذہانت کی زکوۃ ہے۔ یہ انسانی عظمت کی زکوۃ ہے۔ اگر میٹھا پھل کھانا ہے اور ٹھنڈی چھاؤں لینی ہے تو پھر یہ خدمت صرف اللہ تعالیٰ کیلئے ہونی چاہیے۔

3)۔ فیملی کا درخت

آپ کی فیملی، آپ کا خاندان بہت اہم ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھئے۔ اس کی ضروریات کو اہم سمجھئے۔ فیملی کی تین ضروریات ہوتی ہیں۔ عموماً ہم ایک ضرورت کو پورا کر کے دو سے کنارہ کشی کر جاتے ہیں۔ پہلی ضرورت پیسہ ہے تاکہ مادی ضروریات کی تکمیل کی جا سکے۔ دوسری ضرورت توجہ ہے۔ توجہ کا مطلب ہے کہ بیوی بچوں کی تمام چیزوں سے تعلق۔ تیسری ضرورت قربانی ہے۔ تعلق کی قیمت قربانی ہے۔ تعلق قربانی مانگتا ہے۔

وہ لوگ جو ان تینوں میں سے ایک ضرورت پوری کرتے ہیں، باقی کو اہمیت نہیں دیتے، وہ اپنے گھر والوں سے زیادتی کرتے ہیں۔ ان کا درخت کبھی بھی میٹھا پھل اور ٹھنڈی چھاؤں نہیں دیتا۔

4)۔ پیشے کا درخت

زندگی میں انسان کا زیادہ تر وقت دو چیزوں کے ساتھ گزرتا ہے۔ ایک پیشہ، دوسرا بیوی۔ اس لیے دونوں کا انتخاب سو مرتبہ سوچنے کے بعد کرنا چاہیے۔ ہمیں دنیا کا کوئی کام کرنا ہو، چاہے کپڑے خریدنے ہوں، جوتے خریدنے ہوں یا کوئی اور شے ہو، اس کیلئے سو لوگوں سے مشورہ کرتے ہیں... لیکن جس کے ساتھ ہمیں ساری زندگی گزارنی ہے، وہ دو چیزیں ہیں... ہمارا پروفیشن اور ہماری زوجہ۔ ہم ان دونوں کے بارے میں مشورہ کرتے ہیں اور نہ رہنمائی لیتے ہیں۔

انسان کو اللہ تعالیٰ نے انتخاب کی طاقت دی ہے۔ یہ قوت کسی اور مخلوق کو عطا نہیں کی گئی۔ انسان جب اپنے پیشے کا انتخاب کرتا ہے تو اس انتخاب میں غلطی ہو سکتی ہے، بلکہ اکثر ہوتی ہے۔ ممکن ہے، نوکری کے مزاج والا کاروبار کر رہا ہو، ممکن ہے، کاروباری

مزاج والا نوکری کرتا ہو۔ ممکن ہے، نوکری جس طرح کی چاہیے تھی، ویسی نہ ہو۔ ممکن ہے، کاروبار جس طرح کا چاہیے تھا، ویسا نہ ہو۔ لیکن اس بارے میں سوچنا ضرور چاہیے اور ماہر فرد سے مشورہ ضرور کرنا چاہیے۔

زندگی کے سفر میں اگر غلط ٹرین میں بیٹھے ہوں تو اسی ٹرین میں غلط منزل پر سفر جاری رکھنے سے کہیں بہتر ہے کہ اتر کر صحیح ٹرین پکڑنے میں شرم محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ اپنی زندگی میں چیزیں چھوڑنے کی طاقت، ہمت اور جرات پیدا کیجیے، کیونکہ جو چھوڑ سکتا ہے، وہی آگے جا سکتا ہے۔ ایک ہی کھونٹے سے بندھے رہنے سے ایک ہی دائرہ میں زندگی گھومتی رہتی ہے۔

جس پیشے سے آدمی کو لطف نہیں ملتا، وہ پیشہ سوالیہ نشان ہے۔ جیسے ہم سفر اگر راحت رساں نہ ہو تو آدمی جلد اکتا جاتا ہے اور نشست بدلنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح، آپ کا پیشہ بھی آپ کا ہم سفر ہے۔ اگر آپ کو اپنے پیشے میں راحت نہیں مل رہی، آپ جو کام کرتے ہیں، اسے سوچتے ہی تھکن ہونے لگتی ہے تو آپ کا موجودہ پروفیشن آپ کیلئے سوالیہ نشان ہے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ''دوست سے سکون نہیں ہے اور دشمن سے تکلیف نہیں ہے تو پھر نہ دوست، دوست ہے اور نہ دشمن، دشمن۔''

5)۔ ساکھ کا درخت

اس میں کوئی شک نہیں کہ عزت اور ذلت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لیکن کچھ اختیار اللہ نے بندے کو دیے ہیں اور عزت کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ اس لیے ہمیں وہ کام کرنے چاہئیں جو عزت کا سبب بنیں اور ان کاموں سے بچنا چاہیے جو عزت پر آنچ لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ یہ کام عزت والے ہیں اور یہ ذلت والے ہیں۔

انسان کیلئے عزت اس کی سب سے اہم چیزوں میں سے ہوتی ہے۔ آدمی پیسہ کمانے کیلئے دن رات ایک کرتا ہے، لیکن بعض اوقات عزت بچانے کیلئے یہ پیسہ پانی

ہے۔ زندہ معاشروں میں آدمی کو اس کی عزت اور ساکھ سے پرکھا جاتا ہے، اس لیے زندگی میں ہمیشہ ساکھ برقرار رکھیے۔

لیکن یہ بات بھی یاد رہے کہ ساکھ ہونے کے باوجود بھی مسئلے رہیں گے۔ اچھا ہونے کے باوجود بعض لوگ آپ کو برا سمجھیں گے اور برا کہیں گے۔ اس کا کوئی حل نہیں ہے۔ اور جس چیز کا کوئی حل نہیں ہے، اس کی فکر مند کرنا چھوڑ دیجیے۔ بس، آنکھیں نیچی کرکے اپنے کام میں مگن رہیے، آگے بڑھتے چلے جائیے۔ ایک دن سر اٹھائیں گے تو دنیا ساتھ ہوگی۔

اصل یہ ہے کہ اپنی نگاہوں میں خود کو کبھی گرنے نہ دیجیے۔ دنیا میں سب سے بڑا مجرم اپنی ذات کا مجرم ہوتا ہے۔ لوگوں میں چور پن ہوتا ہے۔ جس کی عزت خود اپنی نگاہوں میں نہیں ہے، وہ کسی اور کی عزت کیا کرے گا۔ جو چیز اپنے پاس ہی نہیں ہے، وہ کیسے دوسروں کو دی جاسکتی ہے۔ عزت تو عزت دار آدمی کرتا ہے۔

آپ کی ساکھ آپ کی زندگی کا سب سے اہم اثاثہ ہے۔ اسے اہمیت دیجیے۔ اس پر انوسٹمنٹ کیجیے۔ وقت لگائیے۔ ایسے لوگوں میں بیٹھیے جو آپ کی عزت کرنے والے ہوں۔ اُن لوگوں کو پہچانیے جو آپ کی مہارت اور عزت اور شہرت سے جلتے ہیں۔ آدمی کو اپنے دوستوں اور دشمنوں کی پہچان ہونی چاہیے۔ شاہین شاہین کے ساتھ ہی اڑتا ہے، مردار کھانے والے گدھ کے ساتھ نہیں۔ تعلق کی وجہ پیسہ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ نظریہ ہونا چاہیے۔ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، ”نظریے کا ساتھ ازلی اور ابدی ہوتا ہے۔“

یہ معیار طے کیجیے کہ کن کے ساتھ کام کرنا ہے اور کن کے ساتھ کام نہیں کرنا۔ کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے ساتھ صرف سلام دعا کا تعلق رکھا جاسکتا ہے، کام نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اپنے کام کا جواب دیا جاسکتا ہے، ان کی حرکتوں کی ذمے داری قبول نہیں کی جاسکتی۔ جس کے ساتھ آپ کھڑے نہیں ہوسکتے، اس سے دور رہنا ہی بہتر ہوگا۔

6)۔ مذہب کا درخت

انسانی زندگی کا ایک بہت ہی بنیادی پہلو اس کی روح ہے۔ روح کا تعلق یقین سے ہے، یقین کا ایمان سے ہے اور ایمان کا عبادت سے۔ روحانیت کا بھی ایک درخت ہے۔ اس کی اہمیت کو سمجھیے۔ مسلمان کی حیثیت سے ہم پر اللہ کا خاص فضل ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ذریعے وہ تمام طریقے بتا دیے گئے کہ جن سے ہم اپنے روحانیت کے درخت کی آب یاری کر سکتے ہیں اور اس کی نگاہ داشت کر سکتے ہیں۔ چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے جن تمام انداز کے ساتھ نماز ادا کی، وہ سب سنت ہیں۔ اب جو بھی جس انداز میں پڑھ رہا ہے، اگر اس کی نیت یہ ہے کہ یہ میرے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے تو اسے اس کا ثواب ان شاء اللہ ملے گا۔

نیکی سے روحانیت کے درخت کی آب یاری ہوتی ہے۔ لہٰذا، وہ تمام نیک کام جو آپ کو سکون دیتے ہیں، ضرور کیجیے، کیونکہ آپ کی عبادت، روحانیت اور دین ان سے جڑا ہوا ہے۔

7)۔ ذات کا درخت

یہ درخت سب سے اہم ہے۔ اگر آپ کو اس درخت کی شناخت نہیں ہے تو آپ اس کی چھاؤں سے مستفید ہو پائیں گے اور نہ اس کے پھل کی مٹھاس کا تجربہ کر پائیں گے۔

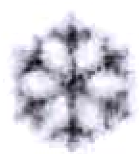
اپنی ذات کو سکون چاہیے، اس لیے اس درخت کی اہمیت کو سمجھیے۔ تنہائی سے لطف اندوز ہونا سیکھیے۔ اپنی پسند کی کتابیں خریدیں۔ اپنے بے لوث دوست کے ساتھ وقت گزاریے۔ صبح کے وقت گیلی گھاس پر چلیے تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس ہو۔ ہمیں سب سے زیادہ وقت اپنی ذات کے ساتھ گزارنا ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے اچھے دوست نہیں ہیں، اپنی ذات کے ساتھ اچھا تعلق نہیں ہے تو پھر یہ درخت ٹھنڈی چھاؤں نہیں دے گا اور نہ میٹھا پھل ملے گا۔

متوازن زندگی کا شعور

بگ بینگ تھیوری کے مطابق، اس کائنات کی عمر یا زندگی چودہ کھرب سال ہے۔ جبکہ اس زمین کی عمر چار کھرب پانچ سو ارب سال ہے اور اس میں انسانی زندگی کی عمر پینتیس لاکھ سال ہے۔ اتنے زیادہ وقت میں آج کے انسان کے پاس صرف ساٹھ باسٹھ برس یعنی بیس سے بائیس ہزار دن ہوتے ہیں۔ پھر ان ساٹھ برسوں میں شعور والی زندگی اور بھی کم ہوتی ہے۔

جس کے پاس شعور ہوتا ہے، اس کے پاس قوتِ فیصلہ ہوتی ہے۔ اس شعور کا حساب اللہ تعالیٰ لیں گے۔ جب شعور والی زندگی اتنی مختصر اور مہنگی ہے تو پھر سوال ہے کہ کیا ہم نے کبھی اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا؟ کیا کبھی اس کی ترجیحات بنائیں؟ ہمیں مہینے کی ایک کمائی تنخواہ کی صورت میں ملتی ہے، ہم اس کی پلاننگ کرتے ہیں جبکہ کل کی کمائی کے بارے میں سوچتے ہی نہیں ہیں۔ ہم نے صرف پیسے کو اپنی ترجیح بنایا ہے۔ ہم نے ہر چیز کو مادے کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ لوگوں کے پاس پیسہ ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات سکون نہیں ہوتا۔ بعض اوقات عزت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات اپنا ہی پتا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ایمان نہیں ہوتا اور بعض اوقات اپنی ذات ہی نہیں ہوتی۔ معاش کا درخت ضرور ہونا چاہیے، لیکن صرف معاش کا درخت نہیں ہونا چاہیے۔

آج سے ان تمام درختوں کے بیج لگائیے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو محسوس ہوگا کہ یہ پودا بننا شروع ہوگیا ہے۔ اس وقت آپ کو اپنی زندگی میں نئی تبدیلیاں محسوس ہوں گی جن میں سے اکثر غیر مرئی ہوسکتی ہیں۔ یہ ہے، متوازن زندگی!



حضرتِ انسان

"آپ جو دیکھنا نہیں چاہتے اسے نہ دیکھنے کیلئے آنکھیں بند کر سکتے ہیں، مگر جو محسوس کرنا نہیں چاہتے، وہ محسوس نہ کرنے کیلئے اپنے دل پر پہرے نہیں بٹھا سکتے!"

نامعلوم

زبان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ جتنی پرانی ہوتی ہے، اتنی ہی بامعنی اور واضح ہوتی ہے۔ سرکہ جتنا پرانا ہوتا ہے، اتنا ہی پُرتاثیر ہو جاتا ہے، اسی طرح زبان جتنی پرانی ہوتی ہے اس کا اثر بھی اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ انسانی زندگی کا سفر بچپن سے جوانی تک اور پھر جوانی سے بڑھاپے کی طرف جاتا ہے اور اوسطاً عمر ساٹھ پینسٹھ سال ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح زبان کی بھی عمر ہوتی ہے۔ دنیا میں ان زبانوں کو میچور یا پختہ سمجھا جاتا ہے جن کی کم از کم عمر پانچ سے چھ سو سال ہو۔ پھر ان میں دیکھا جاتا ہے کہ یہ کس قابلیت پر گئی ہے۔ پھر دیکھا جاتا ہے کہ اس میں سوچ کا معیار کیا ہے۔ پھر دیکھا جاتا ہے کہ اس میں مذہب کا کردار کتنا ہے۔ پھر دیکھا جاتا ہے کہ اس میں کلچر کتنا ہے۔ پھر دیکھا جاتا ہے کہ اس میں تجربات اور مشاہدات کتنے ہیں۔ اور پھر دیکھا جاتا ہے کہ کیا یہ پیغام کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں ہے۔

دنیا کی پرانی زبانوں میں سے عربی سب سے قدیم زبان ہے۔ یہ اتنی واضح اور بامعنی ہے کہ قرآن مجید اسی زبان میں نازل ہوا۔ اسی طرح، فارسی بھی نہایت قدیم زبان ہے۔ زبان کا پختہ ہونا اتنا اہم ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ جیسے عظیم فلسفی نے بھی جب اپنے اظہار کیلئے زبان کا انتخاب کیا تو اس وقت کی موثر ترین زبان یعنی فارسی کو منتخب کیا۔

زندگی کے آخری ایام کا فلسفہ

دنیا کے فلسفیوں کے آخری ایام کو ان کے افکار کا دورِ عروج سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ان کے پاس وقت کم ہوتا ہے، اس لیے وہ اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں۔ پیامِ مشرق وہ کتاب ہے جو حضرت علامہ اقبالؒ کی زندگی کے آخری دور میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں آپؒ نے انسان کا اللہ تعالیٰ سے تعلق، کائنات سے تعلق، کائنات کا انسان سے تعلق اور اللہ تعالیٰ کا انسان سے تعلق بیان کیا ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ اے انسان، کائنات پر غور کر، تجھے نصیب بدلتا اگر نہیں نظر آئے گا تو پتھر کا نصیب بدلتا نظر نہیں آئے گا۔ تجھے جب بھی بدلتا نظر آئے گا، انسان کا نصیب بدلتا نظر آئے گا۔ پھر فرماتے ہیں کہ پتھر کا نصیب اس لیے نہیں بدلتا، کیونکہ پتھر نہیں بدلتا۔ انسان کا نصیب اس لیے بدل جاتا ہے، کیونکہ انسان بدلتا ہے۔ یہ تبدیلی زندگی ہے۔

جب اللہ تعالیٰ نے انسان کو تخلیق کیا تو اس نے فرشتوں سے پوچھا، اس کا سکون کہاں رکھا جائے؟ فرشتوں نے کہا کہ اسے دنیا کے سب سے اونچے مقام پر رکھ دیا جائے۔ جواب ملا، نہیں، انسان وہاں پہنچ جائے گا۔ فرشتوں نے کہا، پھر اسے سمندر کی گہرائی میں رکھ دیا جائے۔ جواب ملا، یہ وہاں بھی اتر جائے گا۔ فرشتوں نے کہا، پھر اسے ریگستان کے ذروں میں رکھ دیا جائے۔ جواب ملا، نہیں، یہ ذروں کو بھی گن لے گا۔ فرشتے سوال کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ پھر اس کو کہاں رکھا جائے؟ جواب ملا، میں اس کا سکون اس کے اندر ہی رکھ دوں گا۔ یہ پوری کائنات میں تلاش کرے گا، لیکن جب یہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جائے گا تو پھر اس کو کہیں سے آواز آ جائے گی،

"اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی... تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن"

اکثر آنکھ مرتے وقت کھلتی ہے

اپنی زندگی میں ہم کس کس کے بن جاتے ہیں، اپنے نہیں بن پاتے۔ ہم کاروبار چلا رہے ہوتے ہیں، لیکن ایک وقت آتا ہے کہ کاروبار ہمیں چلانے لگتا ہے۔ ہم اپنے کام کو پوری دنیا میں دیکھ رہے ہوتے ہیں اور سکونِ قلب کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ایک

فرسٹریشن ہوتی ہے تو ہم ہل کر رہ جاتے ہیں۔ دنیا کے جھمیلوں میں ہم جس چیز کو سب سے زیادہ گنواتے ہیں وہ سکون قلب ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''غافل کی آنکھ تب کھلتی ہے جب بند ہونے کو ہوتی ہے۔'' آدمی مرنے لگتا ہے تو اسے پتا لگتا ہے کہ میں نے تو گھاٹے کا سودا کیا ہے۔

سب کچھ بن جاتا ہے، ہم کیوں نہیں بن پاتے؟ سب کچھ دکھانے کے لائق ہوتا ہے، ہم کیوں دیکھنے کے لائق نہیں ہوتے؟ سب کچھ بتانے کو ہوتا ہے، ہم کیوں اپنے بارے میں بتانے کے قابل نہیں ہوتے؟

سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا ہم مالک دوجہاں کی بارگاہ میں پیش ہونے کے قابل ہیں؟ حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ سے کسی نے پوچھا، آپ اتنی محنت کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کو تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے جواب دیا، ''مجھے نہ ہار کی پروا ہے، نہ جیت کی۔ پروا اگر ہے تو یہ کہ میرا مالک راضی ہوگیا تو میں جیت گیا۔'' اس لیے سکون قلب کا سامان ضرور پیدا کیجیے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ سب کچھ بن جائے، لیکن خود نہ بن سکیں۔

زندگی کے آخری لمحات کے افسوس

ایک نرس آئی سی یو میں اپنی نئی نوکر شروع کرتی ہے تو اسے ایک عجیب خیال آتا ہے کہ آج میں اپنے کیریر کا آغاز کر رہی ہوں، کیوں نہ میں ایک یہ تحقیق کروں کہ جو لوگ دنیا سے جاتے ہیں، ان کی کیا حسرت ہوتی ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ اپنی تحقیق شروع کرتی ہے۔ اس ہسپتال میں جو بھی شخص مرنے والا ہوتا، وہ اس سے سوال کرتی۔ اس تحقیق کو مکمل کرنے میں اس کے چالیس سال لگ گئے۔ چالیس سال کی تحقیق کے بعد اس نے دنیا کو مرنے والوں کے پانچ پچھتاوے بتائے۔ اس نے بتایا کہ مرنے والوں کا پہلا پچھتاوا یہ ہے کہ میں نے بہت کچھ بنایا ہے، لیکن میں نے اپنی فیملی کو توجہ نہیں دی۔ کاش، میں اپنی فیملی کی خوشیوں سے لطف اندوز ہوتا۔ دوسرا پچھتاوا یہ ہے کہ میں نے کمائی تو بہت کی، لیکن اسے بہت کم خرچ کیا۔ تیسرا پچھتاوا یہ ہے کہ

میں خوش نہیں رہ سکا۔ میں نے خوشیوں کو مشروط کر دیا۔ خوشی میری ترجیحات میں شامل نہیں تھی۔ چوتھا پچھتاوا یہ ہے کہ میں کاروبار کے پیچھے ایسا بھاگا کہ میرے اپنے پرائے ہو گئے۔ جب تمنا ہی سچی نہ ہو تو حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ اگر تمنا سچی ہو تو حاصل ہو جاتا ہے۔ تب، ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔ انسان صرف اپنے ارادے کی وجہ سے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔

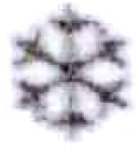
حقیقی بابا سے ثمرات

اکثر لوگ بابوں کی تلاش میں رہتے ہیں، لیکن اگر کسی کو سچا بابا جی مل جائے تو وہ ایک نئی طلب دے دیتے ہیں۔ اس طلب کا نام ہے، اللہ تعالیٰ کی طلب۔ اگر کسی بابا جی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی جستجو اور عشق رسولؐ نہیں ملتا تو پھر وہ سچا بابا نہیں ہے۔ بابا جی اشفاق احمدؒ فرماتے ہیں، ''میری وہ پوتی جو ڈاکیے کو ٹھنڈا پانی کا گلاس پلا دیتی ہے، وہ بھی بابا ہے''، یعنی آسانی پیدا کرنے والا شخص بابا ہے۔ ہم نے بابا جی کو کرامات سے مشروط کر دیا ہے۔ لیکن اس سے بڑی کرامت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج کے اس نفسانفسی کے دور میں کسی کا خیال اللہ تعالیٰ سے جڑا ہوا ہے۔ آج نفسانفسی کے دور میں کوئی اپنا عشق رسولؐ بیچتا پھر رہا ہے تو کوئی ایمان کے سودے کرتا ہے۔ آج نفسانفسی کے دور میں کسی کے پاس اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی یاد کے آنسو ہیں۔ آج نفسانفسی کے دور میں کہیں حق نہیں بھی بنتا پھر بھی معافی دے دی جاتی ہے۔ اس سے بڑا بابا ہونے کی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ بابے کی بڑی تمنا یہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کا ساتھ مل جائے اور اگر اللہ تعالیٰ ہم سے راضی ہو گیا تو پھر کسی بابے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

خوف سے نجات کا طریقہ

آج کے انسان کو کئی طرح کے خوف لاحق ہیں، جیسے مالی نقصان ہو جانا، روزگار کا نہ ملنا، اگر روزگار ہے تو اس کا چھن جانا وغیرہ وغیرہ۔ دو چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے قدرت خوف آزاد کر دیتی ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق، دنیا کے کسی بھی مذہب کا فرد اگر

باٹنے والا ہے اور ہاتھ کا کھلا ہے تو قدرت اس کو ان خوفوں سے آزاد کر دیتی ہے۔ دوم، اللہ تعالیٰ پر یقین۔ جب آدمی کا یہ یقین بن جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی ملک، کوئی ادارہ، کوئی شخص میرا رازق نہیں ہے، صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہی رزق دینے والی ہے، اللہ ہی میرا رب، میرا پالنے والا ہے تو پھر سارے خوف ختم ہو جاتے ہیں۔ پھر بندہ طارق بن زیاد کی طرح کشتیاں بھی جلا سکتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ ہر زمین میرے مالک کی زمین ہے اور یہ زمین میری زمین ہے۔



بے لوث خدمت

''انسانی زندگی کی قیمت اتنی ہی ہے، جتنا وہ انسانیت کی خدمت میں مصروف ہے!''

وول سوئنکا

انسان جب سے دنیا میں آیا ہے، وہ تین چیزیں بڑے دھیان سے استعمال کرتا ہے۔ ایک وقت، دوسرا توانائی اور تیسرا وسائل۔ ہم وقت، توانائی اور وسائل استعمال کر کے ان کا معاوضہ لیتے ہیں۔ یہ انسان کی فطرت اور جبلت میں ہے کہ انسان جب بھی کوئی کام کرتا ہے تو اس کا نتیجہ چاہتا ہے۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم جو کر رہے ہیں، اس کا کوئی نہ کوئی معاوضہ ہو۔ ہم ساری زندگی معاوضہ لیتے رہتے ہیں۔ ہم ہمیشہ اس فکر میں ہوتے ہیں کہ کہیں ہمارا وقت ضائع نہ ہو جائے، کہیں ہماری توانائی برباد نہ ہو جائے اور کہیں ہمارے وسائل ضائع نہ ہو جائیں۔ لیکن جب ہمیں معاوضہ نہیں ملتا تو ہمیں لگتا ہے کہ یہ سب چیزیں ضائع چلی گئی ہیں۔ جب معاوضہ مل جاتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری محنت رنگ لے آئی ہے۔

جب ایک شخص کسی بڑی کمپنی سے منسلک ہوتا ہے تو پہلے یہ دیکھتا ہے کہ اگر میں یہاں کام کروں گا تو کیا مجھے وقت پر اس کا معاوضہ مل جائے گا؟ لیکن، ایک درجہ اس سے بھی بلند تر ہے... خدمت۔ خدمت وہ لیول ہے جہاں آدمی خوب کام کرتا ہے، خوب محنت کرتا ہے، مگر اسے کسی معاوضے کی تمنا نہیں ہوتی۔ اسے غرض نہیں ہوتی کہ اسے کب اس محنت و کاوش کی اجرت دی جائے گی۔ یہ ہے، خدمت۔

اعلیٰ تر درجہ

ایک تحقیق کے مطابق، جو لوگ بغیر معاوضے کے کسی کیلئے کام کر رہے ہوتے ہیں ان کی قوتِ مدافعت کا نظام عام انسان سے تین گنا زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔ خدمت کا مطلب ہے، قربانی... اور قربانی کا مطلب ہے کہ آدمی جس کی خدمت کرتا ہے، لازم نہیں ہے کہ اس کی عقل اور سمجھ کا لیول اس کے برابر ہو، وہ کم بھی ہو سکتا ہے۔ حدیث کا مفہوم ہے کہ عقل کی زکوٰۃ یہ ہے کہ بندہ ان لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے جن کے پاس عقل نہیں ہے۔ ہمیں جو عقل و فہم ملا ہے، ہمیں چاہیے کہ اس کی زکوٰۃ ادا کریں۔ جو لوگ بے لوث خدمت کرتے ہیں، انھیں اس کا صلہ دنیا میں بھی صلہ ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ ایسے لوگوں کے بہت سے کام ایسے ہیں جو اُن کی فکر اور محنت کے بغیر ہو جاتے ہیں۔

زندگی میں جس دن انسان یہ یقین پیدا کر لیتا ہے کہ میرا صلہ یا معاوضہ دیکھنے اور ملنے کے سوا بھی ہے اور وہ زیادہ ہے، اسی لمحے وہ خدمت کیلئے زیادہ وقت نکالنا شروع کر دیتا ہے۔ لوگ بڑے بڑے عہدوں پر بیٹھے ہیں، اُن کے پاس بہت زیادہ مال و اسباب ہیں، لیکن سکونِ قلب نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی سوچ اور مصروفیات اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کی خواہشات ہی تک محدود ہیں۔ وہ اس سے آگے سوچنے کی قوت سے محروم ہیں۔ اس کے برخلاف، جو شخص صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کیلئے دوسرے انسانوں کی خدمت کرتا ہے، اس کی خوش بختی یہ ہوتی ہے کہ اسے دنیا کی سب سے قیمتی شے "سکونِ قلب" عطا کر دیا جاتا ہے۔ پھر اسے دوسروں کی طرح نیند کی گولیاں نہیں لینی پڑتیں اور اینٹی ڈپریسنٹ کھانا پڑتی ہے۔

فرق تو پڑتا ہے

ایک بچہ سمندر کے ساحل پر بیٹھا پانی کی موجوں کو دیکھ رہا تھا۔ پانی کی موجیں ساحل سے ٹکراتیں اور واپس چلی جاتیں۔ موجیں اپنے ساتھ مچھلیاں بھی ساحل پر لے آتیں۔ جب مچھلیاں ساحل پر آ جاتیں تو وہ واپس نہ جا پاتیں۔ بچہ ان مچھلیوں تک سے

ایک ایک مچھلی کو اٹھاتا اور پانی میں چھوڑ دیتا۔ ایک بڑے میاں جو خاصی دیر سے بیٹھے اسے دیکھ رہے تھے، اس کے قریب آئے اور اس سے کہا کہ یہ مچھلیاں تو لاکھوں کی تعداد میں ہیں اور تم ایک مچھلی کو پکڑتے ہو اور پانی میں چھوڑ دیتے ہو، اس سے کیا فرق پڑے گا؟ بچے نے ایک مچھلی پکڑی اور پانی میں چھوڑ کر کہنے لگا، اس کو فرق پڑے گا۔

خدمت کی کاوش اگرچہ بہت چھوٹی ہوتی ہے، مگر جس کیلئے کی گئی ہے، اس کیلئے بہت بڑی ہے۔ اسے ضرور فرق پڑتا ہے اور بہت زیادہ پڑتا ہے۔

خدمت مگر توازن کے ساتھ

سب کچھ کیجیے، لیکن یاد رکھیے کہ دیے کا فرض ہے کہ وہ روشنی دے۔ دیا اپنا تیل نہیں دے سکتا، کیونکہ اگر وہ تیل دے دے تو روشنی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے کام ضرور کیجیے، لیکن اپنے آپ کو بھی بچا کر رکھیے۔ ہم میں سے کچھ لوگ زیادہ جذباتی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی توانائی اور حدود سے بڑھ کر کام کرنا شروع کر دیتے ہیں اور انھیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ جس سطح پر کام کر رہے ہیں، اس سطح پر اگرچہ وہ کام کرلیں گے مگر تا دیر نہیں ہو گا۔ کچھ عرصہ بعد اُن کی صحت اس قابل نہیں رہے گی کہ معمول کے مطابق بھی کام کر سکیں۔ لہٰذا، کام ضرور کیجیے، خدمت ضرور کیجیے، لیکن احتیاط کا پہلو ضرور ملحوظِ خاطر رکھیے۔ دوسروں کی خدمت جتنی ضروری ہے، اتنا ہی ضروری آپ کی اپنی صحت بھی ہے۔ توازن اصل ہے۔ اگر آج کے دن آپ اچھا کام کر رہے ہیں تو کام کے بعد آرام ضرور کیجیے تاکہ اگلے دن اسی توانائی کے ساتھ دوبارہ کام ممکن ہو سکے۔

اپنی زندگی میں کچھ وقت... روزانہ چند منٹ؛ ہفتے یا مہینے میں چند گھنٹے... سال میں چند ہفتے... ایسے ضرور نکالیے کہ جب آپ کام کریں اور اس کا معاوضہ نہ لیں۔ تب اس کا اصل معاوضہ آپ کے اللہ کے پاس محفوظ ہو رہا ہے۔

تحریر سے مفہوم تک

"لکھنا بہت آسان کام ہے۔ بس، جتنے غلط الفاظ ہیں، وہ مٹا دیجیے!"

مارک ٹوائن

ایک ایسا خاندان جس کے پاس طاقت تھی، لیکن اس خاندان میں تعلیم کا رجحان نہیں تھا۔ یہاں تک کہ کوئی ایک بچہ بھی زیورِ تعلیم آراستہ نہ تھا۔ پھر اس خاندان میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوا جس کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ اس نے تعلیم حاصل کی۔ کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا تو ہزاروں کی تعداد میں کتابیں پڑھ ڈالیں۔ سفر کا شوق آیا تو دنیا گھومنا شروع کر دی۔ لکھنے کا شوق چڑھا تو ایسی تحریریں لکھیں کہ لوگ اس کی تحریروں کے گرویدہ ہو گئے۔ کتابیں پڑھنے، سفر کرنے اور گھاٹ گھاٹ کے تجربات کے مطابق وہ کہتا ہے کہ زندگی ایک سفر ہے اور اس سفر پر چلتے رہنا چاہیے۔ سفر میں نئی نئی منزلیں آتی ہیں اور یہ منزلیں اپنے ساتھ نئی نئی چیزیں بھی لاتی ہیں۔ انسان ان چیزوں سے سیکھتا ہے۔

انسان کے پانچ حواس ہوتے ہیں جنھیں ہم Five Senses کہتے ہیں۔ وہ یہ ہیں: دیکھتا ہے، سنتا ہے، سونگھتا ہے، چکھتا ہے اور چھوتا ہے۔ ان حواسِ خمسہ کے علاوہ چھٹی حس بھی ہوتی ہے جس کا تعلق روح سے ہے۔ انسان روح کے ذریعے بھی محسوس کرتا ہے۔ ان تمام حواس کا کام یہ ہوتا ہے کہ یہ کائنات میں بکھری ہوئی معلومات حاصل کرتے ہیں اور پھر ان کا پیغام بنا کر لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔ جب تک کوئی شخص

ان تمام حواس کا استعمال نہیں کرتا، وہ معلومات کا اچھا وصول کرنے والا نہیں بن پاتا۔ دنیا میں ہر انسان اپنے حواسِ خمسہ سے حاصل شدہ معلومات کو جانچتا اور پرکھتا ہے اور پھر جن معلومات کی ضرورت ہوتی ہے، اسے استعمال کرتا ہے، باقی اس کے لاشعور میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔

تحریر کا خام مال

جس طرح مشین سے کوئی پُرزہ بنانے کیلئے خام مال کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح لکھنے کیلئے پڑھنا ضروری ہے، کیونکہ تحریر اگر ایک پُرزہ ہے تو اس کا خام مال مطالعہ سے فراہم ہوتا ہے۔ ایک آدمی جتنا زیادہ پڑھے گا، اسے اتنا زیادہ یہ خام مواد فراہم ہوگا۔ نتیجتاً وہ اتنا زیادہ اچھا لکھ سکے گا۔ اگر کسی نے پندرہ صفحات لکھنے ہیں تو اس کیلئے پندرہ سو صفحات پڑھنا پڑیں گے۔ تب جا کر ایک اچھی تحریر بن پائے گی۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے لکھاری ہیں، ان کی تحریریں مختصر اور جامع ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اُن کے پاس معلومات کا بحرِ کراں ہوتا ہے۔

نیا مطالعہ، پرانا مطالعہ

بیش تر لوگوں کا خیال ہوتا ہے کہ اگر اچھا فقرہ آتا ہے اور زبان پر گرفت ہے تو بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ اچھا کہنے اور لکھنے کیلئے خام مال کا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص بیس سال پرانی کتاب پڑھ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا علم بیس سال پرانا ہے۔ لیکن اگر کوئی نئی کتاب پڑھ رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ علم نیا ہے۔ تاہم، اس کا مطلب یہ قطعاً نہیں کہ بیس سال پرانا علم نہ پڑھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ پرانے علم کی اپنی اہمیت ہے، کیوں کہ کلاسک لٹریچر جو قدیم دانش فراہم کرتا ہے، وہ آج کے علوم کی بنیاد ہے۔ مثلاً، اگر ایک ادیب نے میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" نہیں پڑھی، غالب اور داغ کی شاعری نہیں چکھی، منٹو اور کرشن چندر کے افسانے نہیں پڑھے تو اس کی تحریر پھیکی سیٹھی ہوگی۔ پرانے ادب کا مطالعہ اس قلم کار کو نئی تحریر کیلئے خام مال فراہم کرے گا۔ تاہم، یہ ضروری ہے کہ وہ تحریر لکھتے وقت آج کے

عام قاری کو سامنے رکھے کہ وہ کس معیار کی تحریر سمجھ سکتا ہے اور کس انداز کی تحریر میں دلچسپی لیتا ہے۔ ان دو بنیادی شرائط کے بغیر ایک اچھی تحریر نہیں بن پائے گی۔

تین اہم چیزیں

زندگی کو بھرپور بنانے کیلئے تین چیزیں بہت اہم ہیں جن میں پہلے نمبر پر کتاب ہے۔ کتابوں کا مطالعہ اگرچہ ہمارے ہاں چھوڑ دیا گیا ہے، مگر اتنا اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیغام پہنچانے کیلئے کتاب کو ذریعہ بنایا۔ زندگی کو بھرپور بنانے کا دوسرا ذریعہ وہ تحریریں جنھیں تصاویر کی شکل دے دی گئی ہو۔ جیسے بامقصد فلمیں (ڈوکیومنٹریز)، کیونکہ بامقصد فلم بذات خود ایک یونیورسٹی ہے جس سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ تیسرا سفر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ دنیا کی سیر کرکے دیکھو اور دیکھو کہ میں نے کیسی زمین بنائی ہے۔ جب آدمی سفر کرتا ہے تو اس سے نئی تہذیبوں، ثقافتوں اور زمین کی قسموں کا پتا چلتا ہے۔ سفر بلاشبہ وسیلہ ظفر بنتا ہے۔

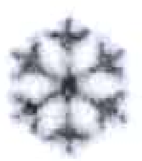
دو دستک

کسی شخص کے پاس جب عزت آتی ہے، شہرت آتی ہے، پیسہ آتا ہے تو اس کا زندگی گزارنے کا طریقہ کار بدل جاتا ہے۔ تب اس کے دل کے دروازے پر دو لوگوں کی دستک ہوتی ہے۔ ان میں پہلا ضد، انا یا تکبر ہوتا ہے جبکہ دوسرا انکسار، عجز ہے۔ اس وقت اس نے دونوں میں سے کسی ایک کو اندر آنے کی اجازت دینا ہے۔ اگر وہ پہلے کو اندر آنے کی اجازت دے دیتا ہے تو پھر جو کوئی تھوکے گا، گالی دے گا، کھانسے گا، گاڑی غلط پارک کرے گا تو ان سب سے اسے تکلیف ہوگی۔ وہ ایسی آگ میں مبتلا ہو جائے گا جو اسے ہر وقت جلاتی رہے گی۔ لیکن اگر وہ دوسرے شخص کو اندر آنے کی اجازت دے دیتا ہے تو پھر ساری تکالیف کے باوجود اس کیلئے جینا بھی آسان ہوگا اور اس کی صحت بھی ٹھیک رہے گی۔ اسے دوسروں سے کوئی گلہ یا حسد نہیں ہوگا۔ اچھا مطالعہ کرنے والا زندگی کے نشیب و فراز سے پہلے سے آگاہ ہوتا ہے، تبھی وہ اپنے قاری تک یہی فکر منتقل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

سچے آدمی کو کسی سے تکلیف نہیں ہوتی۔ اگر اس کو کوئی گالی بھی دے دے تو اس کو تکلیف نہیں ہوتی، کیونکہ تاریخ میں جتنے بھی سچے لوگ تھے، وہ ڈٹے رہے۔ انھیں کوئی مسئلہ نہیں ہوا کیونکہ وہ اندر سے مطمئن تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات دنیا کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس سے بڑی حقیقت اور کوئی نہیں ہے۔ اس کے باوجود اسے آدھی سے زیادہ دنیا نہیں مانتی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور قرآن کریم آخری کتاب ہے۔ لیکن ساڑھے آٹھ ارب انسانوں میں سے صرف دو ارب لوگ ہی مانتے ہیں۔ اگر کسی کو آپ سے اختلاف ہے تو یہ ذہن میں رہے کہ جہاں اتنے لوگ محبت کرنے والے ہیں، وہاں اختلاف کرنے والے بھی ہوں گے حضور ﷺ نے ہمیں بتایا کہ وہ بھی میرے ہیں یعنی آپ ﷺ کو نہ ماننے والے بھی آپ کی امت دعوت ہیں۔

حال میں مستقبل کا کام

جو بھی کریں، یہ سوچ کر کیجیے کہ آج کے بعد بھی دن آنا ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ دن اس سے مختلف ہو۔ آپ جب بھی مستقبل کو سامنے رکھ کر کوئی کام کریں گے تو آپ کا حال اچھا ہو جائے گا۔ اور جس کا حال اچھا ہوتا ہے، وہی کامیاب ہوتا ہے۔ آپ اگرچہ حال میں لکھتے ہیں، لیکن کمال یہ ہے کہ آپ کی تحریریں قوم کے، ملک کے، آئندہ نسلوں کے مستقبل کو سنوارنے کا کام کرنے والی ہوں۔



کامیاب کاروبار کے چند بنیادی نکات

"بزنس کی ساکھ قائم کرنے میں بیس برس لگ جاتے ہیں، مگر غارت کرنے میں صرف پانچ منٹ لگتے ہیں!"

وارن بوفیٹ

کاروبار انسانی زندگی کا دوسرا اہم ترین شعبہ ہے۔ پہلا اہم شعبہ خاندان ہے۔ بلکہ مجھے کہنے دیجیے کہ اگر کاروبار درست نہ ہو تو خاندان بھی کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ کیوں کہ ہم اپنے پیاروں کی ضروریات اپنے کاروبار یا ملازمت ہی سے پوری کرتے ہیں۔ اس لیے دنیا بھر میں کاروبار کو بہتر سے بہتر کرنے اور زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کے طریقے سوچے جاتے ہیں اور ان کی تربیت فراہم کی جاتی ہے۔

کاروبار کا مقصد اصلی

کاروبار کا اصل مقصد پیسہ کا حصول ہے۔ ماہرین کے خیال میں درج ذیل نکات کسی بھی کاروبار کو آگے بڑھانے اور پیسہ کمانے میں مددگار ہو سکتے ہیں۔ آپ بھی اپنے کاروبار پر ان چیزوں کا اطلاق کر کے کاروبار کو بہتر سے بہتر کر سکتے ہیں۔ آیئے، ان نکات کو تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

1) آئیڈیا

کاروبار سے مراد یہ نہیں کہ فیکٹری لگائی جائے اور پھر اس سے پیسہ بٹورا جائے۔ کاروبار کوئی خدمت یا سروس بھی ہو سکتی ہے۔ کاروبار ایک کھوکھے کا بھی ہو سکتا ہے اور ٹھیلے پر پھل فروخت بیچنے والا بھی کاروباری ہے۔ یہاں کاروبار کا مطلب ہے، کچھ نیا

کرتا ہو زمانے کے لحاظ سے کسی آئیڈیا کو لے کر فروخت کرتا۔ دنیا کے تمام بڑے بزنس کی کامیابی یا ناکامی کا تعین کرنے کیلئے سب سے پہلے آئیڈیا ٹیسٹ کرتے ہیں کہ وہ کس آئیڈیا کی بنیاد پر شروع کیا گیا ہے۔ کاروبار کے ماہرین کہتے ہیں کہ بزنس آئیڈیا کی پیمائش میں ٹیسٹ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اگرچہ شخص اور حالات کو سامنے رکھ کر جانچ ضرور کیا جا سکتا ہے۔ بڑے بزنس چل سکتی ہے وہ شخص ہونے پر کئی طرح کے فائدوں میں بدل سکتی ہے۔ اس میں شہرت ایک فائدہ ہے تعلقات ایک فائدہ ہے شناخت ایک فائدہ ہے اور پیسہ بھی ایک فائدہ ہے۔

ہم بزنس میں صرف پیسے کو سوچتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ جو شخص صرف پیسے کے پیچھے بھاگتا ہے اس کے پاس پیسہ نہیں آتا۔ اگر آ بھی گیا تو باقی چیزیں نہیں آئیں گی۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو پیسہ تو کما لیتے ہیں، لیکن ان کے پاس نہ عزت ہوتی ہے نہ شہرت ہوتی ہے نہ تعلقات ہوتے ہیں، نہ کوئی شناخت ہوتی ہے۔ پھر وہ کسی ایونٹ کے انتظار میں ہوتے ہیں کہ کب کوئی موقع آئے اور وہ اپنے نام کے بینرز لگوا سکیں۔

کاروبار کیلئے آئیڈیا تلاش کرنا چاہتے ہیں تو اس معاشرے کی ضرورتوں کو تلاش کیجیے۔ یہ دیکھئے کہ کہاں کیا نہیں مل رہا۔ اس کو کیسے پہنچایا جا سکتا ہے۔ کمی کہاں پر ہے زیادتی کہاں ہے۔ زیادتی کو کمی کے ساتھ جوڑنا کیسا ہے۔ آئیڈیا کی تلاش میں دنیا پر نگاہ رکھیے۔ تاریخ کا مطالعہ بھی دلچسپ اور مفید ہوتا ہے۔ غور کیجیے کہ چیزیں کس طرح بڑی ہوتی ہیں، کس طرح ہو رہی ہیں، کام کیسے کیا جا رہا ہے، کیسے فائدہ ہو رہا ہے کیسے نقصان ہو رہا ہے اور زمانہ کیسے چل رہا ہے۔ جس کا مشاہدہ اچھا ہے اس کو آئیڈیا اچھا مل جائے گا۔

تحقیق یہ ہے کہ ہر دس میں ایک آئیڈیا لانا کلک کر جاتا ہے۔ جس طرح چبھن ہوتی ہے اسی طرح آئیڈیا کی بھی چبھن ہوتی ہے۔ وہ محسوس کراتا ہے کہ مجھے استعمال کرو، مجھے کچھ کر کے دکھاؤ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا کہتی رہے، جب نہیں ہے کا صرف ایک تنہا پاگل آدمی کہتا رہے کہ آئیڈیا ہے یہ ہو جائے گا۔۔۔ اور وہ کر دکھاتا ہے۔

آئیڈیا وہ ہونا چاہیے جس کا موجودہ زمانے میں اطلاق ہو سکے۔ نیز، وہ زمانے

کے چلن کے مطابق ہو۔ پرانے زمانے کا آئیڈیا کلک نہیں کرے گا اور نہ بہت آگے کا آئیڈیا کہ جس تک عام انسان پہنچ ہی نہ سکے۔ ایک صاحب نے میں چاند پر پلاٹ کی خرید و فروخت کا آغاز کیا تھا۔ اسے اگلے چودہ برس تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اسے پہلا خریدار چودہ برس بعد ملا۔

کامیاب کاروبار کا سب سے پہلا بیج آئیڈیا ہے۔ بیج بظاہر بے جان نظر آتا ہے، لیکن جیسے ہی بیج کو سازگار حالات ملتے ہیں وہ زمین کے سینے کو چیرنا شروع کردیتا ہے۔ ایک کونپل باہر نکل آتی ہے اور وہ بتاتی ہے کہ جو بیج بے جان لگ رہا تھا، وہ بے جان نہیں ہے، اس میں پوری طاقت تھی۔

2) ذمہ داری

کاروبار وہی شخص کرسکتا ہے جو ذمے داری محسوس کرسکتا ہے۔ جو ذمے داری قبول کرنے کی جرات رکھتا ہے۔ ہمارے ساتھ یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ ہم میں بہت کچھ ہوتا ہے، ذمہ داری کا ادراک نہیں ہوتا۔ وہ لوگ جو حالات، واقعات، تعلیم اور وسائل کی کمی کا رونا روتے ہیں وہ کاروبار کیلئے نہیں بنے۔ کاروبار اس شخص کی گرفت میں آتا ہے جو سمجھتا ہے کہ یہ میری ذمے داری ہے۔ جو آدمی اپنا باس بننے کا حوصلہ رکھتا ہے، وہ ضرور بزنس مین بن سکتا ہے، کیونکہ ایسے شخص میں آگے بڑھنے کی جرات وصلاحیت ہوتی ہے۔ جس آدمی میں احساس ذمہ داری نہیں ہے، وہ کاروبار میں ترقی نہیں کرسکتا، کیونکہ وہ کامیابی کیلئے ہمیشہ بیرونی عوامل کو تلاش کرتا رہے گا اور اگر اس کے سامنے کاروباری رکاوٹیں آئیں گی تو وہ دوسروں کو کوسے گا۔

جو شخص ذمے داری قبول نہیں کرتا، وہ اپنے آپ پر ترس کھاتا رہتا ہے۔ یہ "خودترسی" دیمک ہے جو آدمی کو اندر ہی اندر ناکامی پر مجبور کرتی ہے۔ جاوید چوہدری کہتے ہیں کہ میں سمجھتا تھا کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں، اچھے اور برے... لیکن میں جب عطاء الحق قاسمی سے ملا تو میں نے اپنی سوچ بدلی اور پتا چلا کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں، مزے دار اور بورنگ (بیزار کردینے والا)۔ جس آدمی کی عادت رونے

دھونے والی ہو، وہ خود ترسی کا شکار رہتا ہے۔ کوئی انسان کمزور نہیں ہوتا۔ لیکن جو آدمی رونا دھونا کرتا رہتا ہے، دنیا اسے کمزور سمجھتی ہے۔ اگر آپ حالات اور افراد سے شکایت کرتے رہتے ہیں اور دوسروں کا رونا روتے رہتے ہیں، تو یہ گلے شکوے چھوڑ دیجیے، آپ کے اندر موجود پوشیدہ قوت، چھپا ہوا جن باہر آ سکتا ہے۔

3) جنون

جنون کا تعلق جسم سے نہیں، دل سے ہے۔ جب آدمی جنون میں آ جاتا ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے، اسے کرنے کیلئے مرنے مارنے پر تیار رہتا ہے۔ کامیابی کے ماہرین یہ کہتے ہیں کہ جب تک آپ کے اندر کسی کام کو کرنے کا جذبہ اتنا شدید نہ ہو کہ آپ اسے کرنے کے لیے پاگل ہوئے جائیں، اس وقت تک آپ وہ کام نہ کریں۔ جب یہ یقین اور عزم ہوتا ہے کہ "میں بھی کر کے دکھا سکتا ہوں" تو آدمی کے اندر جنون آ جاتا ہے۔ جنون گاڑی کا فیول ہے۔ اگر فیول نہ ہو تو گاڑی چاہے مرسڈیز اور فیراری ہی کیوں نہ ہو، وہ نہیں چلے گی۔ عطاء الحق قاسمی کہتے ہیں، "آدمی کے پاس جب کوئی حیرت انگیز بات نہ رہے تو پھر اس کیلئے مرنا ہی باقی رہ جاتا ہے۔"

زندگی میں حیرت کو زندہ رکھیے۔ جنون کے اسباب پیدا کیجیے۔ وہ اسباب کتابیں ہو سکتی ہیں، لوگ ہو سکتے ہیں۔

یقین... علم اور معلومات سے بڑی شے ہے۔ جس سے یقین ملے، اس کے پاس ضرور بیٹھیے۔ وہ آپ کے جنون کو سلامت رکھے گا۔ ایمان سلامت ہر کوئی منگے، عشق سلامت کوئی ہو، یعنی عشق سلامت رہنا چاہیے۔ دنیا کا تلخ جملہ یہ ہے کہ "صاحب اب عشق نہیں ہوتا، میرا حساب کر دو۔"

جنون مشکلات کا سامنا کرنا سکھاتا ہے۔ ناممکن کو ممکن کرنے کے قابل کرتا ہے۔ کاروبار کا دوسرا نام جنون ہے۔ آدمی کاروبار کی جگہ نوکری کو اس لیے ترجیح دیتا ہے کہ وہ سمجھتا ہے کہ کاروبار میں خطرات بہت ہیں اور نوکری میں تحفظ ہے۔ یاد رکھیے، نوکری میں سب سے بڑا دھوکا سیکورٹی کا ہوتا ہے۔ جنون سیکورٹی سے ان سیکورٹی میں لے جاتا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کا کاروبار کامیاب ہوا ہوتا ہے، ان کے دس کام ناکام بھی ہوئے ہوتے ہیں۔ جو آدمی ناکامی کا سامنا نہیں کرسکتا وہ کاروبار نہیں کرسکتا۔ ناکامی کا سامنا صرف اور صرف جنون ہی کراتا ہے۔ پرندے کو اگر یقین نہ ہو کہ وہ پر کھولے گا تو اُڑنے لگے گا، وہ کبھی اپنے پر نہ کھولے، کبھی اُڑ نہ سکے۔

4) مثبت اپروچ

زندگی میں امید برقرار رکھیے۔ امید کا دامن کسی حال میں نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگر کسان فصل حاصل کرنے میں جلدی کرے تو فصل کاشت نہیں کرسکتا۔ فصل کیلئے صبر کرنا پڑتا ہے۔ مثبت اپروچ منزل تک لے جاتی ہے۔ ہمیشہ کامیابی نہیں مل سکتی لیکن جب غیرمطلوبہ نتیجہ قبول کرلیا جائے تو ناکامی کو قبول کرنا آسان ہوجاتا ہے۔ جب ہم ہر ناکامی سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں تو کامیابی کا حصول مشکل ہوتا چلا جاتا ہے۔ کچھ ناکامیاں ہماری کامیابی کیلئے ضروری ہیں۔

5) مواقع

زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع تلاش کیجیے۔ اس کیلئے خود پر کام کیجیے۔ خود کو اپنی فیلڈ کے اعتبار سے بہتر کرتے چلے جایئے۔ آج چونکہ جدید ٹیکنالوجی کا دور ہے، اس لیے اس کا استعمال سیکھیے اور اپنی بزنس کی بڑھوتری کیلئے جہاں تک ہوسکے، اسے استعمال کیجیے۔

آج مارکیٹنگ کا انحصار سوشل میڈیا پر ہے۔ زیادہ تر مارکیٹنگ سوشل میڈیا پر ہورہی ہے۔ جو بزنس مین مواقع تلاش نہیں کرتا، وہ ترقی نہیں کرسکتا۔ آج اگر مسائل بڑھے ہیں تو مواقع بھی بڑھے ہیں۔ اپنا فوکس مسائل کی بجائے مواقع پر کیجیے، کیونکہ کچھ خبر نہیں کہ کون سا موقع کلک ہوجائے۔ اس لیے مواقع کا شعور ہونا ضروری ہے۔ مواقع سے فائدہ حاصل کرنے کیلئے چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک، مقصد؛ دو، امید؛ تین، سوشلائزیشن؛ چار، یہ یقین کہ اللہ تعالیٰ کرم کرتا ہے۔ وہ ذات اتنی بڑی کائنات کو پال رہی ہے تو کیا ہمیں نہیں دے سکتی۔ ہمارا ہی دل چھوٹا ہوتا ہے کہ ہم قدرت کے

فراہم کردہ مواقع محسوس ہی نہیں کر پاتے۔ جب یہ کیفیت ہوتی ہے تو دل تنگ ہو جاتا ہے۔ یاد رکھیے، خدا تنگ دلوں میں اپنی نعمتوں نہیں اتارتا۔

6) پلاننگ

پلاننگ یا منصوبہ کاروباری زندگی میں کامیابی کیلئے بہت ہی ضروری ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ منصوبہ بندی کاروبار کی نہیں ہوتی، دراصل مزاج کی پلاننگ ہوتی ہے۔ آپ کی منصوبہ بندی آپ کی زندگی میں محسوس ہونی چاہیے۔ ہر شے کو پلاننگ کی ضرورت ہے۔ جیسے، وقت کی پلاننگ، وسائل کی پلاننگ، حالات کی پلاننگ، چیزوں کی پلاننگ، معاملات کی پلاننگ، اہداف کی پلاننگ، وغیرہ۔

اگر کسی کے اندر پلاننگ کا جذبہ اور مزاج نہیں ہے تو پھر وہ ترقی نہیں کر سکتا۔ منصوبہ بندی کا نہ ہونا، آدمی کی عدم دلچسپی اور غیر سنجیدگی کی علامت ہے۔ جو آدمی اپنا قیمتی وقت نکال کر، اپنا پیسہ لگا کر کاروبار کر رہا ہے، اگر پلاننگ نہیں کرے گا تو وہ بروقت مطلوبہ نتائج حاصل نہیں کر سکتا۔ منصوبہ بندی نہیں ہوگی تو کاروبار میں غیر متوقع مسائل اور ان جانی رکاوٹیں آگھیریں گی۔

منصوبہ بندی کر کے آپ نہ صرف ان رکاوٹوں اور مسئلوں کو قابو کر سکتے ہیں بلکہ اپنے کاروبار کی رفتار بھی بڑھا سکتے ہیں۔

7) اعتماد

کاروبار کیلئے اعتماد بہت اہم عنصر ہے۔ ایک شخص نے کاروبار شروع کیا، لیکن اس کے پاس وسائل نہیں تھے۔ اس نے ایک عجیب کام کیا کہ وہ اپنے کسی قریبی عزیز کے پاس چلا گیا اور کہا کہ مجھے دس ہزار روپے چاہئیں، میں فلاں تاریخ کو واپس دے دوں گا۔ اس نے پیسے دے دیے۔ اس نے وہ پیسے گھر میں جا کر رکھ لیے اور مقررہ تاریخ کو وہ واپس کر دیے۔ اس فارمولے کا اطلاق اس نے دس لوگوں پر کیا۔ دو ماہ بعد اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جس سے پانچ لاکھ مانگتا، وہ مجھے لاکھ دیتا۔ پھر اُس نے ان لوگوں سے پیسے لیے اور انھیں کہا کہ مجھے پیسے چاہئیں لیکن میں یہ پیسے چھے ماہ بعد واپس کروں گا۔

انھوں نے کہا، کوئی بات نہیں۔ اس کے پاس خاصی رقم ہوگی۔ وہ سب اس نے انویسٹ کردی۔ اس رقم سے منافع ہوا اور اس نے وہ رقم مقررہ تاریخ سے پہلے ہی واپس کر دی۔ اس فارمولے کو اس نے جاری رکھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ وزیر اعظم پاکستان نے اسے بیسٹ ایکسپورٹر ہونے کا ایوارڈ دیا۔ یہ سب اعتماد کی وجہ سے ممکن ہوا۔ جب اعتماد خراب ہوا ہو تو دھکا تو ہو سکتا ہے، ترقی نہیں ہو سکتی۔

8) انسانی نفسیات

کاروبار میں انسانی نفسیات کا ادراک بہت اہم صلاحیت ہے، کیونکہ کاروبار کوئی ہو، کیسا ہو، وہ انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب تک بندہ یہ نہیں سمجھے گا کہ نفع کیسے ہوتا ہے، نقصان کیسے ہوتا ہے، اور اس میں انسانی نفسیات کا کتنا دخل ہے، وہ اپنے کاروبار کو ترقی نہیں دے سکتا۔ انسانی نفسیات سمجھے بغیر ٹیم نہیں بنائی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کاروبار ناکام ہوتا ہے، اس میں ٹیم کے خراب ہونے کا زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔

انسانی نفسیات جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ لوگوں سے بچنے کی کوشش نہ کیجیے، بلکہ ان کا سامنا کیجیے۔ جب آدمی کام کرتا ہے تو اس کا واسطہ لوگوں سے پڑتا ہے۔ تب اسے سمجھ آتا ہے کہ کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں موجود ہیں اور کس طرح عمل کرتے ہیں۔ کتاب کے بعد علم کا سب سے بڑا ذریعہ انسان ہے جو اسے اپنی روزمرہ زندگی میں تجربہ اور مشاہدہ سے ملتا ہے۔ ہمیشہ دیکھیے کہ کس کی اپروچ کیا ہے، کس شے کے بارے میں کس کا نظریہ کیا ہے، کس کی کون سی چیز اسے موٹیویٹ کرتی ہے، کونسی چیز اس کی شاباشی کیلئے ضروری ہے۔ کاروبار میں کامیابی کیلئے انسانی نفسیات کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔

9) ماہر کی خدمات

جس شعبے کا نہیں پتا، اس شعبے کے ماہر کی خدمات لیجیے۔ کچھ لوگ سب کچھ خود ہی کر رہے ہوتے ہیں۔ ان میں اتنا حوصلہ ہی نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے کو اپنے ساتھ شامل کر سکیں۔ ایسے لوگ ترقی نہیں کر پاتے، کیونکہ جب تک ماہرانہ خدمات نہیں لی جائیں

گی، ترقی نہیں ہو سکتی۔ خدمات کا مطلب ہے، کسی کی قابلیت سے استفادہ کرنا۔ کسی دوسرے کی قابلیت سے استفادہ کرنا خود ایک قابلیت ہے جو کامیاب بزنس مین کیلئے ضروری ہے۔

10) مارکیٹنگ

اگر آپ نے کوئی چیز بنائی ہے، لیکن دنیا کو اس کا پتا نہیں ہی ہے تو پھر اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر آپ کے پاس سونا بنانے کا کلیہ بھی ہے، لیکن مارکیٹ نہیں کیا تو وہ کسی فائدے کا نہیں ہے۔ یہ گویا ایسا ہی ہے جیسے، جنگل میں مور ناچا، کس نے دیکھا۔ مارکیٹنگ کے متعلق ایک غلط تصور یہ پایا جاتا ہے کہ اپنے نام کو زیادہ پھیلانا نہیں چاہیے۔ یہ سراسر غلط بات ہے، حالانکہ مارکیٹنگ اصل میں دوسروں کیلئے آسانی پیدا کرنے والی شے کا تعارف لوگوں تک پہنچانے کا عمل ہے۔ البتہ مارکیٹنگ ڈیسنٹ ہونی چاہیے۔ پروڈکٹ کا پیغام مثبت ہونا چاہیے اور اس میں جھوٹ اور مبالغہ آمیزی سے بچنا چاہیے۔

11) تعلقات

دنیا بھر کے کاروباروں میں تعلقات کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ لوگ تعلقات کیلئے کھانا کھلاتے ہیں۔ تعلقات کیلئے بڑی بڑی تقریبات کی جاتی ہیں۔ لوگ تعلقات بنانے کیلئے کروڑوں روپیہ لگا دیتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں تعلقات کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ ہے۔ ایک اچھا بزنس مین اپنے کاروبار میں تعلقات کی طاقت کو سمجھتا ہے۔ تعلقات ہوں تو بہت سارے کام صرف فون کال پر ہو سکتے ہیں۔ آدمی لاہور سے اسلام آباد سفر کر رہا ہو اور راستے میں گاڑی خراب ہو جائے اور وہاں کوئی جاننے والا مل جائے تو مسئلہ کتنا چھوٹا لگتا ہے۔ یہ کامیابی ہے۔

جو لوگ تعلقات بنانے کا فن جانتے ہیں، وہ نیا کاروبار شروع کریں تو انہیں جلد کامیابی ہوتی ہے۔ بہرکیف، کاروباری میں کامیابی سے قطع نظر، انسانی زندگی میں تعلقات کی اہمیت نہایت ہے، اس لیے ہر قسم کے تعلقات ہونے چاہئیں۔ جس طرح

ہمیں پیسے بڑھانے کی فکر ہوتی ہے، اسی طرح لوگوں سے تعلقات بنانے کی بھی فکر کرنی چاہیے۔

بہت سے لوگ مخصوص کاروبار کر رہے ہوتے ہیں اور انھیں یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ ان کی فیلڈ میں کون کون لوگ ہیں۔ جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ کے علاوہ اور کون یہ کام کر رہا ہے تو جواب ملتا ہے، ''پتا نہیں۔'' ہمیں یہ پتا ہونا چاہیے، کیوں کہ جب کسی فیلڈ میں کسی کا نام بن جاتا ہے تو خریدار اس کی طرف چل پڑتے ہیں۔ آپ کے کاروبار میں کامیابی کا آپ کے تعلقات سے گہرا رشتہ ہے۔ انسانوں سے اپنے اس رشتے کو مضبوط کیجیے۔



کمال کا اُستاد

"استاد روحانی باپ ہوتا ہے!"

مشرقی دانش

اگر ایک شخص اپنے ساتھیوں کو آگے بڑھنے میں مدد کرتا ہے تو صرف اس کا ساتھی آگے نہیں بڑھتا، وہ شخص بھی آگے بڑھتا ہے۔ اس شخص کے ساتھ جڑے ہوئے تمام لوگوں کی کامیابی دراصل اس کی کامیابی ہوتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں یہ رجحان ہے کہ کسی کو آگے بڑھنے میں مدد نہیں کرنی، بلکہ اس کی ٹانگ کھینچ کر خود آگے بڑھنے کی کوشش کرنی ہے، کیونکہ جب میں آگے ہوں گا تو سب میرے پیچھے ہوں گے۔ اسی لیے ہم دوسروں کی مدد کرتے نظر نہیں آتے۔

کئی مرتبہ ایسا ہوتا ہے کہ دو ٹیموں کے درمیان میچ ہو رہا ہو تو ایک ٹیم ہارتے ہارتے میچ جیت جاتی ہے۔ اس جیت میں کسی ایک کھلاڑی کا کردار نمایاں ہوتا ہے۔ وہی کھلاڑی "گیم چینجر" کہلاتا ہے۔ اسی طرح، کسی معاشرے میں استاد ایک "گیم چینجر" بن سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے یہ صلاحیت دی ہوتی ہے کہ وہ اپنے شاگرد کو اس قابل کردے کہ وہ زندگی کے ہارے ہوئے کھیل کو جیت سکے۔

تصورات کی دنیا

ایک اچھا استاد امید دیتا ہے، کامیابی کے تصورات میں لے جاتا ہے۔ پھر ان تصورات کو حقیقت میں بدلنا سکھاتا ہے۔ علم کو تصاویر کی صورت میں ذہن نشین کراتا ہے اور سیکھنے والا بناتا ہے۔ استاد کو بچے کا رول ماڈل ہونا چاہیے، کیونکہ رول ماڈل کی بات زیادہ سمجھ آتی ہے اور جلد سمجھ آتی ہے۔

انسان کا ذہن تصاویر میں سوچتا ہے۔ یہ ماضی کو تصویروں میں دیکھتا ہے، حال کو تصویروں میں دیکھتا ہے اور مستقبل کو بھی تصویروں میں دیکھتا ہے۔ جو شخص زیادہ تصور کرسکتا ہے، وہ زیادہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ سیر کرنے کیلئے ڈزنی لینڈ جاتے ہیں۔ ڈزنی لینڈ ایک تصوراتی دنیا ہے۔ یہ اس کے خالق والٹ ڈزنی کی تصوراتی تخلیق ہے۔ اگر اس نے ایسا سوچا نہ ہوتا ہے تو ڈزنی لینڈ کبھی نہ بن پاتا۔ وہ کہتا تھا کہ اپنے کل وقت کا 33 فیصد صرف ذہن میں تصاویر بنانے میں صرف کرتا تھا، یعنی visualization کیا کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جو انسان تصویر کو نہیں سوچتا تو وہ کرافٹ بھی نہیں کرسکتا۔ ہم کہتے ہیں، ایک دفعہ کام ہو جائے، پھر دیکھا جائے گا۔ لیکن دنیا میں کامیابی کا اصول یہ ہے کہ پہلے ذہن میں خاکہ بنے، پھر جنونی رویہ ہو اور پھر کام کیا جائے۔ گویا، پہلے دیکھا جائے، پھر کام بنے گا۔ آئن سٹائن کہتا ہے، ''دنیا میں وہ شخص زیادہ نقصان اٹھاتا ہے جو سوچے بغیر کام کرتا ہے یا پھر وہ جو سوچتا ہی رہتا ہے، کام نہیں کرتا وہ زیادہ نقصان اٹھاتا ہے۔''

علم کی بھڑک

اگر استاد بچے میں تصورات کی دنیا نہیں ابھارتا، یعنی اس کے ذہن میں روشن مستقبل کی تصاویر نہیں بناتا، وہ استاد نہیں ہے کیونکہ استاد کا کام صرف علم دینا نہیں ہوتا بلکہ علم کی پیاس بھڑکانا بھی استاد کی ذمے داری ہے۔ جب بچے میں علم کی پیاس ہوگی تو وہ تلاش کرے گا۔ وہ تحقیق کرے گا اور سوال لے کر گھومے گا۔ استاد کا کام ہے کہ وہ بچے میں اس کے اہداف کا شعور بیدار کرے۔

دنیا میں سب سے عظیم استاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے اتنے پہلو ہیں کہ اگر انھیں بیان کیا جائے تو آدمی بیان کرتے کرتے تھک جائے گا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے پہلوؤں کا احاطہ نہیں ہو پائے گا۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور تربیت ہی تھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ منبر پر بیٹھ کر فرماتے ہیں، ''عمر، عمر فاروق (رضی اللہ عنہ) نہ ہوتا، اگر اس کی

زندگی میں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا استاد نہ ہوتا۔'' حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے بھی سخی تھے، لیکن جو سخاوت آپ رضی اللہ عنہ نے اسلام لانے کے بعد عشق مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور محبت خدا میں کی، اس نے انھیں ''غنی'' بنادیا۔ دنیا کا کوئی بھی شخص چاہے کتنا ہی سخی کیوں نہ ہوجائے، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قدموں کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ ساری دنیا کے مردوں کی شجاعت اکٹھی بھی کرلی جائے، حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ جیسی شجاعت نہیں لائی جاسکتی۔ اس کی وجہ؟ استاد کا کمال ہے۔ جب استاد کمال کا ہوتا ہے تو وہ اپنے شاگردوں میں کمال پیدا کردیتا ہے اور انھیں زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا سکتا ہے۔ آئن سٹائن کہتا ہے کہ دنیا کی تعلیم اور دنیا کے استاد عجیب ہیں۔ وہ مچھلی کو درخت پر چڑھنا سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ نالائق ہے۔

جھوٹے دعوے

ایک اچھے استاد میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ نالائق طالب علم لائق ہوجائے اور لائق طالب علم سپیریئر ہوجائے۔ بچے کا نالائق سے سپیریئر ہونے تک کے سفر کا آغاز اس کے رویے میں تبدیلی سے کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے استاد کا رویہ مثبت ہونا چاہیے۔ بعض اوقات استاد یہ حرکت کرتا ہے کہ اگر کسی بچے کو سبق نہیں آیا تو ساری کلاس کے سامنے اسے اتنی بری طریقے سے بے عزت کرتا ہے کہ بچے کو تعلیم سے نفرت ہوجاتی ہے۔ کیا بچہ انسان نہیں ہے؟ کیا اس کی عزت اور خودداری نہیں ہے۔ میں ایسے تعلیمی اداروں سے واقف ہوں جو صرف اے گریڈ طلبہ کو لیتے ہیں۔ پھر پورے شہر میں ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ ہمارے اسٹوڈنٹس TOP کرتے ہیں۔ میں سوال کرتا ہوں کہ جب انھوں نے داخلہ ہی چنیدہ طلبہ کو دیا ہے (جو پہلے سے ٹاپ کرتے چلے آرہے ہیں) تو اس میں آپ کے تعلیمی ادارے سے وابستہ استاد کا کیا کمال ہے۔ یہ دعوا تو تب بھلا لگتا کہ آپ فیل ہونے والے یا ڈی گریڈ اسٹوڈنٹس کو لیتے اور انھیں ٹاپ کراتے۔

ایک اچھے اور موثر استاد میں درج ذیل خوبیاں ہونی چاہئیں

1) سوچنے پر ابھارے

ایک اچھا استاد اپنے طلبہ کی سوچ کو ابھارتا ہے۔ اس کا ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ استاد کلاس ختم کرنے سے پہلے بچے کو ایک اسائنمنٹ دے کہ کل تم نے فلاں نئی چیز کے متعلق جاننا ہے۔ اگلی کلاس میں وہ طلبہ سے اس کے بارے میں سوال کرے۔

2) ذہن کو مصروف رکھے

ایک اچھا استاد اپنے طلبہ کے ذہنوں کو مصروف رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ بچہ کلاس میں آئے، جسمانی طور پر حاضر ہو، لیکن اس کا ذہن کہیں اور مٹر گشت کرتا ہو۔ اس کی توجہ ٹیچر کی جانب نہ ہو۔

3) سوالات سنے

ایک اچھا استاد اپنی کلاس کے طلبہ کے سوالوں کو غور سے سنتا ہے، کیونکہ اسے پتا ہوتا ہے کہ میرا اس طرح طلبہ کے سوالات کو سننا بچے میں خود اعتمادی پیدا کرے گا اور وہ اپنے موضوع میں دلچسپی لے گا۔ سوال یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ کون کتنی دلچسپی رکھتا ہے۔ یہاں مسئلہ یہ ہے کہ استاد طلبہ کو سوال کرنے کا موقع ہی نہیں دیتا، کیوں کہ اس کے پاس اپنے موضوع پر کتاب سے باہر کا علم ہے ہی نہیں۔ وہ تو خود بغلیں جھانکتا ہے۔

4) رسک لینا سکھائے

آدمی خطرات سے سیکھتا ہے۔ اگر ہم تمام زندگی اپنی ماں کی گود نہ چھوڑیں تو کبھی چلنے نہ پائیں۔ ایک اچھا استاد اپنے طلبہ میں زندگی کے چھوٹے چھوٹے خطرات لینے کی جرات پیدا کرتا ہے اور یہ سکھاتا ہے کہ کیسے ان خطرات اور مشکلات سے فائدہ اٹھانا ہے۔

5) مدد اور تعاون کرے

ایک اچھا استاد بچے کی کوشش میں مدد کرتا ہے، اسے شاباشی دیتا ہے جس کی وجہ سے بچے کی آگے بڑھنے کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

6) خواب دکھائے

ایک اچھا استاد اپنے طلبہ کو بڑے بڑے خواب دیکھنا سکھاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ستاروں سے آگے اور بھی جہاں ہیں جہاں انھیں کمند ڈالنے کیلئے خود کو تیار کرنا چاہیے۔ وہ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی کامیابیوں پر انھیں مبارک باد دیتا ہے جس سے بچوں میں مزید آگے بڑھنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔

7) روزانہ خود بھی نیا سیکھتا رہے

ایک اچھا استاد جہاں روز بچوں کو کچھ سکھاتا ہے، وہاں وہ خود بھی سیکھتا رہتا ہے۔ اچھے استاد کے پاس اپنے موضوع کی کتاب کے علاوہ اور بھی بے شمار معلومات ہوتی ہیں۔ وہ اندر سے علم کا بحرِ بے کراں ہوتا ہے، اس لیے وہ کتمانِ علم نہیں کرتا۔

زندگی در زندگی

دنیا میں ہر شے کی ایک زندگی ہے۔ اسی طرح، نظریات کی بھی زندگی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر، ایک عرصہ تک دنیا کو سیدھا سمجھا جاتا تھا، پھر نیا نظریہ آیا کہ نہیں، دنیا گول ہے۔ پچھلے نظریے کی زندگی ختم ہوگئی۔ لیکن اچھے استاد کے فلسفوں کی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ وہ اگر اپنے آپ سے اور اپنے طلبہ سے سچا ہے تو وہ اپنے فلسفے کو یکے بعد دیگرے، کئی نسلوں میں منتقل کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ آج آپ کو کتنے ہی اساتذہ مل جائیں گے جو کئی ہزار سال پہلے پیدا ہوئے تھے، لیکن اپنی سچائی اور کھرے پن کے باعث ان کے فلسفے اور نظریات آج بھی زندہ ہیں۔ سقراط زہر کا پیالہ پیتے وقت مسکرانے لگا تو کسی حواری نے پوچھا، آپ مرنے والے ہیں اور ہنس رہے ہیں! سقراط نے جواب دیا، مجھے مارنے والے یہ جانتے ہی نہیں ہیں کہ مجھے مارا جاسکتا ہے، لیکن

میری سوچ کو نہیں مارا جا سکتا۔ اصل علم وہ نہیں ہے جو کتاب میں سے دیکھ کر پڑھا دیا گیا، اصل علم وہ ہے جو پڑھایا جائے تو کئی نسلوں تک جائے۔

آپ آج جو کام کر رہے ہیں، ممکن ہے اس کا پھل نہ دیکھ سکیں۔ اس لیے آج کے کام کا پھل تنخواہ نہیں ہے بلکہ عزت ہے۔ اگر عزت نہ ملے تو پھر تنخواہ جتنی مرضی ہو، فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک عام طالب علم کچھ کرنے پر مجبور ہو گیا ہے تو اس کا مطلب ہے، استاد میں کوئی دم خم ہے، اس لیے کمال کا استاد وہ ہے جو عام طالب علم کو خاص بنا دے لیکن اپنے اسٹوڈنٹس کو خاص بنانے کیلئے پہلے استاد کو خاص بننا پڑے گا۔

بادشاہ گر

احساس ذمے داری، توجہ، سنجیدگی، کام کی ترجیح اچھے استاد کی بنیادی صفات ہیں۔ جب استاد میں یہ خوبیاں ہوں گی تو اُس میں سمجھانے کی صلاحیت اچھی ہو گی۔ کوئی بھی انتظامیہ ایسے اساتذہ کو رکھے جنھیں سمجھانا اچھا آتا ہو۔

استاد کو یہ شعور ہونا چاہیے کہ اصل میں یہ پیشہ کیا ہے۔ کسی بھی طالب علم کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا استاد کا اصل کام ہے۔ استاد تمام پروفیشنز کے افراد کار تیار کرتا ہے۔ اسے فخر محسوس کرنا چاہیے کہ وہ ایسے پیشے سے وابستہ ہے جس سے سارے پیشے بنتے ہیں۔ استاد کی شخصیت اور انداز ایسا ہونا چاہیے جو دلوں کو چھو لے۔



خدا شناسی

''جو پیٹ کا پجاری ہے، وہ خدا کی عبادت کیا کرے گا!''

شیخ سعدیؒ

خدا کون ہے؟

یہ بہت پرانا سوال ہے یہ سوال ہر زمانے میں رہا ہے۔ یہ ہر اس شخص کا سوال ہے جو زندگی میں آگے بڑھتا ہے، تلاش کرتا ہے اور اپنے اُس منبع کی طرف جاتا ہے کہ میرے ہونے کا وجود، میرا دنیا میں آنے کا سبب کیا ہے اور میری تخلیق کیسے ہوئی، کیوں ہوئی؟ جب وہ اس تحقیق کے پیچھے جاتا ہے تو وہ ان صفات تک پہنچتا ہے جو اسے بتاتی ہیں کہ اس کی عقل سے ماوریٰ، حدود سے باہر اور رسائی سے آگے بھی کوئی ذات ہے جو اتنا بڑا کارخانہ چلا رہی ہے۔ اس کو پتا چلتا ہے کہ وہ ذات سورج کو ایک مخصوص وقت پر نکالتی ہے اور پھر ایک مخصوص وقت پر اسے غروب کرتی ہے۔ یہ کائنات کا توازن حسن کی صورت میں نظر آتا ہے۔ پھر وہ سوچتا ہے کہ جب یہ کائنات اتنی حسین ہے تو وہ خود کتنا حسین ہوگا۔ وہ خود کتنا حُسن رکھتا ہوگا۔

اللہ تعالٰی کے وہ تمام صفاتی نام جب انسان ان سے متعارف ہوتا ہے تو پھر غور و خوض کرتا ہے اور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ میری زندگی کی تمام تر طاقتوں کے باوجود، وقت ملنے کے باوجود، میری زندگی اس عظیم ترین ذات کے طابع ہے۔ وہ عظیم ترین ذات مجھ سے بہت زیادہ طاقتور ہے۔ اس کا اختیار نہ صرف مجھ پر بلکہ اس پوری کائنات کا احاطہ کرتا ہے۔ وہ ذات میرے وجود سے پہلے بھی تھی اور میرے وجود کے بعد بھی ہوگی۔ یہ تلاش دراصل اس حقیقت کی تلاش ہے جو انسان کے وجود سے کہیں

پہلے بھی تھی اور اس کے بعد بھی ہوگی۔ نبیوں اور پیغمبروں سے لے کر دنیا کے تمام بڑے انسان اسی حقیقت کی طرف یاد دہانی کیلئے آئے کہ تمہاری زندگی میں اگر کسی ذات کا حکم کارفرما ہے تو وہ خدا کی ذات ہے۔

خدا کو جاننے کے وسیلے

خدا تک پہنچنے کا سب سے بڑا وسیلہ خدا خود ہے۔ انسان کو جہاں روٹی، کپڑا، مکان اور ہر وہ چیز جس کی اسے ضرورت ہے، اس کی سب سے زیادہ فکر اگر کسی کو ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ جب وہ ذات دیکھتی ہے کہ اس کو میری ضرورت ہے، یہ میرے بغیر نہیں چل سکتا تو پھر وہ اپنا کرم اور رحم کرتا ہے اور اپنا راستہ دکھانے لگتا ہے۔

ایسا ممکن ہے کہ بندہ خدا کے راستے پر چلے، لیکن معاونت کسی دوسرے کی ملے، لیکن یہ بھی یاد رہے کہ وہ صرف ذریعہ بن سکتا ہے، منزل نہیں۔ منزل صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ کوئی حادثہ ہو اور بندہ جب اس کے عوامل ڈھونڈنے لگے تو کہ ایسا کیوں ہوا تو اس کو یہ حکمت سمجھ آئے کہ اس کے پیچھے کوئی اور ذات تھی جو یہ جانتی تھی کہ میرے لیے یہی بہتر تھا کہ ایسا ہو جاتا۔

ایسا ممکن ہے کہ بندہ کہیں پہنچنا چاہتا ہے اور دیر ہو جاتی ہے۔ وہ دیر سے پہنچنا دراصل اس بات کی نشان دہی ہوتی ہے کہ دیر سے پہنچنا کسی حکم کی کارفرمائی ہے۔ یہ تاخیر کسی ذات کی حکمت ہے۔ اُس ذات نے اسے کسی حادثے یا کسی سانحے سے بچانے کیلئے اسے ایک کام میں پھنسا دیا یا رش میں جام کر دیا۔ تب اللہ کا یہ بندہ یہ تسلیم کرنا شروع کر دیتا ہے کہ دراصل زندگی میں بندے کی پروگرامنگ کے سوا بھی کوئی پروگرامنگ ہے جو اسے اور اس کائنات کے پورے نظام کو چلا رہی ہے۔ اور وہ پروگرامنگ، اللہ تعالیٰ کی پروگرامنگ ہے۔ بسا اوقات، غور و خوض سے بھی اللہ تعالیٰ کو تلاش کیا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ تک سفر کو جاننے کا تقاضے

جس کے پاس شعور ہے، اس پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو تلاش کرے۔ جس کے

پاس شعور نہیں ہے، وہ اللہ تعالیٰ کو تلاش ہی نہیں کر سکتا۔ جو شعور والا ہوگا، وہ پوچھے گا کہ میں کون ہوں، میں کدھر سے آیا ہوں، مجھے بھیجنے والا کون ہے۔ جب شعور پختگی کی طرف جاتا ہے تو اس کی پہلی کھوج ماخذ کی طرف ہوتی ہے۔ اس کی پہلی کھوج مخلوق کو چھوڑ کر خالق کی تلاش کی طرف ہوتی ہے۔ اس کی پہلی کھوج نظارے سے نظر کی طرف ہوتی ہے۔ اس کی پہلی کھوج واقعات کے ماخذ کی طرف ہوتی ہے۔ جس کے پاس شعور آ جاتا ہے تو اسے کوئی ملتا ہے تو وہ حیران ہوتا ہے کہ یہ مجھ تک کیسے پہنچا۔ آخر کوئی تو اس کو بھیجنے والا ہوگا۔ آخر جس نے چڑیا کے گھونسلے میں چڑیا کے اسباب کا بندوبست کیا ہے، وہ میری زندگی بھی تو چلا رہا ہے۔ جب بندہ کہتا ہے کہ رزق کی محافظ تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اگر وہ رازق نہیں ہے تو پھر رازق کون ہے، وہ قادر نہیں ہے تو پھر قادر کون ہے۔ بندہ جب اس کی قدرت کو دیکھتا ہے تو پھر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دنیا کی جتنی بھی قدرتیں ہیں وہ تو چھوٹی ہیں۔ دنیا کے جتنے بھی قادر ہیں، اصل میں تو وہ عبدالقادر ہیں۔ وہ کتنی قدرت والا رب ہوگا کہ جس کے سامنے سارے ''عبد'' اپنی قدرت کو چھوڑ دیتے ہیں اور اسی کی قدرت کو مانتے ہیں۔ شعور بذاتِ خود سفر کا ایک ذریعہ ہے، فہم کا ذریعہ ہے، ادراک کا ذریعہ ہے، تلاش کا ذریعہ ہے۔

خدا کو جاننا کیوں ضروری ہے؟

زندگی کے بے شمار ایسے سوال اور معمے ہیں جو جانے بغیر حل نہیں ہو سکتے۔ جب انسان ان سوالات کو حل کرنے کی طرف جاتا ہے تو بے بس ہو جاتا ہے اور یہی بے بسی اس کے اندر خلا پیدا کرتی ہے۔ جب بندہ اللہ تعالیٰ کو تلاش کرتا ہے تو دراصل وہ اپنے اس خلا کو مکمل کرتا ہے جو اُس کے اندر پایا جاتا ہے۔ جب بے بسی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو پھر دل چاہتا ہے کہ میں تلاش کروں کہ آخر اس کا سبب کیا ہے۔ سبب تلاش کرتے کرتے بسا اوقات انسان سبب بنانے والے تک پہنچ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تلاش ایک فطری تلاش ہے۔ یہ غیر فطری نہیں ہے۔ دنیا کا ہر وہ شخص جو اپنے شعور کی بلوغت اور پختگی کی طرف جاتا ہے، وہ اس تلاش کی طرف ضرور جاتا

ہے۔ گھر میں پڑی ہوئی ہر شے کی وجہ ہوتی ہے، اسی طرح کائنات کے وجود کی بھی کوئی وجہ ہے۔ جس طرح گھر میں پڑی ہوئی چیز بغیر وجہ کے نہیں ہوسکتی، اسی طرح انسان کا وجود بھی اس بات کا اظہار ہے کہ کائنات میں انسان کو بھیجنا والا بھی تو کوئی ہوگا اور جو ہوگا تو پھر اس کی تلاش بھی ضروری ہے۔

اللہ پر ایمان سے زندگی کی اپروچ میں تبدیلی

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین نہیں رکھتے اور جو ایمان رکھتے ہیں، اُن کی زندگی گزارنے کے رنگ ڈھنگ ہی الگ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، بے ایمان لوگوں کی زندگی میں ناامیدی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار کرنے والا دراصل زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے شعور سے عاری ہوتا ہے۔ زندگی کے وجود میں مقصد کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بے شمار ایسے لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹے تو اُن کی زندگی میں گداز آ گیا، نرمی آ گئی، امید آ گئی، رحمت آ گئی، انسانوں پر رحم آ گیا اور انھیں سمجھ آیا کہ زندگی کا ایک بہت بڑا مقصد ہے۔ جب زندگی میں عظیم مقصد ہو تو زندگی کسی نتیجے پر پہنچ جاتی ہے۔ امید کا پہلو ہمیشہ تب بڑھتا ہے جب انسان کو یقین ہوتا ہے کہ کوئی ایسی ذات ہے جو میرے کاموں کا صلہ دے گی۔ اللہ کی ذات ایسی ہے جو منصف ہے، جو قادر ہے، جو رحمان الرحیم ہے، جو سمیع و بصیر ہے۔ یہ تمام اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں جو انسان کی زندگی میں امید کا عنصر بڑھاتی ہیں۔ امید ذاتی چیز ہے۔ یہ کوئی سوشل چیز نہیں ہے۔ لیکن، اس کے ثمرات سب لوگ اٹھاتے ہیں۔

مشکل وقت میں اللہ تعالیٰ پر یقین کامل رکھنا؟

انسان جب غور و خوض کرتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اللہ کی رحمت اس شخص پر زیادہ ہوتی ہے جو دوسروں پر رحم کھاتا ہے، معافی اس کو زیادہ ملتی ہے جو دوسروں کو معاف کرتا ہے۔ غور و خوض کے بعد جب وہ نتائج اخذ کرتا ہے تو اس کا بھروسا اللہ تعالیٰ کی ذات پر بڑھتا جاتا ہے۔ پھر وہ سمجھ جاتا ہے کہ آنے والے چیلنج، مشکلات اور رکاوٹیں دراصل میرا امتحان ہیں۔

امتحان کا ہونا اچھی بات ہے۔ اس سے انسان نکھر کر سامنے آتا ہے۔ ایک کو تو حل کرنے کے بعد خود اعتمادی کا لیول بڑھ جاتا ہے۔ جو آدمی اپنے مشکل اوقات میں اللہ تعالیٰ کو نہیں چھوڑتا، پھر وہ عام انسان نہیں رہتا۔ وہ صاحب ایمان بن جاتا ہے اور جو صاحب ایمان ہوتا ہے وہ عام انسانوں سے بہتر ہوتا ہے۔ اس لیے تکلیفیں، مشکلات اور رکاوٹوں کا آنا ایمان بڑھنے کی علامت ہے۔

آسانیوں، رحمتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذات کو نہ ماننا؟

اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی مہربان ہے۔ وہ اشاروں سے بتاتی ہے کہ میں ہوں۔ اشاروں سے پیغام آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مہربان ہے۔ ہمیں بہانوں سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بہتر راستہ دینا چاہتا ہے۔ ہمیں بہانوں سے پتا لگتا ہے کہ ہدایت کا خزانہ مانگنے والوں کو ضرور ملتا ہے۔ ہمیں بہانوں سے پتا لگتا ہے کہ ہمارے بھولنے کے باوجود وہ ہم پر رحم کرتا ہے۔ سورج کا نکلنا، سمندر کا ٹھاٹھیں مارنا، ریگستان کی پھیلنا، بادلوں کا برسنا، پہاڑوں کی بلندیاں، کلیوں کا کھلنا... غرض کائنات کی ہر چیز پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ایک ایسی ذات بھی ہے جس کی دی ہوئی طاقت اور جس کے دیے ہوئے انعام اور رحمت سے یہ پوری کائنات چل رہی ہے۔ فہم و دانش رکھنے والا شخص تلاش کر لیتا ہے کہ ان سب کے پیچھے مالک کائنات اللہ ہے جو اس نظام کو چلا رہا ہے۔ مگر جس انسان کے دل پر قفل لگے ہوئے ہوں، اس کیلئے یہ حقیقت سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق مستقل کیسے ہو؟

جو شخص مخلوق سے محبت کرتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ کی محبت مل جاتی ہے۔ بہت سارے لوگ فقط عبادت ہی کو راہِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ جبکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ عبادت دراصل اس بات کا وعدہ ہے کہ میں مانتا ہوں کہ وہ صرف ذات کریم ہی اس قابل ہے کہ اسی کو سجدہ کیا جائے، اسی کی ثنا بیان کی جائے۔ مخلوق پر مہربانی، مخلوق کیلئے آسانیاں پیدا کرنا، مخلوق کی قدر کرنا، چھوٹوں پر رحم کھانا، بڑوں کا ادب کرنا، اپنے اندر عاجزی پیدا کرنا... یہ علامات بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پر مہربان ہے۔ دوسروں کی

غلطیاں نکالنا اللہ تعالیٰ سے دوری کی علامت ہے، جبکہ اپنی غلطیوں کی طرف دیکھنا اللہ تعالیٰ سے قربت کی علامت ہے۔

اگر محسوس ہو کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق ٹوٹ گیا ہے تو کیا کیا جائے؟

اللہ تعالیٰ کے جہاں بے شمار کرم ہیں ان میں ایک بڑا کرم یہ ہے کہ اس نے انسان کو توبہ کا انعام دیا ہے۔ توبہ کا مطلب ہے، واپسی۔ رحم و کرم کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ گناہ پہاڑوں کے برابر ہی کیوں نہ ہوں، لیکن اُس کی رحمت پھر بھی بھاری ہے۔ اگر بندہ اپنے حق کو دیکھے تو اسے کچھ نہیں ملے گا، لیکن یہ اس رب کا فضل ہے کہ وہ حق سے کہیں زیادہ عطا کرتا ہے۔ زندگی میں جب کبھی محسوس ہو کہ میرا ناتا اللہ تعالیٰ سے کٹا ہوا ہے تو اسی وقت توبہ کیجیے۔ استغفار کا سہارا لیجیے۔ سجدے میں سر رکھیے۔ آنسو بہایئے۔ دوبارہ تجدید وفا کیجیے اور دعا کیجیے کہ اے اللہ، مالک تو ہے، بندہ میں ہوں۔ اور بندے تو مجھ جیسے ہی ہوتے ہیں۔

گناہوں کے بعد واپسی، اللہ کی طرف پلٹنا بہت ہی قوی عمل ہے اور اللہ کی محبت کی نشانی ہے۔



شاباشی

''محبت اور تعلق کو زندہ رکھنے کا واحد طریقہ شاباشی ہے!''

بیری لونگ

ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں اس میں شاید سب کچھ ہے، شاباشی نہیں ہے۔ اگر ہم پچھلی زندگی پر نظر دوڑائیں تو ہمیں نہ ہونے کے برابر ایسے لوگ ملیں گے جنھوں نے ہماری سچی تعریف کی ہو۔ نوکری ہو، پڑھائی کے ادوار ہوں، تعلیمی ادوار ہوں، ازدواجی زندگی ہو، گھر کی زندگی ہو، غرض کوئی بھی جگہ ہو، آٹے میں نمک کے برابر لوگ ایسے ملتے ہیں جو شاباشی دیتے ہیں۔ اگر اس کی سماجی وجہ تلاش کی جائے تو پتا چلتا ہے کہ ہمارا پنجاب مجموعی طور پر شکریہ سے محروم ہے۔ شاید اسی لیے پنجابی میں ''شکریہ'' کا لفظ ہی نہیں ہے۔ اگر انسان کو آکسیجن نہ ملے تو وہ چند منٹ زندہ رہ سکے گا۔ اگر پانی نہ ملے تو وہ دو تین دن گزارے گا۔ اگر کھانا نہ ملے تو وہ چند دن زندہ رہ سکے گا۔ جیسے، یہ سب چیزیں انسان کے زندہ رہنے کیلئے بہت ضروری ہیں، اسی طرح تعریف یا شاباشی کا ملنا بہت ضروری ہے۔

شاباشی روح کی غذا ہے

جس کی تعریف نہیں کی جاتی یا جس کو شاباشی نہیں ملتی، وہ ظاہری طور پر تو زندہ ہوتا ہے لیکن اندر سے مرجاتا ہے۔ پھر وہ زندہ لاش کی طرح ہوتا ہے، کیوں کہ شاباشی اور توصیف انسانی روح کی غذا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس دنیا میں میری کوئی وقعت نہیں ہے، میری کوئی ویلیو، کوئی قدر نہیں ہے۔ مجھے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ اسے گمان گزرنے لگتا ہے کہ جس طرح میرے دنیا میں آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا، اسی طرح جانے سے بھی

کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

شاباشی سے توانائی ملتی ہے۔ جس طرح ایک آدمی اپنا پروفائل بناتا ہے اور اس میں اپنی قابلیت اور تجربہ لکھتا ہے، اسی طرح اس کے اندر بھی ایک پروفائل ہوتی ہے جس میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں نے میرے متعلق یہ کہا، فلاں نے مجھے اچھا سمجھا، فلاں میرے بارے میں اچھا گمان رکھتا ہے، وغیرہ۔

تعریف سے موٹیویشن ملتی ہے

جب کسی کے بارے میں چند لوگ اچھا گمان رکھتے ہیں تو اس سے اس کی عزتِ نفس بلند ہوتی ہے۔ عزتِ نفس کا لیول جتنا زیادہ ہوتا ہے، اتنا ہی اس کی کارکردگی اچھی ہوتی ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے کہیں بہت عرصہ کام کیا ہے، ان پر ایک تحقیق ہوئی جس میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ آخر کیا وجوہ ہیں کہ کئی لوگ موت کے قریب ہونے کے باوجود اپنے کام پر جاتے ہیں۔ جب تحقیق کا رزلٹ نکلا تو پتا چلا کہ اس کی پہلی وجہ تنخواہ نہیں تھی، بلکہ اس ادارے میں ان کی عزت تھی۔ تنخواہ تو کم یا زیادہ ہو جاتی ہے، لیکن کام میں جان ڈالنے کیلئے، اس میں روح پیدا کرنے کیلئے، اس کام کو مزیدار بنانے کیلئے موٹیویشن بہت ضروری ہے۔ اگر یہ موٹیویشن نہیں ہے تو پھر اچھا بھلا آدمی مُردار ہو جاتا ہے۔

ہم لوگ بہت ظالم ہو چکے ہیں۔ ہم نے ہر چیز کو کاروبار بنالیا ہے۔ ہم نے اپنی تعریفوں کو بھی کاروبار بنالیا ہے۔ ہم صرف اس کی تعریف کرتے ہیں جس سے کام ہوتا ہے۔ نوکری پیشہ لوگ اپنے باس کی تعریفیں کر رہے ہوتے ہیں، حالانکہ یہ ساری تعریفیں مجبوری کی تعریفیں ہوتی ہیں، دل کی گہرائی سے نہیں نکلتیں۔ طارق بلوچ صحرائی کہتے ہیں کہ غلام قوم بہت ظالم ہوتی ہے۔ وہ پانی کا پیالہ بنائے تو وہ اسے بھی مانگنے والا کاسہ بنا لیتی ہے، کیونکہ اس کے ہاتھوں میں بنتا ہی کاسہ ہے۔ اسی طرح، بعض لوگ تعریف کریں بھی تو وہ تعریف نہیں کر پاتے۔ سچی تعریف وہ ہے جس میں آپ کی کوئی غرض نہ ہو۔ آپ کو پتہ ہو کہ میں جو تعریف کر رہا ہوں، اس میں میرا کوئی لالچ نہیں ہے۔ صرف

ایک ہی مقصد ہے کہ میں دوسرے کی خوبیوں کا اعتراف کروں۔ ہمیں بھی تعریف کرنے کی روایت قائم کرنی چاہیے۔

تاریخ کے نمونے

ٹانگ کھینچنے کا رواج عام ہے۔ دوسروں کی ٹانگ کھینچنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں رول ماڈلز بہت کم ہو گئے ہیں۔ تاریخ میں جو مثالیں ہیں، ہم انھیں جانتے ہی نہیں، کیوں کہ ہم تاریخ پڑھتے ہی نہیں کہ فیس بک سے فرصت نہیں ملتی۔ ہمارے بچپن میں بچے اور نوجوان اسلامی سورماؤں کی کہانیاں پڑھتے تھے تو دل میں اُن کی طرح دین کی خاطر جان دینے کا جذبہ ابھرتا تھا اور کچھ کرنے کو من کرتا تھا۔ یہ کتابیں رول ماڈل سے واقفیت کراتی تھیں۔ جب رول ماڈل سے واقفیت ہوتی ہے تو آدمی اپنے رول ماڈل کو سامنے رکھ کر ویسی ہی زندگی گزارنے کی خواہش و کوشش کرتا ہے۔

آج بھی ہمارے معاشرے میں ایسے رول ماڈل ہیں جن کی پیروی کی جا سکتی ہے، لیکن چونکہ ہم نے اچھوں کو اچھا کہنا چھوڑ دیا ہے تو ہمیں ہر ایک میں برائی ہی برائی نظر آتی ہے۔ یوں، ہمیں اپنے چاروں طرف برے لوگ ہی نظر آتے ہیں۔ یاد رکھیے، آپ جس شے پر فوکس کریں گے، وہی آپ کو ملے گی۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ یہ Law of Attraction ہے۔

بعض لوگ اب بھی اس قانون سے مثبت تبدیلی لانے کا کام کر رہے ہیں۔ آج بھی کہیں کہیں امید کی شمع روشن ہے۔ مثال کے طور پر، لاہور میں ایک ادارے نے اپنے مالیوں کو پروموٹ کرنا شروع کیا ہے۔ اسی طرح، بعض اسکول و کالجز نے اپنے ٹیچرز کو پروموٹ کرنا شروع کر دیا ہے۔

جہاں تعریف نہیں کی جاتی، وہاں ٹانگیں کھینچی جاتی ہیں۔ ٹانگ کھینچنے والا معاملہ وہاں زیادہ ہوتا ہے جہاں پر لیڈرز سے لے کر نیچے تک سب ایک جیسے ہوں اور انھوں نے اپنا مشن بنایا ہو کہ ہم نے بس یہی کام کرنا ہے۔ یہ ساری صورت حال اس لیے

خراب ہوتی ہے کہ ان کے پاس کوئی مثال ہی نہیں ہوتی۔ جس انسان کو کوئی اچھا استاد نہیں ملا یا وہ کسی اچھے استاد سے انسپائر ہی نہیں ہوا تو اس کیلئے اچھا انسان بننا بہت مشکل ہو جاتا ہے، کیونکہ اگر نمونہ نہیں ہے تو پھر مثال بننا کارِ دارد ہوتا ہے۔ یعنی اچھی مثال بننے کیلئے ضروری ہے کہ آپ کے پاس کوئی مثال ہو۔

ہمارے لیے سب سے بڑی مثال سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تعریف کے الفاظ کم پڑ جاتے ہیں، دلوں کی کیفیت بدل جاتی ہے اور آنکھوں کی نمی بڑھ جاتی ہے۔ آدمی کہتا ہے کہ میری زبان، میری عقل، میرا فہم اور اپنا سب کچھ بھی لگا دوں، تب بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف نہیں کر سکتا۔

عشق رسولؐ کا تقاضا

جو سچا عاشق رسولؐ ہے، وہ لوگوں کی تعریف سے دریغ نہیں کرتا۔ اسے پتا ہوتا ہے کہ یہ بڑا ضروری کام ہے۔ اسے یہ شعور ہوتا ہے کہ دوسرے تمام انسان جو میرے اردگرد ہیں، جو میرے ساتھ کام کر رہے ہیں، وہ سب میرے رسولؐ کے امتی ہیں۔ وہ جب اس حیثیت سے سوچتا ہے تو جب وہ کسی مسلمان انسان کی کسی خوبی کی تعریف کرتا ہے تو دراصل، اپنے نبیؐ کے امتی کی تعریف کرتا ہے جو بالواسطہ نبی کی تعریف ہی ہوتی ہے۔ بابا فیروز اللہ تعالیٰ کے نیک بندے تھے۔ وہ کھوسے (ایک خاص قسم کے جوتے) بنایا کرتے تھے۔ کسی نے پوچھا، ''کہاں موچی، کہاں ولی!'' باباجی فرمانے لگے، ''یار، میں نے زندگی میں جس کسی کا کھوسا بنایا ہے، میں نے اس نیت سے بنایا ہے کہ یہ میرے رسولؐ کے امتی کا جوتا ہے۔'' باباجی کہا کرتے تھے کہ ''بندے نوں بندے دے کم ولی نہیں بنادے، کماں دی نیت ولی بنادی اے۔''

خوبیاں تلاش کیجیے

تعریف دراصل سرمایہ کاری ہوتی ہے۔ اگر آپ پاکستان کو ترقی دینا چاہتے ہیں تو اپنے اندر تعریف کرنے کی خوبی پیدا کیجیے۔ ایسا نہیں کہ کسی میں کوئی شے تعریف کے قابل نہ ہو۔ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ خوبیاں ضرور ہوتی ہیں جو اسے اچھا انسان بناتی

ہیں اور دوسرے سے منفرد کرتی ہیں۔ وہ خوبی ایمان داری ہو سکتی ہے، دیانت داری ہو سکتی ہے، سچ ہو سکتا ہے، محنت ہو سکتی ہے، وقت کی پابندی ہو سکتی ہے۔ اگر آپ کو ابتدا میں کوئی خوبی نہ نظر آئے تو بس، تعریف کرنا شروع کر دیجیے کہ آپ جس کی تعریف کر رہے ہیں، وہ اللہ کی سب سے پیاری تخلیق ہے اور اللہ اس کا خالق ہے۔

اگر آج آپ کسی کی تعریف دل سے کرتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ کل کو بڑا انسان بن جائے اور پھر جب کبھی مڑ کر پیچھے دیکھے تو اس کے دل سے آپ کیلئے دعا نکلے۔

موٹیویشن دو طرح کی ہوتی ہے: بیرونی اور اندرونی۔ بعض اوقات شاباشی کی یاد اندر کی یاد بن جاتی ہے۔ پھر آدمی کو یاد آتا ہے کہ فلاں شخص نے میرے متعلق کیا بات کی تھی۔ جب آپ تھک جائیں اور ہمت ہار جائیں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ اے اللہ، میرے لیے موٹیویشن کا کوئی ذریعہ پیدا کر دے۔ میں بہت محتاج ہوں۔ جب آپ یہ دعا مانگیں گے تو اللہ تعالیٰ کوئی نہ کوئی ذریعہ ضرور بنا دے گا۔ کر کے دیکھ لیجیے۔

کہاوت ہے کہ جو کھٹکھٹاتا رہتا ہے، اس کیلئے دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔ جو کام میں لگا رہتا ہے، وہ کہیں نہ کہیں پہنچ جاتا ہے۔ جس کا یہ یقین ہوتا ہے کہ مالک صلہ دیتا ہے، اس کو یقین ہوتا ہے کہ میرے آنے والے دن کمال کے دن ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ پر یقین اللہ تعالیٰ کے قوانین پر یقین ہے اور اللہ تعالیٰ کے قوانین یہ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ محنت کرنے والے کو صلہ ضرور دیتا ہے۔ جو تعریف کر رہا ہے یا شاباشی دے رہا ہے، اس کا صلہ اسے دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ قیامت کے روز پہاڑوں کے برابر نامہ اعمال ہوں گے، وہ یہی لوگ ہوں گے جو دوسرے کو شاباشی دیتے ہوں گے، کیوں کہ وہ دوسروں کو نیک کام کرنے پر شاباشی دیتے رہے ہوں گے۔ ساری رات اندھیری ہوتی ہے، لیکن ایک چراغ کے جلنے سے اس کی روشنی میلوں تک جا پہنچتی ہے۔ وہ چراغ اپنا وجود بتاتا ہے۔

تعریف کا کلچر تشکیل دیجیے

ہمارے ہاں، تعریف اور ستائش کا کلچر نہیں ہے۔ چنانچہ اگر کسی سے کہہ دیا جائے

کہ دوسروں کی تعریف اور تحسین کیا کرو تو وہ آگے سے جواب دیتا ہے کہ میرے بڑوں نے بھی کسی کی تعریف نہیں کی تو پھر میں کسی کی تعریف کیوں کروں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ اگر آپ کے بڑوں نے کوئی اچھا کام نہیں کیا تو آپ بھی اچھا کام نہ کریں۔ یہ وہی عذر ہے جو کفارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو حق تسلیم کر لینے کے باوجود قبول نہ کرنے کیلئے گھڑتے تھے۔ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ کیا ہم اپنے باپ دادا کے طریقوں کے خلاف کریں۔ لیکن، جن باشندگانِ مکہ و مدینہ نے اپنے باپ دادا کے چلن کے خلاف کیا، اور حق کو حق کی حیثیت سے تسلیم کر لیا، وہ ''صحابی'' بن گئے۔

منافقت سے بچ کر تعریف کیجیے

تعریف کا مقصد قطعاً یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دوسروں کی تعریف کر کے اپنا اُلو سیدھا کیا جائے۔ یہ تو منافقت ہے۔ تعریف ہمیشہ دل سے ہونی چاہیے، کیونکہ جو تعریف دل سے ہوتی ہے، وہ دوسرے کے دل پر اثر کرتی ہے۔ بلکہ اس کا اثر یہاں تک ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے ہیں۔ ہم دل سے تعریف نہیں کرتے، بس ظاہری تعریف کرتے ہیں۔ جب کسی کی دل سے تعریف کی جاتی ہے تو اس میں جان آجاتی ہے اور پھر وہ دل لگا کر کام کرتا ہے۔ تعریف اور حوصلہ افزائی کے ذریعے آدمی آٹھ کی بجائے سولہ سولہ گھنٹے کام کرنے کے قابل رہتا ہے۔

تعریف سے بیزار نظام

ہمارے نصاب بالخصوص آرٹس کے نصاب میں ''شکریہ'' اور ''تعریف'' کا موضوع نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایسے اساتذہ بھی نہیں ہیں جو تعریف کرتے ہوں۔ یہ ساری باتیں کلاس روم کی باتیں ہیں۔ انھیں کلاس روم میں ہونا چاہیے۔ یہ باتیں گھر کی ہیں، انھیں گھر تک رہنا چاہیے۔ کسی کے والد نے بیٹے کو بٹھا کر نہیں کہا کہ بیٹا، تعریف کرنے والا انسان بڑی ترقی کرتا ہے۔ انھیں صرف ایک بات ہی سکھائی جاتی ہے کہ محنت کرو، بڑے افسر بنو۔ کوشش کرو، آگے بڑھ جاؤ۔ کاروبار کرو، دولت کماؤ۔ لیکن کسی نے یہ نہیں سکھایا کہ اقدار (ویلیو) بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ جو چیز اندر بنتی وہی آدمی کو

چالاقی اور دو ذاتی ہے۔ ان اقدار کو ہم نے اپنے گھروں اور تعلیمی اداروں میں واپس لانا چاہیے۔

شکریہ کلب

جاوید چوہدری کہتے ہیں، میں نے شکریہ کا کلب بنایا ہے جس میں ہر آدمی تعریف کرتا ہے۔ ہمیں ایسے دوستوں کے ایسے سرکل اور کلب بنانے چاہئیں تاکہ معاشرے میں تعریف کو عام کیا جائے۔ جو آدمی چھوٹوں کی تعریف نہیں کرسکتا، وہ بڑا انسان نہیں بن سکتا۔ اگرچہ وہ دولت وشہرت حاصل کرسکتا ہے، لیکن لوگوں کے دلوں میں اترنے کیلئے ضروری ہے کہ اپنے گرد لوگوں کی قدر ہو۔ سقراط کو زہر کا پیالہ دیا گیا۔ بادشاہ نے کہا، ''اب تو مرنے لگا ہے۔'' اس نے جواب دیا، ''نہیں، میں اب جینے لگا ہوں۔'' بادشاہ نے پوچھا، ''کیسے؟'' سقراط نے جواب دیا، ''اب میں دلوں میں رہوں گا۔ مجھے دلوں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔''

آج دنیا میں اس بادشاہ کا نام نہیں ہے، لیکن سقراط کا نام موجود ہے، کیونکہ وہ دلوں میں زندہ ہے۔

گرمیوں میں کسی دن تپتی دوپہر میں سڑکوں پر گھوم کر دیکھیں۔ پھر اُن لوگوں کی قدر کا پتا چلے گا جو تپتی دھوپ میں محنت مزدوری کرتے ہیں۔ شدید سردی میں باہر رات گزار کر دیکھیے۔ پھر ان لوگوں کی قدر آئے گی جو یخ بستہ راتوں میں انڈے بیچتے ہیں۔

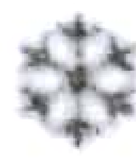
حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''پیغمبر کی بات باتوں کی پیغمبر ہوتی ہے۔'' حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات بھی کیا بات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، ''جس شخص نے انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کیا، وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرسکتا۔''

تعریف کیلئے بہانہ تلاش کیجیے

اللہ تعالیٰ کی شکرگزاری کی شروعات انسانوں سے ہوتی ہے۔ آج سے عہد کیجیے کہ دوسروں کی تعریف کرنی ہے۔ اگر بچے ہیں تو اپنی والدہ کی تعریف کریں، اگر بڑے

ہیں تو اپنے بچوں کی تعریف کریں۔ اگر پرنسپل ہیں تو اپنے اسٹاف کی تعریف کریں، ٹیچر ہیں تو اسٹوڈنٹس کی تعریف کریں۔ باس ہیں تو اپنے ماتحتوں کی تعریف کریں۔ اگر ماتحت ہیں تو باس کی ستائش کریں۔ اُن محافظوں کی تعریف کریں جو سرحدوں پر کھڑے ملک کا دفاع کررہے ہیں۔ اُن محافظوں کی تعریف کریں جو ہمارے گھر کے گیٹ پر کھڑے ہماری حفاظت کرتے ہیں۔ اُن سب کی تعریف کیجیے جو کسی نہ کسی شکل میں ہماری خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

اس معاشرے میں ہر فرد اپنی تعریف چاہتا ہے۔ یہ بنیادی انسانی ضرورت ہے۔ جب سب کی تعریف ہوگی تو معاشرہ مثبت سمت میں آگے بڑھے گا۔ پھر خوشحالی بھی آئے گی اور سکون بھی آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین



سوچیے اور امیر ہو جائیے

"سب سے پہلے ایک خیال آتا ہے۔ پھر، اس خیال کی تنظیم جو آئیڈیا اور پلان کی شکل میں ہوتی ہے۔ پھر، اس منصوبے کی حقیقت میں تبدیلی۔ اور اس سب کا آغاز اس تصور سے ہوتا ہے آپ کیسا تصور کرتے ہیں!"

نپولین ہل

دنیا میں حکمرانی اتنی حکمرانوں نے نہیں کی، جتنی کتابوں نے کی ہے۔ حکمرانی کا مطلب ہے، چھا جانا۔ حکمرانی کا مطلب ہے، دلوں پر اثر کرنا۔ حکمرانی کا مطلب ہے، اپنی گرفت میں لے لینا۔ اتنا اثر لوگوں نے نہیں چھوڑا جتنا کتابوں نے چھوڑا ہے۔ کتابیں بھی کئی طرح کی ہو سکتی ہیں، جیسے مذہبی کتابیں، نصابی کتابیں، سائنسی کتابیں وغیرہ وغیرہ۔ انسانوں کی طرح کتابوں کی بھی عمر ہوتی ہے۔ بعض کتابیں خود مصنف کے شیلف میں رکھی رہ جاتی ہیں تو بعض کتابیں نسلوں کی آب یاری کرتی ہیں۔ ایسی کتابیں کلاسک کہلاتی ہیں۔

اس تحریر میں، جس کتاب کا ذکر کیا جا رہا ہے، وہ بھی ایک ایسی ہی کتاب ہے جس نے نسلوں کو تبدیل کیا ہے۔ اس کتاب کا عنوان ہے Think and Grow Rich۔ اس کتاب کا مصنف نپولین ہل ہے۔ اسے ہم اُردو میں کہہ سکتے ہیں کہ سوچیے اور امیر بنیے۔

تھنک اینڈ گرو رچ کی تاریخ

یہ کتاب ایک غریب لڑکے کی زندگی سے شروع ہوتی ہے۔ اس کا نام اینڈریو کارنیگی تھا۔ یہ غریب مزدور کا بیٹا تھا۔ غربت کی وجہ سے پڑھ نہیں سکا اور مزدوری کرنے لگا۔ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے اسے زیادہ کام کرنا پڑتا تھا اور کام بھی کبھی ایک جگہ پر ہوتا تو کبھی دوسری جگہ۔ پھر اسے ایک فیکٹری میں لیبر کی جاب مل گئی۔ اینڈریو کارنیگی کے اندر ترقی کرنے، کامیاب ہونے اور آگے بڑھنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اسی شوق کی وجہ سے وہ چند ہی سال میں ترقی کرتا ہوا سپروائزر بن گیا۔ پھر ترقی کرتے کرتے اس نے اپنی فونڈری لگائی اور یوں کچھ سال بعد وہ امریکا کا سب سے امیر شخص بن گیا۔ امیر بننے کے بعد اس نے اپنے اثاثے 500 بلین کے عوض گورنمنٹ کے نام کر دیے۔ 500 بلین ڈالر میں سے ساڑھے تین سو ڈالر سے اس نے ملک میں لائبریریاں اور ریسرچ سنٹرز بنوائے۔

اتنا امیر اور کامیاب ہونے کے بعد اس کے اندر یہ داعیہ پیدا ہوا کہ جس طرح میں کامیاب ہوا ہوں اور اپنی کامیابی کیلئے میں نے جو طریقے استعمال کیے ہیں، وہ دنیا کو پتا چل جائیں۔ اس نے اخبار میں ایک اشتہار دیا کہ مجھے ایک ایسے ریسرچر کی ضرورت ہے جو مجھ پر ریسرچ کر سکے۔ اس کی شرط یہ تھی کہ مجھ پر تحقیق کرنے والا بغیر معاوضہ کے کام کرے گا۔ اسے اس کام کیلئے ملازم نہیں، مجنوں کی ضرورت تھی۔ اس نے یہ شرط اس لیے رکھی کہ جس آدمی کے اندر سچی طلب اور شوق ہوتا ہے، اسے معاوضے کی پروا نہیں ہوتی، وہ کام کیلئے جیتا ہے۔ بڑی تگ و دو کے بعد اسے ایک جوان ملا جس کا نام نپولین ہل تھا۔

دوستی کیا ہے؟

دونوں میں دوستی ہوگئی۔ دوستی کا مطلب ہوتا ہے، ایک طرح کا ذہن، ایک جیسی سوچ، یکساں ویژن، ایک طرح کی منزلیں۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں،

"اگر ہم سفر ہم خیال ہو تو سات منزل تک جاتا ہے۔"

عوام کا ویژن ان کے پروفیشن تک محدود ہوتا ہے۔ ٹیچرز کا ویژن ٹیچرز والا ہوتا ہے۔ بزنس مین کا ویژن بزنس مین والا ہوتا ہے۔ کلرک کا ویژن کلرک والا ہوتا ہے۔ وہ اپنے پروفیشن اور نوکری کے سوا کچھ اور سوچ ہی کیا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ہی کام کو بار بار کرتے کرتے ویژن کی ایک تصویر لاشعور میں بن جاتی ہے۔ یہ اس کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے۔ انھی حدود میں اپنے کام کے تصورات بنانا آسان ہوتا ہے۔ اینڈریو چونکہ امریکا کا امیر ترین شخص تھا، اس لیے اس کی دوستیاں بھی امیروں کے ساتھ تھیں۔ اینڈریو نے اپنا لیٹر پیڈ پکڑا اور تمام کامیاب لوگوں کے نام ایک خط لکھ کر نپولین ہل کو دیا اور کہا کہ ان پر تحقیق کرو۔ اس میں ایک خط ایڈیسن (سائنسدان) کے نام تھا، ایک خط برج اشان (ٹائر کمپنی کا مالک) کے نام تھا، ایک خط ہنری فورڈ (فورڈ موٹر کا مالک) کے نام تھا۔ اسی طرح اور بھی کئی امیر ترین افراد کے نام خط لکھے گئے تھے۔

نپولین ہل کی ساری تحقیق اس وقت کے بڑے ٹائیکونز پر ہوئی۔ ہر وقت کا کامیاب شخص گزشتہ وقت کے کامیاب شخص کی ماڈلنگ کرتا ہے۔ نپولین ہل نے اپنی زندگی کے کئی برس اس تحقیق پر لگا دیے۔ زندگی کے کئی برس تحقیق کے بعد اس نے یہ کتاب Think and Grow Rich لکھی۔ جیسے ہی یہ کتاب مارکیٹ میں آئی تو اس کی کروڑوں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ اس کتاب کے ہاتھوں ہاتھ بکنے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ دنیا میں کامیابی اور دولت کمانے کے موضوع پر یہ پہلی کتاب تھی۔

نپولین ہل نے اس کتاب میں بتایا کہ جو لوگ دولت مند ہوئے، ان میں کیا باتیں مشترک تھیں۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ اگر آپ دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اگر آپ ان باتوں کو اپنے اندر اختیار کریں گے تو آپ بھی دولت مند ہو سکتے ہیں۔

آیئے، ہم اس کتاب کی روشنی میں آپ کو بتاتے ہیں کہ دولت مند ہونے کیلئے کن عادات کا اپنے اندر پیدا کرنا ضروری ہے۔

1۔ خواہش یا جنون

ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ کامیاب ہو، لیکن خواہش کے ساتھ جب تک جنون نہ ہو، کامیابی ممکن نہیں ہوتی۔ جنون آدمی کو جذباتی اور بعض اوقات غصیلہ بھی بنا دیتا ہے۔ جب کسی کے اندر جنون جاگتا ہے تو وہ مطلوبہ کام کیلئے مچلتا اور تڑپتا ہے اور اسے جلد از جلد کرنا چاہتا ہے۔ جو لوگ ٹھنڈے مزاج، جمود کا شکار یا کسی کے ماتحت رہنا چاہتے ہیں، کامیاب نہیں ہوتے۔

جنون انسان کو آگے بڑھاتا ہے۔ خواہش اور جنون دل کے اندر کی چیزیں ہیں، جنہیں دیکھا نہیں جاسکتا، البتہ اس کے کام اور حرکتیں بتا دیتی ہیں کہ اس میں جنون ہے یا خواہش ہے۔ ہماری کامیابی کی یقین دہانی صرف ایک بات سے ہوتی ہے کہ ہماری خواہش جنون میں بدل جائے اور ''آج'' اور 'منزل'' کے درمیان فاصلہ ختم ہو جائے۔ جو آدمی جنونی ہوتا ہے، وہ اپنے جنون کی خاطر قربانی دیتا ہے، محنت کرتا ہے، لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں کرتا اور ایک دن منزل پالیتا ہے۔

2۔ ماسٹر مائنڈ

دنیا کے کامیاب لوگ ماسٹر مائنڈ بناتے ہیں۔ ماسٹر مائنڈ کا مطلب ہے، اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ دوستی کرنا۔ ماسٹر مائنڈ کی وجہ سے ترقی ممکن ہوتی ہے۔ کوئی انسان تن تنہا ترقی نہیں کرسکتا۔ اسے ترقی کرنے کیلئے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ اگر وہ اپنے ساتھ مزید لوگ نہیں ملاسکتا، ٹیم نہیں بنا سکتا تو پھر وہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ماسٹر مائنڈ لوگوں کے آپس میں مفادات جڑے ہوتے ہیں اور مفادات میں یکسانیت ہی کامیابی کو ممکن بناتی ہے۔ دنیا میں کوئی بھی مفاد کے بغیر کام نہیں کرتا۔ ہر انسان کی غرض ہوتی ہے۔ اینڈریو اور اس کے دوست ہر سال مل کر کچھ دن کیلئے اپنے کاموں کو چھوڑ کر جنگل کی طرف چلے جاتے اور آوارہ گرد لوگوں کی طرح وقت گزارتے۔ وہ وقت کی قید سے آزاد ہو جاتے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہمارے مسائل متحرک نہیں ہوں گے۔ جب آدمی ہم خیال لوگوں میں ہوتا ہے تو اس کے مسائل متحرک ہوتے ہیں

جو اسے بھی متحرک کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے لوگوں کے ساتھ بڑے لوگ ہوتے ہیں اور اچھے لوگوں کے ساتھ اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ ہم جنس با ہم جنس پرواز... امیر بننے والے لوگ امیروں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ آپ امیر بننا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی اپنی نشست و برخاست بدلنی پڑے گی۔

3۔یقین

دنیا کے تمام کامیاب لوگوں میں یقین پایا جاتا ہے۔ یقین کا مطلب ہے کہ آپ جس مقصد یا ہدف کیلیے جو بھی کام کر رہے ہیں، جتنی محنت کر رہے ہیں، آپ کو یقین ہو کہ میں یہ ہدف پالوں گا۔ دوسرے لوگ صرف اندازہ لگا سکتے ہیں، لیکن یقین صرف انسان کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ بائبل میں لکھا ہے کہ یقین اتنا طاقتور ہے کہ یہ پہاڑوں کو ہٹا سکتا ہے۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں، ''یقیں پیدا کر... کہ مغلوب گماں تو ہے۔''

اگر کسی کے پاس یقین نہ ہو تو پھر اس کی محنت کسی کام کی نہیں۔ وہ تمام طالب علم جو پڑھنے والے نہیں ہوتے، اگر ان پر غور کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان کے پاس یقین نہیں ہوتا۔ ہر پڑھنے والے بچے کو یقین ہوتا ہے کہ جو میں کر رہا ہوں، اس کا صلہ مجھے ضرور ملے گا۔ اسی طرح، جو لوگ اپنی محنت سے امیر ہو جاتے ہیں، انھیں یقین ہوتا ہے کہ وہ ضرور دولت مند ہوں گے۔ اگر آپ کو یقین نہیں کہ آپ دولت مند ہو سکتے ہیں تو آپ دولت مند نہیں ہو پائیں گے۔

4۔خود کلامی

ٹونی روبنس کہتا ہے، ''آپ کی اپنے ساتھ گفتگو آپ کا معیار زندگی بتاتی ہے۔'' امیروں کی خود کلامی غریبوں کی خود کلامی سے یکسر مختلف ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اپنی گفتگو سن لیا کیجیے کہ آپ اپنے سے کیا کلام کرتے ہیں۔ اس سے آپ کو پتا چلے گا کہ آپ کیا امیر ہونے جا رہے ہیں یا نہیں۔ یہ خود کلامی ہر وقت جاری رہتی ہے۔ حتیٰ کہ جب ہم سے کوئی بات کرتا ہے تو پہلے ہم اسے خود کلامی کے ذریعے فلٹر کرتے ہیں اور پھر اس کا ایک

مفہوم لیتے ہیں۔ این ایل پی میں ایک اصول بیان کیا جاتا ہے کہ گفتگو کا اصل مفہوم وہ نہیں ہوتا جو کہا گیا، اصل مفہوم وہ ہوتا ہے جو سننے والے نے سمجھا۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایک ہی جملے کو کئی افراد کئی معنی پہناتے ہیں۔ کسی کو اچھا لگتا ہے تو کوئی برا محسوس کرتا ہے۔ جو آدمی کسی بات کو برا مان جاتا ہے، دراصل اپنے ساتھ اس کی گفتگو درست نہیں ہوتی۔ جس شخص کو زندگی میں آگے جانا ہوتا ہے، وہ منفی کو مثبت کر کے آگے نکل جاتا ہے اور جسے نہیں جانا ہوتا، وہ اپنے آپ کو ایک ہی جگہ باندھ کر رکھتا ہے۔ اپنے ساتھ بات چیت یعنی خود کلامی کا معیار آدمی کو کامیاب کرتا ہے یا ناکام۔ انسانی تاریخ کے کامیاب افراد کی اپنے ساتھ بات چیت کا معیار بہت اعلیٰ ہوتا ہے۔ اس حوالے سے کتاب What to Say When You Talk to Yourself کا مطالعہ بہت ہی خوب رہے گا۔

5۔ خاص علم

ہر فیلڈ کا اپنا علم ہوتا ہے۔ اگر کوئی ڈاکٹر ہے تو اس کے پاس ڈاکٹری کا علم ہے۔ اگر کوئی اکاؤنٹنٹ ہے تو اس کے پاس اکاؤنٹس کا علم ہے۔ اگر کوئی ٹرینر ہے تو اس کے پاس ٹریننگ کا علم ہے۔ غرض، ہر شعبے کا اپنا علم ہوتا ہے اور جو آدمی اس علم کا ماہر ہوتا ہے، وہی کامیاب ہوتا ہے۔ جو افراد اپنے شعبے کا مکمل علم رکھتے ہیں وہ achiever ہوتے ہیں، انعام پاتے ہیں، بڑے سنگ ہائے میل طے کرتے ہیں۔ ہر سنگ میل اور ہر انعام ان میں آگے بڑھنے کا مزید اعتماد پیدا کرتا ہے۔ یہ اعتماد انھیں مزید آگے بڑھنے پر تیار کرتا ہے۔ کامیاب لوگ خود کو اپنی فیلڈ کے اوسط علم تک محدود نہیں رکھتے۔ وہ اس کی گہرائی میں اترتے ہیں تو انھیں اس فیلڈ کا خاص علم عطا ہوتا ہے۔ پھر، وہ خاص علم کے ماہر ہوتے ہیں۔ یہی ان کی خاصیت بن جاتی ہے۔

6۔ کھلی آنکھوں کے خواب

انیس سو باون میں ایک تحقیق ہوئی جس میں ہر شعبہ حیات کے کامیاب ترین لوگو

ں کو شامل کیا گیا۔ ان میں ڈاکٹر بھی تھے، انجینئر بھی تھے، ٹیچر بھی تھے، سائنس داں بھی تھے، اسپورٹس مین بھی تھے۔ غرض، ہر شعبے کے لوگ شامل تھے۔ ان سب لوگوں میں ایک چیز مشترک تھی... اور وہ یہ کہ وہ دن میں خواب دیکھتے تھے۔

جس کے ذہن میں اپنی کامیابی کی تصویر نہیں بنتی، اس کی دنیا میں بھی کامیابی کی تصویر نہیں بنتی۔ دنیا میں ہر چیز ظاہری اور مادی طور پر بننے سے پہلے کسی کے ذہن میں بنی تھی۔ پھر انسان نے اسے وجود دینے کی کوشش کی اور اس میں کامیاب ہو گیا۔ اگر کسی شے کا خیال ذہن میں نہ آئے تو اس کا دنیا میں وجود ممکن نہیں ہے۔ بعض لوگوں میں یہ صلاحیت قدرتی طور زیادہ ہوتی ہے اور بعض میں کم۔ اگر بار بار اچھے خواب دیکھیں جائیں تو اچھے خوابوں کے عضلات (مسلز) طاقت ور ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگوں میں موسیقی کی حس بہت قوی ہوتی ہے۔ اگر انھیں راہ چلتے گانے کی آواز آتی ہے تو اُن کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان کی حس سامعہ انھیں اس آواز کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ جن لوگوں کی حس مزاح اچھی ہوتی ہے، ان میں بھی خواب دیکھنے کی صلاحیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ لوگ کسی سنگین اور سنجیدہ معاملے کے شگفتہ پہلو کو دیکھنے کے قابل ہوتے ہیں اور یوں لوگوں کو ہنسا دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تصور کاری یعنی ویژولائزیشن کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ذہین (جینئس) وہ ہے جو روایتی ڈگر سے ہٹ کر نئے ڈھب پر سوچ سکے۔ کوئی انسان جینئس نہیں ہوتا۔ جس میں لچک ہوتی ہے، وہ جینئس ہوتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ ذہین بننے کیلئے اپنے اندر لچک پیدا کرنا ضروری ہے۔ ایڈیسن کہتا ہے، "میری ساری کامیابی میری ذہانت کی وجہ سے نہیں، بلکہ میرے خواب دیکھنے کی وجہ سے ہے۔"

7۔ پلاننگ

جو آدمی ایک دن کی پلاننگ نہیں کرسکتا، وہ زندگی کی پلاننگ بھی نہیں کرسکتا۔ جو چھوٹے چھوٹے کاموں کی پلاننگ نہیں کرسکتا، وہ بڑے کاموں کی منصوبہ بندی کیوں کر کرسکتا ہے۔ اگر ایک شخص میں خواب دیکھنے کی صلاحیت ہے، اس کے اندر یقین بھی

ہے، وہ ایک اچھا ماسٹر مائنڈ بھی ہے، اس کے پاس خواہشیں بھی ہیں اور اس کے پاس علم بھی ہے لیکن وہ اچھا منصوبہ ساز نہیں ہے تو پھر وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ بس، خواب دیکھنا کافی ہے، باقی سب کچھ ہو جائے گا۔ کسی خواب کو حقیقت کا روپ دینے کیلئے پلاننگ بہت ضروری ہے۔ پلاننگ اتنی مشکل مہارت نہیں ہے، اسے سیکھا جا سکتا ہے۔ جو آدمی کسی کام میں ماہر ہونا چاہتا ہے، وہ برسوں اس دشت کی سیاحی میں گزار دیتا ہے، تب جا کر وہ اس فیلڈ کا ماہر بن پاتا ہے۔ وہ یہ ٹھان چکا ہوتا ہے کہ اسے ماہر بننا ہے۔ لیکن جسے ماہر نہیں بننا، ''گزارا'' ہی کرنا ہے تو وہ صدیاں گزر جائیں، اِدھر اُدھر ہی بھٹکتا رہے گا۔

8۔فیصلہ سازی

دنیا کے کامیاب ترین لوگوں کے فیصلے بہت مضبوط ہوتے ہیں، کیونکہ انھیں اچھے فیصلے کرنے آتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ اچھے فیصلے اچھی زندگی کی علامت ہوتے ہیں۔ زندگی مہینوں، برسوں، صدیوں میں نہیں بدلتی، زندگی اسی لمحے بدل جاتی ہے جس لمحے آپ یہ اہم فیصلہ کرتے ہیں کہ مجھے زندگی بدلنی ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''فیصلے کے لمحے تقدیر ساز لمحے ہوتے ہیں۔'' اگر کسی کی تقدیر دیکھنی ہے تو فیصلے کے لمحے میں دیکھیے۔ آج آپ کو دنیا جیسی نظر آتی ہے، وہ کسی فیصلے کا نتیجہ ہے۔ کسی نے کسی وقت ایک فیصلہ کیا تھا تو یہ شے وجود میں آئی تھی۔ اگر وہ فیصلہ نہ کیا گیا ہوتا تو وہ چیز نہ بنتی۔

9۔استقامت

دنیا کے تمام کامیاب لوگوں میں استقامت ہوتی ہے۔ یہ اتنے مستقل مزاج ہوتے ہیں کہ اگر بارش، آندھی، طوفان حتیٰ کہ زندگی کے طوفان بھی آ جائیں تو وہ بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ حضرت خواجہ غلام فریدؒ فرماتے ہیں، ''غلام فرید اجیہا یاں راہ وچ مریاں... نہ اوآر دیاں نہ او پار دیاں'' کہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم... اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ افسوس اس بڑھیا پر جس نے سوت کاتا

اور پھر الجھا دیا۔ حضرت واصف علی واصف فرماتے ہیں، "آدھا راستہ خدانخواستہ... دنیا کا سب سے بڑا عذاب یہ ہے کہ آدھا راستہ کرنے کے بعد واپس ہولیں۔" حضرت واصف علی واصف مزید فرماتے ہیں، "استقامت میں کرامت ہے۔" کرامت والے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس استقامت ہوتی ہے، جو مستقل مزاجی سے کام کرتے رہتے ہیں۔ اگر آدمی مستقل مزاج ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔

10۔محبت

"محبت" کامیابی کی ضمانت ہے۔ جو شخص اپنے کام سے محبت نہیں کرتا، وہ ذہین نہیں ہے۔ وہ کبھی اس کام میں کامیاب نہیں ہوسکتا، خواہ وہ کام کتنا ہی آسان ہو اور کتنے ہی لوگ اس میں کامیابی حاصل کر چکے ہوں۔ محبت کے بغیر کامیابی نہیں۔

زندگی کے سات پہلو ہیں۔ ان میں سے ایک شعبے میں آگ ہوتی ہے۔ اگر اس آگ کو باقی شعبوں میں بھی لگا دیا جائے تو یہ شعبے بھی حرکت میں آجاتے ہیں۔ ڈر شخص ترقی نہیں کرسکتا، محبت کرنے والا اور ترقی کرجاتا ہے۔ دنیا میں کامیاب ہونے والے اکثر لوگوں نے پہلے مجازی محبت کی اور اس محبت نے ان میں جو آگ لگائی، وہ حقیقی محبت میں منتقل ہوگئی۔ مادام کیوری کو ایک امیر لڑکے سے محبت ہوگئی۔ لڑکے کی ماں نے اس کو سر کے بالوں سے پکڑ کر گھر سے نکال دیا اور کہا کہ تمہاری اوقات نہیں کہ تم میرے بیٹے سے محبت کرو۔ مادام نے اپنی محبت کے جذبے کو اٹھایا اور بھٹی میں جھونک دیا اور جب باہر نکلی تو اس نے دنیا کو ریڈیم (تاب کاری) کا تحفہ دیا۔ آج دنیا مادام کیوری کو جانتی ہے، اس لڑکے کو کوئی نہیں جانتا۔ اس موضوع پر ہمارے ہاں کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ اس کی دو وجوہ ہیں۔ اول، پتا ہی نہیں ہوتا، دوم، شرم محسوس کرتے ہیں کہ بچہ تباہ ہو جائے گا۔ گھر میں والدین اور اولاد بیٹھ کر فلمیں ڈرامے دیکھتے ہیں تو شرم نہیں آتی، لیکن اس پر شرم آتی ہے کہ ہم اپنے بچے کو درست رہنمائی دے دیں۔

پیسہ کمانے اور امیر بننے کیلئے ضروری ہے کہ آپ وہ کام کریں جس سے آپ کو

محبت ہو۔ جو لوگ پیسہ کمانے کیلئے کام کرتے ہیں، عموماً وہ امیر نہیں ہو پاتے۔ جو لوگ اپنے شوق سے کام کرتے ہیں یا اپنے کام سے محبت کرتے ہیں، وہ پیسہ بھی کماتے ہیں۔

11۔خوف

جس شخص کی زندگی میں بہت زیادہ خوف ہے، وہ ترقی نہیں کرسکتا۔ ترقی کیلئے بہادری اور جرات کی ضرورت ہے۔ مڈل کلاس کو عام طور پر غریب ہونے کا خوف ہوتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ ہم غریب ہیں، کہیں ہم غریب ہی نہ رہ جائیں۔ دوسرا خوف یہ ہوتا ہے کہ کہیں میں مر نہ جاؤں۔ لوگوں پر اعتماد نہ کرنے کا خوف بھی ہوتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ چلنے کا فن تب ہی آتا ہے کہ جب آدمی کو دھوکا ہوتا ہے۔ آگے نکلنے کیلئے اپنے اندر پائے جانے والے خوفوں کو دبانا اور کچلنا پڑتا ہے۔ اگر خوف کو ساتھ لے کر چلا جائے تو آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔

دنیا کے کامیاب سے کامیاب انسان کو بھی مختلف خوفوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ کامیاب آدمی خوف سے نمٹنے کا گر جانتا ہے اور ناکام فرد پیش آمدہ خوفوں کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔

مائنڈ سائنسز میں خوف کو دور کرنے کے دو بہت ہی موثر طریقے بیان کیے جاتے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ خوف کی توانائی کو موڑ دیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اسے چھوڑ دیا جائے (Emotional Releasing)۔ یہ دونوں طریقے کامیاب لوگ گاہے گاہے اپنے زندگی میں استعمال کرتے ہیں اور اپنے خوفوں کو پچھاڑ دیتے ہیں۔ دنیا بھر میں خوف سے نجات کی مختلف تیکنیکس سکھائی جاتی ہیں۔ آپ یہ طریقے سیکھ کر اپنے خوفوں پر قابو پا سکتے ہیں۔

یہ چند نکات ہیں جو میں آپ کیلئے کتاب Think and Grow Rich سے بیان کر دیے ہیں۔ اگر آپ اپنی زندگی میں پیسہ کمانا چاہتے ہیں یا زندگی کو غیر معمولی بنانا چاہتے ہیں تو میں بہ اصرار یہ تجویز کروں گا کہ آپ یہ کتاب ضرور پڑھیں۔

تعلیم اور آگہی

"اچھا استاد جانتا ہے کہ اپنے طالبعلم کے اندر سے بہترین کیسے نکالنا ہے!"

چارلس کورالٹ

انسان اللہ تعالیٰ کی بہترین مخلوق ہے۔ یہ اس کا نائب اور خلیفہ ہے۔ انسان پیدا ہوتا ہے، لیکن اسے ثابت کرنے کیلئے کہ میں واقعی انسان ہوں، اسے کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ شعور کے بغیر، خود کو شناخت کرنے کی صلاحیت کے بغیر... انسان، انسان نہیں ہوتا۔

پہلے تربیت ہوتی ہے، پھر کسی کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کے قابل بنا جاتا ہے۔ نفسیات کہتی ہے کہ انسان جینز اور عادات کے مجموعے کا نام ہے۔ اگر جین کی بات کی جائے تو یہ اس کی وہ جبلت ہے جو صدیوں سے نسل در نسل چلی آرہی ہے۔ اس کے ساتھ جو عادات بنتی ہیں، اس کو تربیت اور آگہی کا نام دیا جاتا ہے۔

خود شناسی

انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جو خود شناس ہے؛ جو اپنی صلاحیتوں سے واقف ہے؛ جو اپنی خودی سے واقف ہے؛ جو خواب دیکھتی ہے؛ جو سوچتی ہے؛ جو یہ بھی جانتی ہے کہ میرے بنانے والے سے میرا کیا تعلق ہے۔ انسان کی یہی خصوصیات اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ "انسان کی دو

پیدائشیں ہیں۔ ایک وہ جس دن پیدا ہوا، دوسری پیدائش جس دن وہ ڈھونڈ لیتا ہے کہ میں کیوں پیدا ہوا۔" حضرت علامہ اقبالؒ نے یوں کہا کہ "اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی" اور جیسے حضرت بابا بلھے شاہؒ نے کہا، "اپنے اندر جھاتی مار"، جیسے حضرت سلطان باہوؒ نے کہا، "تیرے اندر آپ حیاتی ہو۔"

جو لوگ خود کو شناخت نہیں کرتے، جو لوگ خواب نہیں دیکھتے، جو سوچتے نہیں ہیں، جو اپنی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہوتے، انھیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ برنارڈ شا کہتا ہے کہ "کئی لوگ پچیس سال کی عمر میں مر جاتے ہیں، لیکن دفن پچھتر سال کی عمر میں ہوتے ہیں۔" ایسے لوگوں کے پاس زندگی دنوں، مہینوں اور برسوں کے نام سے ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں زندگی نہیں ہوتی۔ انسان کا ذہن اندازے بناتا ہے اور بعض اوقات ان اندازوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ صرف اعداد کے گورکھ دھندے ہوتے ہیں۔ وہ ریاضی کے چند فارمولے ہوتے ہیں جن کا حقیقی دنیا سے واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن، وہ انھی فارمولوں کو حقیقت سمجھ بیٹھتا ہے۔ جبکہ حقیقت دوسری جانب ہوتی ہے اور وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ لہٰذا، اس کی زندگی بدتر ہو جاتی ہے۔ پھر وہ اپنے قابل رہتا ہے اور نہ معاشرے کے قابل بن پاتا ہے۔

ایک نہیں، کئی ذہانتیں

خود شناسی کی ایک شکل وہ ہے جسے آج دنیا ملٹی پل انٹیلی جنس کے نام سے جانتی ہے۔ انیس سو تیراسی سے پہلے تک بڑی حد تک دنیا میں آئی کیو کا تصور تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو جتنا چیزوں کو اپنے حافظے میں محفوظ کر سکتا ہے یا جو جتنا حساب میں اچھا ہے، وہ اتنا ہی ذہین ہے۔ اس سال ہاورڈ گارڈنر کی تھیوری Multiple Intelligence آئی جس میں اس نے بتایا کہ حافظے میں چیزوں کو محفوظ کر لینا یا حساب کتاب میں اچھا ہونا ہی ذہانت نہیں ہے بلکہ انسان میں آٹھ طرح کی ذہانتیں پائی جاتی ہیں۔ دنیا نے اس نئی تھیوری کو سمجھا اور پھر اسے عملی طور پر بہت ہی قابل قدر جانا۔ پھر اس پر مزید تحقیقات ہوتی رہیں اور اب یہ نصاب کا حصہ ہے۔

اس نظریے کے مطابق، ہر بچے میں یہ نو ذہانتیں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک دو ذہانتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں جو دراصل بچے کی اصل ذہانتیں ہوتی ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے بچوں کو ان کی اصل ذہانتوں کے مطابق تعلیم دیں تاکہ ان کے اندر کی فطری صلاحیتیں باہر آسکیں۔ یوں، وہ خود بھی آگے جاسکیں اور ساتھ ہی ساتھ معاشرے میں بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرسکیں۔ ہمارے پیچھے رہنے کی وجہ یہی ہے کہ ہم اپنا نظامِ تعلیم جدید طریقوں پر استوار نہیں کرسکے۔ ہم نے صرف ڈاکٹرز اور انجینئرز بنانے کی ریس لگائی ہوئی ہے۔ اس کے نتیجے میں بچے نمبر تو لے لیتے ہیں، لیکن شخصیت بنتی ہے اور نہ اُن کا صحیح کیریر بنتا ہے۔ پھر وہ معاشرے میں موثر کردار ادا کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ کثیر جہتی ذہانت کا نظریہ ہمیں اس قابل کرتا ہے کہ ہم مختلف ٹیسٹوں کی مدد سے بچے کی نو ذہانتوں کی سطح پر جائزہ لے کر اس کیلئے کیریر کا انتخاب کریں۔ ایسا کرنے سے وہ نہ صرف زیادہ پیسہ کما سکتا ہے، بلکہ کہیں زیادہ کامیاب ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی خودشناسی ہے۔

تربیت کا فقدان

کبھی تعلیم کا نام تربیت ہوا کرتا تھا، آج تعلیم اور تربیت الگ ہوچکے ہیں اور ان میں اتنا فاصلہ ہوچکا ہے کہ جتنا صحرا اور پہاڑ کے درمیان۔ بقول عبدالستار ایدھی مرحوم کے، ہمارے پاس ڈگری والوں کی فوج ہے، لیکن ان میں سے کسی کے پاس تربیت کا ہتھیار نہیں۔ ہمارے پاس پڑھے لکھے تو بہت ہیں، لیکن ان کے کردار اور رویے کا وہ معیار نہیں جو ہونا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھیں تعلیم تو دے گئی، لیکن تربیت نہیں کی گئی۔ ہمیں بین الاقوامی سازشیں اتنا نقصان نہیں پہنچاتیں جتنی اپنی کوتاہیاں نقصان پہنچاتی ہیں۔

بہ حیثیت قوم، تربیت ہماری ترجیح نہیں رہی۔ یاد رکھیے، بچہ کتابوں سے نہیں سیکھتا، اپنے استاد سے، ٹیچر کو دیکھ کر سیکھتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک بڑی زیادتی یہ بھی ہوئی کہ ہماری تعلیم میں کمرشلزم آچکا ہے۔ اس کی وجہ سے رٹنے اور ڈگریوں کی ریس

شروع ہوگئی۔

چنانچہ علم حاصل کرنے کی بجائے مختلف ٹیکنیکوں پر توجہ ہوگئی۔ نمبر لینا ایک ٹیکنیک ہے، رٹا لگانا ایک ٹیکنیک ہے، پیپر دینا ایک ٹیکنیک ہے۔ یہ سب ٹیکنیکس اپنی جگہ درست، لیکن لازم نہیں کہ زندگی میں بھی اعلیٰ مقام پر لا کھڑا کریں۔ یہ تمام ٹیکنیکیں امتحان میں زیادہ نمبر تو دلا سکتی ہیں، گریڈ بھی بنا سکتی ہیں، مگر زندگی میں سرشاری اور کامیابی کیلئے یہ ٹیکنیکیں کام نہیں کریں گی۔ جب آدمی عملی زندگی میں داخل ہوتا ہے اور وہاں جا کر کام کرنا پڑتا ہے تو پھر اسے پتا لگتا ہے کہ میریٹ کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں کی تو دنیا ہی الگ ہے۔ یہاں مجھے عملی طور پر کام کر کے دکھانا ہے۔ یہاں نتیجہ دینا ہے۔ چونکہ اس نے یہ ٹیکنیکیں سیکھی ہی نہیں ہوتیں تو وہ ناکام ہو جاتا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ہم عملی زندگی کے مطابق اپنے بچوں کو تعلیم دیں، کیونکہ جب بچوں کو عملی کام بتایا جائے گا اور انھیں یہ سکھایا جائے گا کہ مہارت کو کہاں استعمال کرنا ہے، تب ان میں پڑھنے کی جستجو بھی پیدا ہوگی اور موثر زندگی گزارنے کی مہارت بھی آسکے گی۔

ہمارے تعلیمی نظام میں تربیت موجود نہیں ہے۔ اس میں حضرت علامہ اقبالؒ کی معتدل شاعری کے کچھ حصے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ہمارے پاس غیر نصابی لٹریچر جس میں سیرت مصطفیٰ ، حضرت مولانا رومؒ کی مثنوی معنوی، حضرت علامہ اقبالؒ کی شاعری، بابا اشفاق احمد، حضرت واصف علی واصفؒ اور ممتاز مفتی کا اعلیٰ پائے کا لٹریچر کچھ بھی موجود نہیں ہے۔ یہ وہ ادب ہے جو بچے کی تربیت میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ لیکن بچے کو چونکہ نصاب میں دستیاب نہیں تو وہ اپنے ان عظیم ہیروؤں سے ناواقف رہتا ہے۔ یہ وہ لٹریچر ہے جو بازار میں، کتابوں کی دکانوں پر مل جاتا ہے، مگر اسے نہ تو استاد پڑھتا ہے اور نہ شاگرد۔

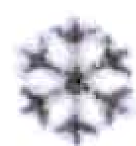
بے فیض اساتذہ، بے فیض شاگرد

تعلیمی اداروں میں جہاں اردو، اسلامیات، میتھ کے ٹیچرز ہیں وہاں تربیت دینے والے ایکسپرٹ بھی ہونے چاہئیں جو نہ صرف بچوں کو تربیت دیں بلکہ ٹیچرز کو بھی

تربیت دیں۔ ترقی یافتہ ممالک میں پڑھانے کیلئے لائسنس لینا پڑتا ہے۔ وہاں اسلحے کا لائسنس آسان ہے، مگر ٹیچنگ کی اجازت لینا مشکل ہے۔ اس ٹیچنگ لائسنس میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ٹیچر کو کتنا اچھا موٹیویٹر ہونا چاہیے۔ اگر اس میں یہ صلاحیت نہیں پائی جاتی تو اسے لائسنس نہیں دیا جاتا۔ ہمارے ہاں ستم یہ ہے کہ ڈرائیور کو گاڑی چلانی آتی ہے، مچھیرے کو تیرنا آتا ہے، کلرک کو اپنی سیٹ پر بیٹھ کر اپنا کام کرنا آتا ہے، لیکن ایک استاد کو اپنے طالب علم سے بات کرنا نہیں آتا۔ جب تک ترجیحات میں، تربیت، شعور اور آگہی نہیں ہوگی، اُس وقت تک ہم ہجوم ہی رہیں گے، قوم نہیں بن سکیں گے۔

ہم انگلش لٹریچر میں مسٹر چپس پڑھاتے ہیں، لیکن اس سے مطلوبہ نتائج نہیں لے پا رہے، اور نہ لے سکتے ہیں۔ ہمیں مسٹر چپس کی جگہ عبدالستار ایدھیؒ کو شامل کرنا چاہیے۔

ہمارے پاس تربیت کا سب سے بڑا منبع سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہمارے نصاب میں سیرت نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمارے اسکولوں میں ہزاروں ہیڈ ماسٹر صاحبان ہیں جنھوں نے خود کبھی سیرت کا مطالعہ نہیں کیا۔ چنانچہ انھوں نے سیرت کے مطالعہ کو نصاب میں ترجیحاً شامل کرنے کا سوچا ہی نہیں۔ ہماری حکومت کو چاہیے کہ تعلیم کو پہلے اپنی ترجیح میں شامل کرے۔ ایک بورڈ بنائے جو ٹیلنٹ تلاش کر سکے، جو اچھے اساتذہ کو تلاش کرے۔ اس کے علاوہ نصاب میں اپنے ہیروز کو شامل کیا جائے، کیونکہ انسانی نفسیات ہے کہ وہ سب سے پہلے ان سے انسپائر ہوتا ہے جن سے اس کی شناسائی ہوتی ہے۔ جب یہ سب کچھ ہوگا تو پھر انقلاب بھی آئے گا، تبدیلی بھی آئے گی اور قوم بھی بنے گی۔



اُستاد کا احترام

''اپنے استاد کی عزت کرو، کیوں کہ اسی کی بدولت آج تم یہ عبارت پڑھنے کے قابل ہو!''

نامعلوم

پڑھانا پیغمبرانہ کام ہے۔ اس پیشے میں عزت اور احترام ہے۔ یہ ایسا پیشہ ہے کہ جس کے ساتھ فقط پروفیسر لگ جاتا ہے تو وہ عام انسان نہیں رہتا، بلکہ علم والا بن جاتا ہے۔ انیس سو اناسی میں مائیکل ہارٹ نے ''دی ہنڈرڈ'' نامی کتاب لکھی۔ وہ اس کتاب میں کہتا ہے کہ دنیا کے افکار پر اگر کسی شخصیت کا سب سے زیادہ اثر پڑا ہے تو وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذاتِ مبارکہ ہے۔ آپؐ نے عرب کے لوگوں کی ایسی تعلیم و تربیت کی کہ وہ لوگ عام انسان سے ''صحابی'' کے درجے پر فائز ہو گئے۔ ایک ایسا شخص جو کلاس میں بچوں کو رٹا لگواتا ہے اور اس رٹے کی بدولت بچوں کو امتحان پاس کرا دیتا ہے، لیکن ان کا کردار نہیں بنا پاتا، ایسی تعلیم دینے والا استاد، استاد نہیں ہوتا۔ وہ صرف معاوضے کے عوض اپنی اجرت پوری کرنے والا شخص ہوتا ہے۔ جو استاد بچوں کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اُن کی تربیت بھی کرتا ہے، وہ بچوں کے دلوں میں جگہ بنا لیتا ہے۔

استاد، ایک سیلز مین

آج کمرشلائزیشن کی دوڑ لگی ہوئی ہے جس میں بچوں کو وہ لوگ تو مل رہے ہیں جو کمرشل کے لحاظ سے استاد کی تعریف پر پورا اترتے ہیں، لیکن تربیت کے لحاظ سے استاد کی تعریف پر پورا نہیں اترتے۔ اس کمرشلائزیشن میں استاد کی حیثیت ایک سیل

مین کی سی رہ گئی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ضرورتیں پوری کرنے کیلئے پیسہ ایک لازمی شے ہے، لیکن ٹیچنگ کا سب سے بڑا آؤٹ کم "عزت" ہے۔ جس طرح تنخواہ کمانے والی چیز ہے، اسی طرح عزت بھی کمانے والی چیز ہے۔ اگر استاد کو عزت نہیں مل رہی تو پھر اس تنخواہ کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔

ٹیچنگ وہ واحد شعبہ ہے جس سے معاشرے کے سبھی شعبہ جات نکلتے ہیں اور معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ اگر استاد ٹھیک نہیں ہے تو پھر معاشرہ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ اگر استاد قابل نہیں ہے تو معاشرہ بھی قابل نہیں ہوگا۔

استاد کی استادی نہ رہی...

ماضی میں ایک استاد اپنے طلبہ کا وہی مُرشد بھی ہوتا تھا، وہی میٹور بھی ہوتا تھا۔ وہی کوچ ہوتا تھا۔ وہی گرو ہوتا تھا اور وہیں سے انسپائریشن ملتی تھی۔ آج تعلیم اور تربیت دونوں علیحدہ ہو چکے ہیں۔ تعلیم اگرچہ ڈگری کے لحاظ سے تو بہت آگے نکل چکی ہے، لیکن تربیت بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ اب یہ تربیت کسی حد تک مسجد کے منبروں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے اور وہ بھی خال خال۔

کلاس روم میں پڑھانے والے استاد کی ذمے داری ہے کہ وہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ بچوں کی تربیت بھی کرے۔ اس میں کردار کے جتنے اچھے پہلو ہیں، وہ بچوں میں بھی پیدا کرے۔ المیہ یہ ہے کہ اس پیشے میں ایسے لوگ آگئے ہیں جن کے پاس پڑھانے کی صلاحیت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اساتذۂ کرام کو بھرتی کرنے کا جو سسٹم ہے، اس میں اُن مہارتوں اور خوبیوں کو پرکھا ہی نہیں جاتا کہ جن مہارتوں اور خوبیوں کا ایک موثر استاد میں ہونا ضروری ہے۔ مثلاً یہ نہیں دیکھا جاتا کہ استاد کو بولنا آتا ہے یا نہیں۔ وہ اپنے مضمون میں ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ آیا یہ مضمون سمجھانے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ جس کا کام ہی پڑھانا ہے، جس کا کام ہی گفتگو ہے، جس کا کام ہی بات سمجھانا ہے، جب تک اس کی یہ بنیادی صلاحیتیں پرکھی نہیں جائیں گی، اس وقت تک اس پیشے کے ساتھ بہت زیادتی ہوتی رہے گی۔

تدریس، اسلحہ اور بارود سے زیادہ خطرناک ہے

ہمیں تعلیمی اداروں میں اساتذہ کو ٹیچنگ لائسنس کے بغیر نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر گاڑی کا لائسنس ہوسکتا ہے، اسلحے کا لائسنس ہوسکتا ہے تو پھر استاد کا بھی لائسنس ہونا چاہیے کیونکہ ٹیچنگ قوم کیلئے زیادہ حساس معاملہ ہے۔ ہمارے ہاں روایتی پڑھا لکھا شخص استاد بن جاتا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھا جاتا کہ اس میں پڑھانے کی صلاحیت کتنی ہے۔ یہ سمجھئے کہ ہر پڑھا لکھا شخص اپنی بات نہیں سمجھا سکتا۔ سمجھنا اور سمجھانا، دو الگ الگ صلاحیتیں ہیں۔

ہمارے ہاں ایک المیہ یہ بھی ہے کہ تدریس کے پیشے کو معتبر نہیں سمجھا جاتا اور نہ اسے کوئی قدر دی جاتی ہے۔ باباجی اشفاق احمدؒ فرماتے ہیں، ''ہمارے ہاں جوتے شو کیس میں سجائے جاتے ہی جبکہ کتابیں فٹ پاتھ پر پڑی ہوتی ہیں۔ قوم کو جوتوں کی ضرورت ہے، کتابوں کی ضرورت نہیں ہے۔'' لوگ مہنگا برگر کھا لیتے ہیں، لیکن استاد کو اچھی فیس ادا کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ جب تک یہ پیشہ ہماری ترجیحات میں نہیں ہوگا، اس وقت تک بہتری نہیں آئے گی۔

مار پیٹ کیوں

تعلق کے بغیر مار بڑی خطرناک چیز ہے۔ آج کا استاد اپنے طالب علموں کے ساتھ تعلق نہیں بناتا۔ اگر تعلق بن جائے تو پھر مار پیٹ کی نوبت ہی نہیں آتی۔ جب تعلق بن جاتا ہے تو ڈانٹ یا مار تو بڑی بات ہے، ناراضگی ہی طالب علم کو مجروح کر دیتی ہے۔ بچے کو ڈر ہوتا ہے کہ کہیں استاد ناراض نہ ہو جائے۔ وہ اس ناراضگی سے بچنے کیلئے کام کرتا ہے۔

ماہر اور موثر استاد جو سمجھ دار ہوتا ہے، وہ مار کو بھی کسی حساب سے اختیار کرتا ہے۔ وہ بھی ایسی غلطی نہیں کرتا جس سے بچہ دل سے دور ہو جائے۔ تعلق رکھ کر بچے کو تعلیم دینا ہی صحیح طریقہ ہے۔ اسی سے بچے کے دل میں استاد کا احترام پیدا ہوتا ہے۔

مار آخری حربہ ہوسکتا ہے، لیکن مار سے پہلے بچے کی غلطی کی نشان دہی کرنی

چاہیے، اسے وارننگ دینی چاہیے، غلطی کی اصلاح ہونی چاہیے، دل لے کر بات کرنی چاہیے، ابتدا میں بالواسطہ سمجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مار ایک ایسا حربہ ہے جس کے بعد تمام حربے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد نصیحت بے معنی ہو جاتی ہے اور الٹا بچے میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور جب دل میں نفرت آ جائے تو وہ سیکھ نہیں سکتا اور نہ احترام کر سکتا ہے۔

پریشان حال اساتذہ

جب آدمی کو اپنا کام آتا ہے تو وہ ڈپریشن کا شکار نہیں ہوتا، بلکہ وہ کام کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی تھکاوٹ بھی کام سے اتارتا ہے اور اس کی روح بھی خوش ہوتی ہے۔ جو کام اس کے بس کا روگ نہیں ہے، وہ کرنے سے اسے فرسٹریشن ہو جائے گی۔ وہ اسے کر کے پریشان ہوگا۔ اسے تھکاوٹ محسوس ہوگی۔ اس کا غصہ کہیں کا ہوگا اور وہ اسے کہیں اور نکالے گا۔ ہمارے استاد کا معاملہ بھی یہی ہے۔ جب یہ سب کچھ ہوتا ہے تو اس کی زندگی منظم نہیں ہوتی۔ اس کا عدم نظم اس کے رویے اور برتاؤ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ وہ دورانِ تعلیم جارحانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ جب ایسے لوگ تعلیمی اداروں میں بھرتی ہوتے ہیں تو طلبہ میں بھی رویے بدلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ آپ کو تعلیمی اداروں میں جو لڑائی جھگڑے اور بلوے ملتے ہیں، اس کا بنیادی سبب یہ ہے۔

واضح رہے، استاد ایک رویے کا نام ہے۔ یہ کوئی عہدہ نہیں ہے۔ اگر رویہ مثبت نہیں ہے، اس میں احترام نہیں ہے تو پھر اس کا احترام نہیں کیا جائے گا۔ جس استاد کا رویہ آپ کے ساتھ باپ والا، شفقت والا، احترام والا نہیں ہے تو اس سے معذرت کر لینا ہی بہتر ہے۔

استاد کے اس رویے کی بہت بڑی وجہ وہ فرسٹریشن ہے جو خود استاد میں پائی جاتی ہے۔ انھیں مناسب عمر میں مناسب تعلیم کے ساتھ جاب مل جاتی ہے۔ ان کی نہ فکری اور نفسیاتی نمو ہوتی ہے اور نہ پڑھانے کا درست تجربہ ہوتا ہے۔ انھیں یہ شعور بھی نہیں

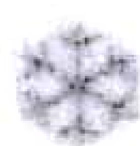
ہوتا کہ استاد کا کام صرف اپنے مضمون کے چند ابواب پڑھا دینا اور چند سوالات سمجھا دینا نہیں ہے، اس کے ہاتھ میں قوم اور ملت کی باگ ڈور ہے۔ جب ایسے استاد کے ہاتھ میں نمبر دینے کی اتھارٹی آجاتی ہے تو وہ کالج اور یونیورسٹی میں بیٹھ کر بلیک میل کرتا ہے۔ یہ بلیک میلنگ کبھی نمبروں کی ہوتی ہے، کبھی وائیوا کی ہوتی ہے، کبھی کاپی چیک کرنے کی ہوتی ہے، کبھی انٹرنل مارکس کی ہوتی ہے، کبھی کسی نالائق کو آگے کرنے کی ہوتی ہے۔ یہ وہ خرابیاں ہیں جو ہمارے تعلیمی نظام میں، ہمارے اساتذہ میں پائی جاتی ہیں۔ برائی کو ختم کرنے کیلئے برائی کی نشان دہی بہت ضروری ہے۔ برائی ختم کرنے کیلئے لازم ہے کہ اس کے خلاف اعلان کیا جائے، اس کا اظہار کیا جائے۔ اگر یہ نہیں ہوسکتا تو کم از کم نفرت تو کی جاسکتی ہے۔

اساتذہ کی تربیت، اشد ضرورت

المیہ یہ بھی ہے کہ اساتذہ کی تربیت نہیں ہو رہی۔ ہمارے ہاں اساتذہ کی بہتری کے حوالے سے جو تھوڑی بہت ٹریننگ ہے، وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ آج دنیا کے ترقی یافتہ ممالک میں اساتذہ کی تربیت کیلئے نت نئے طریقے اختیار کیے جارہے ہیں۔ نئے نئے اوزار اور مشقیں ترتیب دی گئی ہیں۔ ہمارے ہاں، روایتی اور لگے بندھے طریقوں کے مطابق تربیت کا سلسلہ جاری ہے جہاں سوائے "نشستن، گفتن، برخاستن" سے زیادہ کچھ نہیں۔

کیا آپ اپنے بچے کے ساتھ مخلص ہیں؟

اگر اپنے ساتھ مخلص ہیں، اپنے بچوں کے ساتھ مخلص ہیں، اپنے ملک اور قوم کے ساتھ مخلص ہیں... تو ہمیں سب سے بنیادی کام اپنے استاد پر کرنا ہوگا۔ استاد کی حیثیت قوم کے شعور میں ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ آپ اپنے بچوں کو اچھا استاد فراہم کردیں، آپ کا بچہ اچھا لیڈر بن جائے گا۔



ولایت کا خبط

"تمہیں صرف ایک زندگی ملی ہے، لیکن اگر وہی درست انداز سے گزار لو تو کافی ہے!"

مائے ویسٹ

ہر شخص کا خواب ہوتا ہے کہ وہ معاشی طور پر خوش حال ہو اور دنیا میں آرام و سکون کے ساتھ زندگی گزارے۔ اپنے اسی خواب کی تکمیل کیلئے وہ محنت کرتا ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں معاشی خوش حالی حاصل کرنا قدرے آسان ہوتا ہے، کیونکہ وہاں زیادہ مواقع میسر ہوتے ہیں اور غیر یقینیت کم ہوتی ہے۔ لیکن ترقی پذیر ممالک میں خوش حالی حاصل کرنے کیلئے زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ زیادہ محنت سے بچنے کیلئے لوگ باہر کے ملکوں کا رخ کرتے ہیں۔

بیرونِ ملک کا خواب دیکھنے والوں کا مغالطہ

پاکستان کا شمار ترقی پذیر ممالک میں ہوتا ہے۔ یہاں پر کثیر تعداد ایسی ہے جو یہ سمجھتی ہے کہ اگر ہم باہر جائیں گے تو خوش حال ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ اپنی خواہشوں اور کمزوریوں کے غلام ہوتے ہیں۔ ایسے میں باہر بھجوانے والے ایجنٹس ان لوگوں کی کمزوریوں اور خواہشوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور انھیں سبز باغ دکھاتے ہیں۔ چنانچہ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جیسے ہی ہم ولایت میں قدم رکھیں گے، ہمارے تمام دلدّر دُور ہو جائیں گے۔ لیکن، ہوتا یہ ہے کہ اپنے خوابوں کی تکمیل کیلئے جیسے ہی وہ بیرون ملک پہنچتے ہیں، انھیں حقیقت کا پتا چلتا ہے اور پھر وہ واپس آنے کے

جشن کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر وہی مائیں جنھوں نے کبھی اُن کے باہر جانے کی دعائیں مانگی ہوتی ہیں، اُن کے واپس آنے کی دعائیں کر رہی ہوتی ہیں۔

بیٹھے بٹھائے کچھ نہیں ہونے کا

ہمارے ہاں تین المیے بہت عام ہیں۔ ان میں پہلا المیہ یہ ہے کہ ہر شخص دعویٰ کر رہا ہوتا ہے کہ میں ہنرمند ہوں، لیکن میری کوئی سنتا نہیں ہے، میرا یہاں کام نہیں ہے۔ یہ سراسر غلط بیانی ہے۔ دوسرا المیہ کام چوری ہے۔ لوگ کام نہیں کرنا چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہمیں بیٹھے بٹھائے مل جائے۔ تیسرا المیہ یہ ہے کہ لوگ کہتے ہیں، ہم کوئی چھوٹا موٹا کام نہیں کریں گے، ہمیں بڑا کام چاہیے۔

وہ نوجوان جو باہر جانا چاہتے ہیں یا وہ والدین جو اپنے بچوں کو باہر بھیجنا چاہتے ہیں، وہ دیکھیں کہ کیا اُن میں ٹیلنٹ ہے؟ کیا اُن میں صلاحیت ہے؟ کیا وہ پڑھے لکھے ہیں؟ اگر پڑھے لکھے نہیں ہیں تو کیا انھیں کوئی ہنر آتا ہے۔ عقل مندی یہ ہے کہ جس کے پاس ہنر ہے، وہ یہاں رہ کر کام کرے۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ لاہور جیسے بڑے شہر میں اگر قابل میکینک تلاش کرنا ہو تو اس کا ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ یہاں پر بھی موقعوں کی کمی نہیں ہے۔ اگر کوئی کمی ہے تو وہ قابلیت کی کمی ہے۔

والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچوں میں محنت کرنے کا جذبہ پیدا کریں۔ انھیں وقت پر کام کرنا سکھائیں۔ ان کی ایسی تربیت کریں کہ انھیں کام کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہ ہو۔ جب ایسا ہوگا تو پھر بچے محنت بھی کریں گے اور باہر جانے کے بارے میں بھی نہیں سوچیں گے۔

خاندانی ابتری

نوجوانوں کی اکثر تعداد جو باہر جانا چاہتی ہے، وہ یہاں اپنے ملک میں کام کو عار سمجھتی ہے۔ جب وہ باہر چلے جاتے ہیں تو وہاں جا کر بہت ہی معمولی کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہاں جو نوجوان آٹھ گھنٹے کام کرنے کو تیار نہیں ہوتا، باہر جا کر بارہ سے سولہ گھنٹے کام کرتا ہے۔ بلکہ وہ وہ کام کر رہے ہوتے ہیں جس کے بارے میں انھوں

نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔ پھر اس کام سے تھوڑے بہت پیسے کماتے ہیں، ان میں سے کچھ بچا کر باقی اپنے گھر والوں کو بھیجتے ہیں۔

باہر بھیجنے کے معاملے میں والدین کا بھی کردار بھی بہت اہم ہوتا ہے۔ پہلے تو ماں اپنی جمع پونجی اور زیورات بیچ کر اپنے بچے کو باہر بھیجتی ہے۔ پھر جب بچہ باہر جا کر سیٹل ہو جاتا ہے تو وہ اس کے انتظار میں آنسو بہاتی رہتی ہے، یہاں تک کہ بعض اوقات اس کے آنسو تک خشک ہو جاتے ہیں اور جب بچہ واپس آتا ہے تو اسے سوائے مٹی کے ڈھیر کے اور کچھ نہیں ملتا۔ اس سے سماجی بحران پیدا ہوتا ہے۔ گھروں میں لڑائی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ بیوی اپنے خاوند کے انتظار میں اپنے بال سفید کر لیتی ہے تو بچوں کی تربیت میں کمی رہ جاتی ہے، یہاں تک کہ نسلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

ہمارے ہاں ایک گھر میں کمانے والا ایک ہوتا ہے جبکہ کھانے والے دس بارہ افراد ہوتے ہیں۔ چنانچہ کمانے والا شخص مشین بن کر رہ جاتا ہے۔ چین ہمارا ہمسایہ اور دوست ملک ہے جہاں گھر کے تمام افراد کے کمانے کا کلچر ہے۔ وہاں چھوٹے کام کو عار نہیں سمجھا جاتا۔ چھوٹے کام کو بھی عزت دی جاتی ہے۔ وہاں ہر شخص اپنی آمدن، اپنی جیب اور اپنے اکاؤنٹ کو دیکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ملک ترقی کر رہا ہے۔ وہاں اٹھارہ سال کا نوجوان بھی کام کرتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں کی ماں اسی عمر کے فرد کو سونا، کاکا، لاڈلا، پتر، شہزادہ کہہ کر پکارتی ہے۔ اسے کالج میں داخلہ بھی لینا ہو تو وہ اپنی ماں کی انگلی پکڑ کر جاتا ہے۔ جب اپنے اولاد کے ساتھ ماؤں کا یہ رویہ ہوگا تو اولاد بھی "منا" بن کر رہے گی۔

یہ بھی کثرت سے دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک شخص جب کمانے کی غرض سے باہر جاتا ہے تو وہ وہیں کا ہو رہتا ہے۔ پیچھے اس کے بیوی بچے اس کے بغیر رہنا سیکھ لیتے ہیں۔ پھر جب وہ بوڑھا ہو کر واپس آتا ہے تو بچے باپ کی محبت اور شفقت سے آشنا نہیں ہوتے اور نہ بچوں کے ساتھ اس کا جذباتی لگاؤ ہوتا ہے۔ گھر والے اسے پیسے بھیجنے والے سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ گھر میں اس کے پاس کوئی مصروفیت نہیں ہوتی۔ اس کا سماجی حلقہ نہیں ہوتا۔ وہ تمام لوگ جو لالچ کی غرض سے اس سے ملنے آیا کرتے تھے، وہ

منہ موڑ لیتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر اس کے پاس سوائے تنہائی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔

یہاں مواقع کی کمی نہیں

جو نوجوان باہر جانا چاہتے ہیں انہیں چاہیے کہ یہاں پر رہ کر روکھی سوکھی کھائیں، مگر باہر نہ جائیں۔ یہیں محنت کریں۔ اگر انہیں گلہ ہے کہ اس ملک میں مواقع نہیں ہیں تو کبھی ان لوگوں کو بھی دیکھیں جنھوں نے انہی وسائل میں رہتے ہوئے بڑی کامیابی حاصل کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے وسائل کی قلت اور مسائل کی زیادتی کا رونا نہیں رویا، بلکہ اپنے لیے مواقع خود پیدا کیے۔ ہمارے ملک میں ایسی سینکڑوں کہانیاں ہیں کہ جنھوں نے اپنا سفر غربت سے شروع کیا اور امارت تک پہنچے۔ جنھوں نے ناکامیوں سے اپنا سفر شروع کیا اور کامیابیاں حاصل کیں۔ بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کا ہاتھ نیچے تھا، مگر محنت کی تو وہ اوپر والا ہاتھ بن گیا۔

معروف زمانہ ہنری فورڈ کا قول ہے کہ اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ آپ کر سکتے ہیں یا یہ مانتے ہیں کہ نہیں کر سکتے، دونوں ہی صورتوں میں آپ کیلئے یہ بات حقیقت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ یہ ٹھان لیتے ہیں کہ پاکستان میں رہ کر معاشی خوش حالی حاصل کی جا سکتی ہے، تب آپ یہاں رہ کر ایسا کر سکتے ہیں، لیکن اگر آپ یہ ماننے کو تیار ہی نہیں کہ پاکستان میں رہ کر اچھا کمایا جا سکتا ہے تو آپ یہاں کبھی کما نہیں پائیں گے۔

اصل یہ ہے کہ یہ دریافت کیا جائے کہ کیا میں یہاں رہ کر کامیاب ہو سکتا ہوں یا نہیں؟ کیا میرے لیے ولایت جانا ضروری ہے؟ کیا میری مہارت کی نسبت سے پاکستان میں مواقع نہیں ہیں؟

قسمت کا رونا رونے سے کوئی فائدہ نہیں

ہم لفظ ''قسمت'' کے ساتھ بہت زیادتی کرتے ہیں۔ ہم اپنی تمام ناکامیاں قسمت کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ ہم اچھے بچے کی مہارت میں کمی کو، اپنی کوتاہی کو، کام چوری کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم صرف کھلانے کو پالنا سمجھتے ہیں، ہم اسکول فیس ادا

کرنے کو تربیت سمجھتے ہیں، جب یہ زیادتیاں بچپن سے ہوتی ہیں تو پھر وہ بچہ نہ گھر کے کام کا رہتا ہے اور نہ ملک کی خدمت کے قابل ہوتا ہے۔ ہم بچے کے ذہن میں بچپن سے ہی یہ بٹھا دیتے ہیں کہ گلف میں بہت پیسہ ہے، یورپ میں بہت پیسہ ہے، امریکا میں بہت آزادی ہے، آسٹریلیا میں بہت پیسہ ہے جس کی وجہ سے وہ بچپن سے ان ممالک کے خواب دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور اپنا ارادہ یہ بنالیتا ہے کہ مجھے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیرونِ ملک جانا ہے۔

خواب دیکھنا بری بات نہیں ہے، لیکن خواب وہ دیکھنے چاہئیں جو مبنی بر حقیقت ہوں۔ ایسے خواب جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ دیوانے کی بڑ ہیں۔ ایسے خواب خودفریبی ہیں۔ ایسے خواب دیکھ کر آپ خود کو دھوکا دیتے ہیں۔

دنیا بڑی سیانی ہے۔ اسے پتا ہے کہ آدمی کے ٹیلنٹ کو کس طرح استعمال کرنا ہے۔ بالخصوص لیبر کلاس تو کسی کھاتے میں نہیں آتی۔ ایسے لوگ اپنے خوابوں کی تکمیل کیلئے غیر قانونی طریقوں سے باہر جاتے ہیں اور پھر اپنی زندگیاں برباد کر لیتے ہیں۔

اسلامی اقدار سے لاعلمی

جن لوگوں کو باہر گئے ایک عرصہ ہوگیا ہے، اب وہ اپنی فیملیز کے ساتھ وہاں رہ رہے ہیں، اُن کے ساتھ یہ بہت بڑا مسئلہ آرہا ہے کہ ان کے بچوں کی اسلامی اقدار کے مطابق تربیت نہیں ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہاں پرلا اینڈ آرڈر کی صورت حال اچھی ہے، سسٹم بہتر ہے، لیکن وہ کلچر اسلامی نہیں ہے۔ اُن کی اقدار غیر اسلامی ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال پہلے جب وہ اپنے بچوں کو لے کر باہر جا رہے تھے تو ان کو گمان بھی نہیں تھا کہ اپنے چھوٹے بچوں کو وہ اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں، وہ دین سے دور ہو جائیں گے۔ لیکن، اس کا تعلق آدمی کی خواہش سے نہیں، قانونِ قدرت سے ہے کہ انسان جس ماحول میں رہتا ہے، وہیں کا طرز اختیار کرتا ہے۔

دین سے دوری اور اسلامی تربیت کے نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب ان بچوں کی تربیت کا وقت تھا، اس وقت دونوں میاں بیوی جاب کرتے رہے۔ انھوں نے

اپنے بچوں پر توجہ ہی نہیں دی۔ انھیں پیسہ تو مل گیا، لیکن ایمان چلا گیا۔ ایسے بچوں کو نہ نماز کا پتا ہوتا ہے، نہ قرآن کا، نہ دین کا، نہ اسلام کا۔ انھیں اللہ کا شعور ہوتا ہے اور نہ رسول کا۔ ان پر وہی رنگ چڑھ جاتا ہے جس کلچر میں وہ پروان چڑھتے ہیں۔ اگلا مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے بچوں کی شادیاں بھی یہاں نہیں ہوتیں۔ وہ بھی وہاں ہوتی ہیں۔ جب ان سے نئی نسل آتی ہے تو اس کا واسطہ نہ پاکستان کے ساتھ ہوتا ہے اور نہ اسلام کے ساتھ۔ کون قصوروار ہے؟ یہ سب کیوں ہوا؟

یہ ایک مزاج کا نام ہے۔ اس کی بنیاد ہمارے تعلیمی نظام سے پڑتی ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام اور ہمارا میڈیا پاکستانیت پیدا نہیں کر رہا۔ جتنی محبت ماں سے ہوتی ہے، اتنی ہی ملک سے ہونی چاہیے۔ اب تو ماں سے بھی محبت نہیں ہوتی۔ جبھی تو ماں باپ کو چھوڑ کر جاتے ہیں اور ان کی موت پر بھی بہ مشکل آتے ہیں۔ کتنے ہی جوان ہیں جو یورپ گئے اور صرف ویزا نہ لگنے کی وجہ سے اپنے ماں یا باپ کو کندھا دینے کیلئے بھی نہ آ سکے۔

ولایت کا خبط ہونے کی ایک وجہ دیگر ممالک کی برانڈنگ بھی ہے۔ جن ممالک میں ملازمت کے مواقع ہیں، انھوں نے خوب تشہیر کی ہے کہ ہمارے ہاں جاب ہے۔ جہاں حسین مقامات ہیں، انھوں نے ٹورزم کی برانڈنگ کی ہے۔ بعض ممالک نے شاپنگ کی برانڈنگ کی ہے۔ دنیا بھر سے لوگ وہاں شاپنگ کیلئے پہنچتے ہیں۔ پاکستان میں اچھا کیا ہے؟ اس کی برانڈنگ نہیں کی گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ برین ڈرین ہونے یعنی ذہین و فطین جوانوں کے ملک سے جانے کی بہت بڑی وجہ یہاں پر معاوضے کا اچھا نہ ہونا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ مزدور طبقہ (لیبر کلاس) جس کے پاس یہاں کمانے کے مواقع بھی ہیں اور اسے اس کی مہارت کا درست معاوضہ بھی یہاں مل جاتا ہے، وہ کیوں اس سسٹم کے ہتھے چڑھ جاتی ہے؟ کچھ ہی عرصہ میں یہ لوگ کسی قابل نہیں رہتے۔ جب واپس وطن لوٹتے ہیں تو نہ وہ گھر کے ہوتے ہیں اور نہ گھاٹ کے۔

قابلیت سے بادشاہت ہوتی ہے۔ اگر کوئی پڑھنے میں لائق ہے اور مزید اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے ضرور باہر جانا چاہیے۔ ہر اچھا ملک اسکالرشپ دیتا ہے۔

اس آفر کو ضرور قبول کرنا چاہیے۔ پڑھائی کے دوران اگر انھیں روزگار کا موقع مل جاتا ہے تو اسے ضرور کرنا چاہیے۔ اس سے نہ صرف ملک کی نیک نامی میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ملک میں زرمبادلہ بھی آتا ہے۔ لیکن اپنے ملک کو بھی نہیں بھولنا چاہیے۔ قابل شخص کیلئے پاکستان آنا جانا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ مسئلہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو ایک دفعہ یہاں سے چلے جاتے ہیں، لیکن واپسی کیلئے ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ جنھیں واپسی کیلئے دو دو سال انتظار کرنا پڑتا ہے، وہ اس لیے واپس نہیں آپاتے کہ کفیل انھیں اجازت ہی نہیں دے رہا۔

حقائق سے آشنا ہوں

یقین جانئے، کسی کے ولایت جانے سے گھر والوں کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، ہاں، جس ملک گئے ہیں، اس ملک کا اور ایجنٹ کا ضرور فائدہ ہوتا ہے۔ اجتماعی سطح پر، یہ سسٹم کی بھی غلطی ہے اور انفرادی سطح پر ہمارا قصور بھی ہے۔ انفرادی حیثیت سے ہر فرد کی یہ ذمے داری ہے کہ وہ حقیقت جانے۔ وہ کھوج لگائے کہ میں جو اقدام کرنے جارہا ہوں، بادی النظر میں اس کے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟ کیا میں درست سوچ رہا ہوں؟ کیا میرا ایجنٹ جو دعوے کررہا ہے، وہ سچے ہیں؟ ایسے کئی سوالات ہیں جو آپ کی آنکھیں کھول سکتے ہیں۔ حقیقت تک رسائی کا یہ عمل اگرچہ تلخ ہے، مگر آپ کو بہت سی صعوبتوں سے بچا سکتا ہے۔

مزاج کی تشکیل

ہمارے تعلیمی نظام میں تمام تر توجہ ڈگری کے حصول پر دی جاتی ہے، طلبہ میں صلاحیتوں کا فقدان رہتا ہے۔ جب تک تعلیمی نظام میں صلاحیتوں اور مہارتوں کو بہتر بنانے پر توجہ نہیں کی جائے گی، اس وقت معاشرے میں بھی بہتری نہیں آسکتی۔ اگر صلاحیت ومہارت ہو تو یہاں بھی ملازمتوں کے بیش بہا مواقع موجود ہیں۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں تربیت کا بھی فقدان ہے۔ تربیت ہمارے ایجنڈے میں شامل نہیں ہے، ہم تعلیم کو تربیت کے بغیر سمجھتے ہیں۔ جب تربیت ترجیح میں

شامل نہیں ہوگی تو پھر تعلیمی ادارہ پڑھا تو دے گا، لیکن تربیت نہیں کرے گا۔ ہم نے تربیت کو نصاب سے بے دخل کر دیا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں نتیجہ بھی تربیت کی شکل میں نہیں مل رہا۔ کام کی عظمت کا مضمون پڑھایا جا رہا ہے، لیکن کام کی عزت دلوں میں پیدا نہیں ہو رہی۔ دیانت داری کے مضمون میں پورے نمبر آ رہے ہیں، لیکن وہ خود دیانت دار نہیں ہے۔ مضمون پڑھانے سے دیانت داری اور کام کی برکات پیدا نہیں ہوتیں، یہ کردار کی چیز ہے۔ طلبہ کو جب یہ اپنے اردگرد ماحول میں نظر آئیں گی تو پھر دیانت داری پیدا ہوگی۔ آج بچے کو استاد میں دیانت نظر آتی ہے اور نہ گھر میں کہیں دیانت دار کردار ملتا ہے۔ تو پھر، اسے کیسے پتا چلے گا کہ دیانت کس بلا کا نام ہے؟ نتیجہ یہ ہے کہ کردار کی یہ ساری خوبیاں ناپید ہو رہی ہیں اور ایک بڑی فوج پیدا ہو رہی ہے جو غیر ماہر ہے، جو بے روزگار ہے، جو باہر جانے کے خواب دیکھتی ہے۔ پھر امیگریشن ایجنسیں انھیں سبز باغ دکھاتے ہیں اور لمبا پھنساتے ہیں۔

دوسری اہم شے ہے، اپروچ، یعنی آدمی کی ذہنیت اور مزاج۔ یونیورسٹی سے نکلنے والا طالب علم خود کو ملازمت کیلئے تیار کرتا ہے۔ اس کی ذہنیت ہی یہ بن جاتی ہے کہ مجھے اچھے نمبر لے کر اچھی کمپنی میں ملازمت کرنی ہے۔ حالانکہ اللہ نے اپنے کام میں، اپنے کاروبار میں کہیں زیادہ فائدہ اور برکات رکھی ہیں۔ لیکن، چونکہ اپروچ ہی غلط ہوتی ہے، مزاج ہی غلط تشکیل دیا جاتا ہے، اس لیے نوجوان صرف جاب کا سوچتا ہے اور پھر وہ خود کو ”نوکر“ کی حیثیت سے دیکھتا رہتا ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں میں اپنے اسٹوڈنٹس کا یہی ویژن بنایا جاتا ہے۔

ایک چھوٹی انڈسٹری لگانے کیلئے زیادہ تعلیم نہیں چاہیے۔ اس کیلئے بزنس مین والی اپروچ ضروری ہے۔ اگر تعلیمی اداروں میں اس فکر کو پروموٹ کیا جائے تو بہت بڑا مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ اداروں کو چاہیے کہ ان لوگوں کو تعلیم دیں جنھیں تعلیم چاہیے۔ اُن لوگوں کو اسکل دیں جنھیں ہنر کی ضرورت ہے۔ ہنر مندوں کو بھی پڑھا لکھا مانا جانا چاہیے، کیونکہ عین ممکن ہے کہ ایک میکینک اپنی مہارت کے لحاظ سے ایم ایس سی ہو، عین ممکن ہے کہ ٹل چلانے والا اہلیت کے اعتبار سے بی اے زیادہ ہو۔ عین ممکن ہے، ایک شخص اپنے

کام کے حوالے سے پی ایچ ڈی ہو اور اپنی فیلڈ میں اتھارٹی مانا جاتا ہو۔ ہم نے یہ بہت بڑی زیادتی کی ہے ڈگری لینے والے ہی کو پڑھا لکھا سمجھتے ہیں۔ ایک ہنر مند اور ماہرِ فن کو کچھ جانتے ہی نہیں۔

ایک بہت بڑا کام جس کی ضرورت شاید پہلے کبھی اتنی ضرورت نہ تھی، یہ ہے کہ معاشرے میں مثبت مزاج یعنی Positive Approach کی ترویج کی جائے۔ ہمارے ہاں، میڈیا اور سیاست داں مل کر منفی مزاج کی تشکیل کر رہے ہیں۔ خامیوں، خطرات اور خرابیوں کا اتنا چرچا کیا گیا ہے کہ اگر کوئی موٹیویشن کی بات کرے، کوئی خوبیاں بیان کرے اور مواقع بتائے تو اس کی بات پر یقین کرنا مشکل ہوتا ہے۔

عصرِ حاضر میں یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن نے اسی چیلنج کو چیلنج کیا ہے۔ ہم نے اپنی معزز کرفرماؤں کے ساتھ مل کر معاشرے میں منفی مزاج کی جگہ مثبت مزاج کی تشکیل کا بیڑا اٹھایا ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ ہمیں اس مقصد میں کامیاب کرے۔ آمین۔



خوشی کیسے؟

"خوشی کا مطلب یہ نہیں کہ سب کچھ ٹھیک ہے، بلکہ آپ خامیوں سے آگے دیکھنے کے قابل ہو گئے ہیں!"

جیرارڈ وے

خوشی کیا ہے؟ خوشی کی کوئی متفقہ تعریف نہیں ہے۔ اس کی تعریف نفسیات میں کچھ ہے، سماج میں کچھ ہے، حالات میں کچھ ہے، غریب کیلئے کچھ ہے، امیر کیلئے کچھ ہے، طالب علم کے لحاظ سے کچھ ہے اور بزنس مین کے لحاظ سے کچھ اور ہے۔ خوشی ایک انفرادی معاملہ ہے۔ اس کا معیار ہر ایک کیلئے جدا جدا ہے۔ انسان کی خوشی بہ ظاہر، اس کی خواہشوں اہداف سے جڑی ہوئی ہے۔

خوشی حقیقتاً ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ آدمی جب اپنے آپ کو اچھا محسوس کرتا ہے اور اسے کام کرنے میں لطف ملتا ہے تو وہ گویا، خوش ہے۔

خوشی اندر کا معاملہ ہے

خوشی اندر کی شے ہے۔ خوشی نظر نہیں آتی۔ خوشی محسوس ہوتی ہے۔ سکون محسوس ہوتا ہے۔ اطمینان محسوس ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں نظر نہیں آتیں، لیکن اپنا وجود رکھتی ہیں۔ ان کا سفر اندر کا سفر ہوتا ہے۔ یہ اپنی ذات کا سفر ہوتا ہے۔ یہ اندر کی کھوج کا سفر ہوتا ہے۔ یہ اندر کے سکون کا سفر ہوتا ہے۔ جب تک یہ ترجیح میں نہیں رکھا جاتا، تب تک یہ انعام نہیں ملتے۔ انسان سب کو ڈھونڈتا ہے، سب کو تولتا ہے، سب کو ناپتا ہے، سب کو

جانچتا ہے، لیکن خود کو نہیں ناپتا۔ وہ یہ پیمانہ سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتا کہ جس سے خود کو ناپا جائے۔ انسان یہ نہیں ناپتا کہ میں کتنا خوش ہوں، میں خود سے کتنا راضی ہوں، کتنا مطمئن ہوں، کتنا سکون میں ہوں، کیا مجھے گولی کے بغیر نیند آتی ہے کہ نہیں۔ بڑی کامیابیوں کے بعد اگر نیند کی گولی لے کر سونا پڑتا ہے تو یہ کامیابی نہیں ہے، لیکن تھوڑے کے باوجود سکون کی نیند آتی ہے تو یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔

خوشی چونکہ اندر کا معاملہ ہے، اس لیے اپنے آپ کو پہچاننا بہت ضروری ہے۔ خودشناسی کے متعلق نہ سوچنا انسان کا اپنے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔ انسان پیسہ بنانے کی خاطر اپنی صحت گنوا لیتا ہے اور پھر اپنی صحت بنانے پر اپنا پیسہ گنواتا ہے۔ آج بعض لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ سب کتابی باتیں ہیں، لیکن جب وقت گزر جاتا ہے تو انھیں احساس ہوتا ہے کہ کاش ان ''کتابی'' باتوں پر عمل کر لیتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ اس وقت اسے یہی باتیں سچ لگنا شروع ہو جاتی ہیں۔

کئی لوگوں کی ساری خواہشیں تو پوری ہو چکی ہوتی ہیں تو پھر وہ سوچتے ہیں کہ اب کیا کیا جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ خواہش کے سراب سے کچھ نہیں حاصل ہوتا۔ بابا جی اشفاق احمد فرماتے ہیں، ''دل کرتا ہے زہر دے دوں، ان تمام خواہشوں کو جو دل میں اٹھتی ہیں۔ وہ زہر کھا کر مر جائیں اور میری جان چھوٹ جائے۔ ان خواہشوں نے زندگی کا سواد خراب کر دیا ہے۔'' خواہش بھگاتی ہے، اچھالتی ہے، چین نہیں لینے دیتی۔ آدمی خواہشوں کے ایک دریا کے پار اترتا ہے تو سامنے اسے ایک اور دریا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے نپٹنے کا ایک ہی حل ہے کہ اپنے حالات پر راضی رہنا سیکھا جائے۔

دولت اور خوشی

عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم کامیاب ہوں گے تو ہم خوش ہوں، ہمارے پاس زیادہ دولت ہوگی تو ہم خوش ہوں گے۔ لیکن دیکھنا پڑے گا کہ خود کامیابی کا مطلب کیا ہے۔ اگر مادی چیزوں کا حصول کامیابی ہے تو اس دنیا میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کے پاس بہت زیادہ پیسہ ہے، لیکن وہ خوش نہیں ہیں۔ اگر کسی خاص ہدف کا حصول

خوشی ہے تو دنیا میں بڑی تعداد ایسی ہے جو اپنے مطلوبہ اہداف حاصل کر لیتے ہیں، لیکن پھر بھی خوش نہیں ہو پاتے۔

چلیے، دو انتخاب (آپشن) پر بات کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ دنیا کی ساری چیزیں، ساری بے انتہا دولت مل جائے، لیکن خوشی نہ ہو، دوسرا آپشن یہ ہو کہ زندگی کی بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہوں لیکن خوشی بھی ہو۔ آپ کون سی زندگی چاہیں گے؟ سمجھ داری یہی ہوگی کہ دوسرا انتخاب چنا جائے۔ کچھ خواہشوں کا پورا ہونا اور کچھ کا نہ ہونا، لیکن خوشی مل جانا ہی اصل دولت اور کامیابی ہے۔

یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے پاس دولت ہوگی تو خوشی ملے گی۔ جن سیلف میڈ میلینیرز یعنی غریب سے امیر ہونے والوں سے کہ جنھوں نے اپنی محنت اور کوشش سے اپنے مادی اہداف کو پورا کیا اور غربت سے امارت تک پہنچے، جب ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ آج زیادہ خوش ہیں یا اس وقت جب اتنی فراوانی نہیں تھی تو ان کا جواب ہوتا ہے کہ جب تنگ دستی تھی، اس وقت زیادہ خوشی میسر تھی۔

دو ہزار دس میں معروف عالمی ادارہ گیلپ نے ''گیلپ شیئر کیس ویل بی اینگ انڈکس'' کے عنوان سے ایک تحقیقی مطالعہ کیا۔ اس مطالعے سے جو نتائج سامنے آئے، اس کے مطابق، جس فرد کی آمدن تقریباً ساڑھے سات ہزار ڈالر فی کس سالانہ سے کم تھی، اس کی آمدن میں اضافہ ہوا تو پیسے میں اضافے سے اس کی خوشی میں بھی اضافہ ہوا۔ لیکن جن امریکیوں کی آمدن اس عدد سے جتنی زیادہ تھی، ان کی دولت میں جتنا بھی اضافہ ہوا، انھیں مزید پیسہ ملنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ اس رقم سے زائد آمدن میں اضافہ طرزِ حیات میں بہتری تو لاتا ہے، مگر جذباتی کیفیات میں کوئی بہتری نہیں ہوتی، یعنی اس سے خوشی نہیں ملتی۔

دراصل، پیسہ ایک حد تک تو ضروری ہے، لیکن جب یہی ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو وہ فرد کے مسائل حل کرنے کی بجائے خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ چنانچہ پیسے کی زیادتی آدمی کو خوشی اور سکون نہیں دیتی، دباؤ اور پریشانی کا باعث بن جاتی ہے۔ کوشش ہونی چاہیے کہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کی کوشش تو ضرور کی جائے،

لیکن اندھا دھند اپنی خواہشات کے پیچھے نہ بھاگا جائے۔ ضرورتیں کم ہوتی ہیں، لیکن خواہشات کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ دنیا میں ایسے لوگ بہت ہیں جنھوں نے پیسہ تو بہت بنالیا، لیکن وہ نہ تو کھانا آرام سے کھا سکتے ہیں، نہ چائے کے ایک کپ سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ یہ لوگ موسم کی خنکی کا مزہ لے سکتے ہیں اور نہ اپنی فیملی کے ساتھ اکٹھے بیٹھ ان لمحات کو مسرور ہونے کے قابل ہوتے ہیں۔

کمانے کی فکر اور کمانے کے خبط میں بہت فرق ہے۔ معاش کی فکر اللہ تعالیٰ کی انسان کو عطا کردہ ایک صفت ہے جس کی بدولت انسان پلاننگ کرتا ہے اور عمل کیلئے کھڑا ہوتا ہے۔ یہ پلاننگ اتنی اہم ہے کہ حضرت یوسفؑ شاہ مصر کو اس کے خواب کی تعبیر بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے سات برس کی پلاننگ کہ سات سال گندم جمع کرے تاکہ یہ اگلے سات سال کے قحط کے دوران کام آسکے۔

لیکن اگر معاملہ درست اور متوازن کے آگے بڑھ کر پیسے کے خبط میں بدل جائے تو انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ لوگ اتنی شکی ہوگئے ہیں کہ اپنے ایمان کو، اپنی ذہنی حالت کو دوسروں سے ٹیسٹ کرواتے ہیں اور انھوں نے اسی خبط کا نام Passion رکھ دیا ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا کہ ''میں نے دنیا کا بازار دیکھا، دنیا کے بازار میں ہر دکان پہ رش تھا لیکن خوشی کی دکان خالی پڑی تھی۔''

ایک اندازے کے مطابق، دنیا میں اس وقت خوشی کے موضوع پر 56700 سے زائد کتابیں ہیں۔ دنیا کے تمام بڑے تھنک ٹینکس، اسکالرز، مینجورز، تحقیق کار یہی تحقیق کررہے ہیں کہ انسان کیسے خوش رہ سکتا ہے۔ کارپوریٹ انڈسٹری کے بڑے بڑے ٹائیکون جب اپنی انڈسٹری میں اپنا مقام بنالیتے ہیں تو ایک وقت ایسا آتا ہے کہ انھیں یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اندر سے کتنے خالی ہیں، لہٰذا اُن کے پاس دنیا کے ہر شے تک رسائی ہوتی ہے، مگر وہ خوشی حاصل نہیں کرسکتے۔ اتنا پیسہ بنا کر، اتنے عشروں تک امیر رہنے والا بل گیٹس سب کچھ اس لیے بانٹ دیتا ہے کہ بانٹنے میں جو خوشی ہے، وہ بنانے میں نہیں ہے۔

جب تک آدمی یہ سمجھ نہیں لیتا کہ مال بنانے سے خوشی نہیں ملے گی، مال بانٹنے سے

خوشی ملے گی تب تک وہ خوش نہیں رہ سکتا۔ آج دنیا پر یہ راز افشا ہو چکا ہے اور دنیا بھر کے امیر ترین لوگ مخیر ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ اپنا کمایا ہوا مال ضرورت مند انسانوں میں دھڑا دھڑ تقسیم کر رہے ہیں، کیوں کہ وہ یہ حقیقت جان چکے ہیں کہ اتنا عرصہ پیسہ کمانے کے بعد وہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت خوشی اور سکون سے محروم ہیں۔

ہمارے ملک میں بھی ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جس کے پاس بہت پیسہ ہے اور وہ بغیر کسی غرض کے اپنی کمائی کا ایک بڑا حصہ لوگوں کی صحت، غذا اور تعلیم پر لگا رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے خوشی کا راز پا لیا ہے۔

بانٹنے والا شخص دنیا کا ذہین ترین انسان ہوتا ہے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کاروبار شروع کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ذات ہے جو کسی کی ذرہ برابر نیکی ضائع نہیں کرتی۔ پھر، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ بانٹنے والے کو سکون اور خوشی نہ دے۔

نام وری اور خوشی

عموماً مشہور اور نام ور لوگوں میں خوشی کم پائی جاتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ دنیا ہمیں جانے، ہمارا نام ہو، ہم پہچانے جائیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ گمنامی کا اپنا ایک مزہ ہے، کیونکہ گمنامی میں کوئی نہیں جانتا۔ گمنامی میں آدمی بازار گھوم پھر سکتا ہے، جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ کسی ڈھابے سے چائے پی سکتا ہے جبکہ نام وری میں آدمی کو پُر تکلف رہنا پڑتا ہے۔ چوکس رہنا پڑتا ہے۔ وہ ہر وقت تکلیف میں رہتا ہے۔ نام ور آدمی کو ڈر لگتا ہے کہ اگر مجھے کسی نے اصل حالت میں دیکھ لیا تو کیا ہوگا۔ نام ور شخص کا جو رکھ رکھاؤ اختیار کرتا ہے، وہ اسے عوام کے سامنے ہر وقت اختیار کرنے پر مجبور ہوتا ہے اور یوں وہ اپنے فطری طرز سے ہٹ جاتا ہے۔ نئے رکھ رکھاؤ پر زمانے کی گرد ہی اتنی پڑتی ہے کہ اصل دب کر رہ جاتا ہے۔

اکثر نام ور لوگوں کی زندگی میں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ خلا انھیں نفسیاتی عوارض کا شکار کر دیتا ہے۔ ایسے شخص کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ میں کس تکلیف میں مبتلا ہوں۔ یہ تکلیف پہلے نفسیاتی ہوتی ہے، بعد میں روحانی بن جاتی ہے۔ یہ تکالیف اتنی شدید ہوتی

ہیں کہ بڑی بڑی کامیابیوں کے باوجود اس کی ذاتی زندگی بدترین ہو جاتی ہے۔ جب آدمی کے پاس دہکتے انگارے ہوں گے تو وہ اردگرد کے لوگوں کو بھی جلائیں گے۔ اگر کسی کے پاس سکون نہیں ہے تو پھر کیسے ممکن ہے کہ اس سے وابستہ لوگوں کو اس سے سکون میسر آجائے۔ جو شے ایک فرد کے پاس نہیں ہے، وہ کیسے دوسروں کو دے سکتا ہے۔ جو شخص بے سکونی کا خود شکار ہوتا ہے، وہ راہِ فرار تلاش کرتا ہے۔ مطالعات سے پتا چلتا ہے کہ معروف لوگوں کی اکثریت ناخوش ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنے لیے راہِ فرار تلاش کرتے ہیں اور فوری طور پر وہ نشے میں قرار پاتے ہیں۔ پھر یہ نشہ انھیں مزید ابتری کی طرف لے جاتا ہے۔

شادی اور خوشی

بعض لوگوں کی شادی شدہ زندگی بھی ناخوشی کے باعث بدتر ہوتی ہے۔ ایسے مرد اور خواتین بھی ہیں جو اپنی شادی سے خوش نہیں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ موجودہ شریک حیات سے چھٹکارا پا کر کہیں اور شادی کرلیں گے تو اُن کی زندگی میں خوشی آجائے گی۔ ایسے خواتین و حضرات ایک کے بعد دوسری شادی کرتے ہیں، پھر تیسری شادی، پھر چوتھی شادی کرتے ہیں۔ لیکن ان کی ہر شادی پہلی شادی کے سے زیادہ ناکام ہوتی ہے۔ یوں وہ ناکام شادیوں کے ڈھیر لگاتے چلے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خوشی کو شادی کے ساتھ مشروط کردیتے ہیں کہ شاید موجودہ فرد سے خلاصی اور نئے فرد سے ازدواجی تعلق ہمیں خوشی فراہم کرسکے گا۔ یہ لوگ اپنی خوشی کی ذمے داری دوسروں کے کندھوں پر ڈالتے ہیں۔

یاد رکھیے، اگر آدمی اپنے ساتھ خوش نہیں ہے تو پھر وہ کسی کے ساتھ بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ جو شخص اپنی تکلیف کو، کمی بیشی کو، نالائقی کو، غلطی کو قبول کرنے کا ہنر نہیں جانتا، وہ کسی کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا۔ وہ تعلق بدلے گا، دوستیاں بدلے گا، محبتیں بدلے گا، لیکن سکون اور خوشی نہیں پاسکتا۔ دراصل، اس نے اپنی خوشی کو باہر کی دنیا سے مشروط کر دیا ہے کہ باہر کی دنیا میں مسئلہ ہے۔ حالانکہ اصل مسئلہ اس کے اندر کی دنیا کا ہے۔

کمزور لوگ خوش نہیں ہو پاتے

بعض لوگ دوسروں کو نقصان پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔ یہ نہایت کمزور لوگ ہوتے ہیں۔ یہ کمزوری ان کے اندر حسد پیدا کرتی ہے۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر دوسرا خوش ہوا تو ہمیں خوشی نہیں مل سکتی، اس لیے دوسرے سے خوشی چھین لی جائے۔ انسان دوسروں کی کمیوں، کوتاہیوں اور ناکامیوں پر تب خوش ہوتا ہے کہ جب وہ اندر سے چھوٹا ہو۔ اندر سے مضبوط اور طاقت ور انسان کبھی کسی کیلئے برا نہیں سوچتا اور مشروط نہیں کرتا کہ اسے دکھ ملے گا تو مجھے خوشی ملے گی۔ حاسد کبھی خود نہیں پنپتا، نہ دوسروں کو پنپتا دیکھ سکتا ہے۔ حسد کی آگ بہت بری ہے۔ اسی لیے قرآن میں حسد سے بچنے کی دعا بھی تعلیم فرمائی گئی ہے۔

جن معاشروں میں انسانی شخصیت پر کام نہیں کیا جاتا، وہاں یہ مزاج تشکیل پاتا ہے۔ اگر خدانہ خواستہ یہ مزاج بن رہا ہے تو اس مزاج کو شروع ہی سے بہتر کرنے کی فکر اور کوشش کرنی چاہیے۔

انسانی تعلقات اور خوشی

خوشی کا تعلق ہم سے منسلک لوگوں سے بھی بہت گہرا ہے، جیسے والدین، عزیز رشتے دار اور دوست وغیرہ۔ اگر ان میں سے کوئی دنیا سے چلا جائے تو ہم غم گین ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ تو اس قدر متاثر ہوتے ہیں کہ کسی کے مرنے یا کسی دوسرے مقام پر چلے جانے سے ان کا سکون ہی غارت ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں، اپنے غم کے جذبہ کو قبول کرنا اور پھر اسے چھوڑنا (ریلیز) کرنا چاہیے۔ یہ حقیقت تسلیم کرنی چاہیے کہ وہ چلا گیا ہے اور اب ہماری زندگی میں نہیں ہے۔ جو لوگ زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے کی جرات کر لیتے ہیں، وہ ناخوشی کو بہ آسانی جھیلنے اور خوشی پانے کے قابل ہوتے ہیں۔

زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے کی جرات

انسانی زندگی میں ناخوشی کے ایک بہت بڑا سبب یہ بھی ہے کہ زندگی کے حقائق تسلیم نہ کیے جائیں اور ویسی زندگی چاہنا جیسی کہ ہم چاہتے ہیں، نہ کہ جیسی قوانین فطرت کے ہو سکتی ہے۔ جو لوگ زندگی کی حقیقتوں کو تسلیم کرنے اور چیزیں جیسی کہ وہ ہیں، انھیں ان کی اصلی حالت پر دیکھنے، تجربہ کرنے اور قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، وہ ناخوشی سے بہ آسانی نبرد آزما ہو پاتے ہیں۔ یہ مائنڈفلنس ہے۔ چنانچہ آج دنیا میں ناخوشی کا مقابلہ کرنے اور خوشی پانے کیلیے سب سے زیادہ تحقیق اور تربیت مائنڈفلنس پر کی جارہی ہے۔

اپنی زندگی کو مائنڈفل بنایئے۔ چیزوں کو ان کی حقیقی حالت میں دیکھنے اور قبول کرنے کی جرات پیدا کیجیے۔ آپ کی زندگی میں خوشی آ سکے گی۔

کیا یہ پڑھ کر حیرت نہیں ہوتی کہ یہ سب ہمارے دین نے ہمیں چودہ سو سال پہلے سکھا دیا تھا؟

❁

اہل تصوف کی تعلیمات

"راحتوں کو چھوڑ کر مشقتوں کو برداشت کرنے کی صلاحیت کا نام تصوف ہے!"

حضرت بایزید بسطامیؒ

کسی بھی معاشرے میں مکالمہ کا وجود اس کے صحت مند ہونے کی عکاسی کرتا ہے۔ مکالمہ اس بات کی علامت ہے کہ سوال اٹھ رہے ہیں، جواب آ رہے ہیں، تلاش جاری ہے، تلاش کرنے والا پا رہا ہے، سوچنے والے ذہن ابھی مٹے نہیں ہیں اور معاشرے میں فکری لحاظ سے ابھی جان باقی ہے۔ لیکن بغیر پڑھے، بغیر جانے، بغیر پرکھے اور بغیر سمجھے بات چیت ہوگی تو معاشرے کی فکر کو قفل لگ جائے گا اور وہ ارتقاء پذیر نہیں رہے گا۔

ہر وہ فرد جو روحانیت کا دعویٰ کرتا ہے، کہتا ہے کہ میں ہی حق پر ہوں جس کی بنا پر عام شخص کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ میں کس کی پیروی کروں، حالانکہ اس کا آسان حل قرآن و حدیث میں موجود ہے۔ جو آدمی شریعت پہ عمل کرتا ہے اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کہا مانتا ہے، وہی حق پر ہے۔

حقیقی کرامت

ایک شخص کسی بزرگ کے پاس اس نیت سے گیا کہ وہ شخص صاحب کرامت ہیں یا نہیں تاکہ میں ان کے اللہ والا ہونے کے بارے میں جان سکوں۔ وہ شخص ان بزرگ کے پاس ایک ماہ رہا اور ایک ماہ رہنے کے باوجود جب اسے کوئی کرامت نظر نہ آئی تو

اس نے واپسی کا ارادہ کیا۔ جب وہ جانے لگا تو بزرگ نے بلا کر پوچھا، تم مجھے پشیمان سے لگ رہے ہو، آخر کیا بات ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں اس گمان کے ساتھ آیا تھا کہ آپ صاحب کرامت ہیں اور میری یہ نیت تھی کہ میں بھی آپ کی کوئی کرامت دیکھوں لیکن مجھے آپ کی کوئی کرامت نظر نہیں آئی۔ بزرگ نے اس سے سوال کیا کہ مجھے بتاؤ، ایک ماہ میں تم نے میرا ایک کام بھی شریعت کے خلاف دیکھا؟ اس شخص نے جواب دیا، نہیں۔ بزرگ نے فرمایا، میری سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ میں شریعت پر عمل کرتا ہوں۔ میں اس سے بڑی کرامت نہیں دکھا سکتا۔

ہمارے پاس کسی کو پرکھنے کی سب سے بڑی کسوٹی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ ہے۔ اگر ہم سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو معیار بنالیں تو یہ مسئلہ حل کرنا بہت آسان ہو جائے گا کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط...کون راہ حق پر ہے اور کون باطل کا پیرو؟

آج جن کرامات کو کرامت سمجھا جاتا ہے وہ تمام کرامات تو ایک غیر مسلم بھی کر کے دکھا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صوفی وہ ہے جس کی مجلس، جس کی محفل، جس کی گفتگو آدمی کو اللہ کی یاد دلا دے۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں کہ شاید ممکن ہے، تم یہ مانگو کہ میری خواہش پوری ہو؛ مانگو تو یہ مانگو کہ آپ کی خواہش ہی بدل جائے۔ صوفی وہ ہوتا ہے جو خواہشوں کو بدل دے، جو دنیا مانگنے والے کو اللہ تعالیٰ سے جوڑ دے۔

حضرت ہجویری کا تصوف میں مقام

حضرت علی بن عثمان ہجویری تصوف میں بہت بڑا نام ہے۔ آپؒ اُن بزرگانِ دین میں شامل ہیں جنھوں نے برصغیر میں اسلام کی شمع روشن کی۔ آپؒ کے آنے سے کفر کا اندھیرا مٹا۔ آپؒ نے اپنے نظریات کو اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں انتہائی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

دنیا میں جس طرح انسانوں، قوموں اور معاشروں کی زندگی ہوتی ہے اسی طرح انسانی نظریات کی بھی زندگی ہوتی ہے۔ آج نو سو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے

باوجود بھی آپؒ کی کتاب کشف المحجوب اور آپؒ کا پیغام اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ اس کتاب کو کلاسیکی تصوف کی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس نے بھی یہ کتاب پڑھی وہ اس حقیقت سے آگاہ ہوا کہ آج جس شے کو تصوف کہا جاتا ہے، اصل میں وہ تو خرافات اور بدعتوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آپؒ کے مطابق اگر کسی میں طمع، لالچ اور دکھاوا ہے، وہ تصوف نہیں ہے۔ بلکہ وہ کفر ہے۔ اصل تصوف تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے متعلق حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا، "جسے پیر نہیں ملتا وہ اس کتاب کو پڑھ لے۔ اسے پیر مل جائے گا۔"

نیت بنیاد ہے

ایک شخص حضرت بایزید بسطامیؒ کے پاس گیا اور کہا کہ حضرت آپؒ مجھے اپنے خرقے کا ٹکڑا عنایت فرمادیں تاکہ مجھے بھی فیض مل سکے۔ آپؒ نے فرمایا، "تم خرقے کی بات کرتے ہو، اگر تم بایزید کی کھال بھی پہن لو تو بایزید والا نتیجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک بایزید کی نیت تمہارے پاس نہیں ہوگی، اس خرقہ اور کھال سے بات نہیں بنے گی۔" ہمارے ہاں مسئلہ یہ ہے کہ معاشرے میں خلوصِ نیت اور تقویٰ ختم ہوگیا ہے۔ جب یہ چیزیں ختم ہوجائیں تو پھر چاہے "الحاج" لکھا جائے یا "پیر طریقت" لکھا جائے یا کچھ اور لکھ دیا جائے، اندر وہ کردار پیدا نہیں ہوگا جس کی بات حضرت ہجویری کرتے ہیں۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے پاس فرشتے کے روپ میں شیطان آیا اور اس نے کہا کہ میں آپ کو بتانے آیا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی نمازیں معاف کر دی ہیں۔ آپؒ نے "لاحول ولاقوۃ الا باللہ" پڑھا اور کہا کہ اگر رسولؐ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نمازیں معاف نہیں ہوئیں تو میری نماز کیسے معاف ہوسکتی ہے۔ شریعت کو چھوڑ کر ممکن نہیں ہے کہ تصوف کے راستے پر چلا جا سکے۔ بنیادی چیز شریعت ہے اور شریعت کے اخلاص کا نام "تصوف" ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کا تعلق قائم کرنا "صوفی ازم" کہلاتا ہے۔

آج ہماری ترجیح میں سکونِ قلب نہیں رہا، کیوں کہ دکھاووں میں پڑ گئے ہیں۔ ہم

نے سوچ لیا ہے کہ اگر چیزیں آئیں گی تو سکون ملے گا۔ یہی وجہ ہے کہ سب کچھ تو ہے، لیکن سکون نہیں ہے۔ ایک شخص کسی بزرگ کے پاس چلا گیا اور ان سے کہا کہ کیا فلاں جگہ میری شادی ہو جائے گی؟ وہ مسکرائے اور کہنے لگے کہ میں سمجھ رہا تھا، تم یہ سوال کرو گے کہ اگر میری یہاں شادی ہوگئی تو کیا مجھے سکون ملے گا۔ آج ہم خواہشوں کے غلام ہو گئے ہیں اور جب آدمی خواہشوں کا غلام ہوتا ہے تو پھر سکون رخصت ہو جاتا ہے۔ حضرت ہجویریؒ فرماتے ہیں، ''وہ فرد، وہ لوگ، وہ معاشرے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع نہیں ہوتے، وہ نفس کے غلام بن جاتے ہیں اور اُن کی زندگیوں سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔'' غور کیجیے کہ ہماری زندگی میں اللہ اور اللہ کی محبت کی کتنی اہمیت رہ گئی ہے؟ وہ فرماتے ہیں کہ ''اگر وسائل ہیں، طاقت ہے، آسانیاں ہیں اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے استعمال ہو رہا ہے تو پھر یہ توفیق الٰہی ہے۔'' بابا جی اشفاق احمد فرماتے ہیں، ''اللہ تعالیٰ آپ کو آسانیاں بانٹنے کا شعور اور توفیق عطا فرمائے۔'' توفیق اصل میں وہ کرم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی سے کام لے لے۔ توفیق وہ کرم ہوتا ہے کہ روٹی پوری ہونے کے باوجود آدھی کسی کو کھلا دی جائے اور آدھی خود کھائی جائے۔

اللہ کا کرم

پسند اور ناپسند، ہر حالت میں رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رہے تو یہ اللہ کا کرم ہے۔ گھر، گاڑی، عزت، شہرت کے باوجود اگر رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف رہے تو یہ کرم ہے۔ اگر زندگی میں کوئی غم، پریشانی یا مشکل آجائے لیکن پھر بھی رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف رہے تو یہ کرم ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں، ''اگر تم نے نفس کو طاقت دی تو یہ کرم نہیں ہے۔ نفس نے غلبہ پالیا تو یہ کرم نہیں ہے۔ اگر علم حجاب بن گیا تو یہ کرم نہیں ہے۔'' آج کے پی ایچ ڈی بیٹے کو اگر اپنی ماں اَن پڑھ لگتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کے علم نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے اور اس کا پی ایچ ڈی ہونا بھی کرم نہیں ہے۔ آج اگر بیٹا امیر ہو گیا ہے اور اسے اپنا باپ غریب لگتا ہے تو اس کی امارت نے اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال رکھا ہے اور اس کا امیر ہونا بھی کرم نہیں ہے۔

آج اگر کوئی عہدے پر بیٹھ گیا ہے اور اسے دوسرے لوگ چھوٹے لگتے ہیں تو اس کا عہدہ اس کیلئے پردہ بن چکا ہے اور اس عہدے کا ہونا کرم نہیں ہے۔

کرم یہ ہے کہ سب کچھ پاس ہو، مگر رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہی رہے۔

محبت، اور صرف محبت

صوفیائے کرام کی تبلیغ میں محبت تھی جس کی وجہ سے لاکھوں لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا، کیونکہ محبت وہ چیز ہے کہ اگر بڑھیا کوڑا پھینکتی ہے تو نہ راستہ بدلا جاتا ہے اور نہ بدلہ لیا جاتا ہے، بلکہ عیادت کی جاتی ہے اور معاف کردیا جاتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ بھی کلمہ پڑھنے کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ محبت ہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ حضرت داتا علی ہجویریؒ سے فیض لینے والے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ لاکھوں لوگوں کو مسلمان کر دیتے ہیں۔ یہ محبت ہی کا نتیجہ ہے کہ جس کی وجہ سے اجودھن پاکپتن بن جاتا ہے۔ محبت اور خلوص کے بغیر تبلیغ ممکن نہیں۔

صرف نصیحت کرنے یا بات کہہ دینے سے تبلیغ نہیں ہوتی۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''بغیر تعلق کے تبلیغ ایسے ہی ہے جیسے غیر زبان میں تقریر۔'' لوگوں کو اپنا بنانا اور پھر اپنا بنا کران سے بات کرنا صوفیا کا کام ہے۔ جب محبت کا پودا لگایا جاتا ہے یا کسی کو محبت سے دیکھا جاتا ہے یا راستہ دیا جاتا ہے یا آسانی پیدا کی جاتی ہے تو محبت چلنے لگتی ہے۔ پھر چاہے پیغام حضرت بابا بلھے شاہؒ کا ہو، علی ہجویریؒ کا ہو، سلطان باہوؒ کا ہو، نظام الدینؒ اولیا کا ہو، صابر پیاؒ کا ہو یا کسی بھی بزرگ کا ہو، وہ پھل دینا شروع کردیتا ہے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ پیغام محبت کو پھیلایا جائے۔ اس کی بات کی جائے۔ اس کو لٹریچر میں شامل کیا جائے تاکہ معاشرے سے شدت پسندی ختم کی جاسکے اور آسانیاں پیدا کی جاسکیں۔ اللہ پاک ہمیں آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا کرے۔ آمین



کرپشن کا خاتمہ کیسے ہو

"جب دماغ برائی کی طرف چل پڑے تو ہر شے کرپٹ ہو جاتی ہے!"

اووِیڈ، قدیم اطالوی شاعر

اگر آج سے پچیس تیس سال پیچھے جائیں تو ہمیں کرپشن کا لفظ اتنا سننے کو نہیں ملے گا اور نہ لوگ اس وقت اس لفظ سے واقف تھے، لیکن پچھلے کچھ سال سے اس لفظ کا اتنا پرچار کیا گیا ہے کہ اب یہ لفظ بچے بچے کی زبان پر ہے۔ پہلے اگر کوئی برائی کرتا تھا تو اس کی برائی پر پردہ ڈالا جاتا تھا، لیکن آج اگر برائی ہوتی ہے تو اس کی تشہیر کی جاتی ہے، بلکہ یہاں تک کہ سوشل میڈیا ہونے کی وجہ وہ منٹوں میں زبان زدِ عام ہو جاتی ہے۔ یوں کہیے کہ لا آف ایٹریکشن کام کر رہا ہے۔ آپ اسی پر وہ فوکس کر رہے ہیں جو نہیں چاہتے، بجائے اس کے کہ آپ جو چاہتے ہیں، اس پر فوکس کریں۔

کرپشن کی تعریف

یہ تمیز کرنا کہ کون کرپٹ ہے اور کون نہیں ہے، بہت مشکل کام ہے۔ مجھے کہنے دیجیے کہ آج ہر فرد کسی نہ کسی انداز سے کرپشن میں مبتلا ہے۔ کوئی معاشی سطح پر کرپٹ ہے تو کوئی سماجی سطح پر کرپشن کر رہا ہے۔ کسی کا کردار کرپشن ہے۔ اور کچھ نہیں تو ایک بڑی تعداد اپنی ذات کے ساتھ کرپٹ ہے۔

کرپشن کا لفظ بھلا لاکھ دیواروں پر لکھ دیا جائے، اس کے خلاف بینرز لگا دیے جائیں، سیمینارز منعقد کیے جائیں، میڈیا پر تشہیر ہو جائے، جب تک اس کے اسباب

جانے نہیں جائیں گے، کرپشن ختم نہیں کی جا سکتی۔

کرپشن کی مجبوری اور اختیار

کرپشن کی دو بنیادی اقسام ہیں۔ نمبر ایک Needbased یعنی ضرورت، دوسری Greedbased یعنی لالچ۔ لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو نیڈ بیس کرپشن میں مبتلا ہے۔ اس کی وجہ ہے کہ ہمارے سسٹم میں جو شخص کام کر رہا ہے، اس کی ضروریات بہت زیادہ ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں جو معاوضہ ملتا ہے، وہ بہت کم ہے۔ چنانچہ وہ نیڈ بیس کرپشن کرنا شروع کر دیتا ہے۔ شروع میں یہ کرپشن ضرورت کے درجے میں ہوتی ہے، پھر یہ عادت بنتی ہے، پھر یہ لالچ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لالچ پھر نفسیاتی عارضہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور پھر یہ نفسیاتی عارض روحانی عارضے میں بدل جاتا ہے۔

ہمارا سسٹم اتنا خراب ہو چکا ہے کہ اگر کسی غریب کا بچہ خدانخواستہ کسی موذی مرض میں مبتلا ہو جائے تو وہ اس کا علاج نہیں کرا سکتا۔ اسے اپنے بچے کے علاج کیلئے پیسوں کا بندوبست کرنے کیلئے اپنا گردہ بیچنا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں پچاس فیصد سے زائد آبادی خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی روزمرہ کی ضروریات بھی پوری نہیں کر پاتے تو دوا دارو کہاں سے کرائیں؟ جب آدمی کے پاس کچھ نہ ہو تو وہ کرپشن پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ نیڈ بیس کرپشن کا ایک بہت بڑا محرک ہے۔

اسی طرح، اسے غمی خوشی کا سامنا کرنا پڑ جائے تو ان کے اخراجات پورا کرنے کیلئے بھی کرپشن کا سہارا لیتا ہے۔ یہ نیڈ بیس کرپشن کا دوسرا محرک ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ معاشرے میں اتنے اسٹینڈرڈ بن چکے ہیں کہ ان اسٹینڈرڈ نے لوگوں کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنا رکھ رکھاؤ ویسا بنائیں۔ اسی رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو اگرچہ امیر نہیں ہیں لیکن امیر ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ طاقتور تو نہیں ہیں، لیکن طاقتور بننے کی ایکٹنگ کرتے ہیں۔ وہ جاہل ہیں، مگر دانشور بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایسا کرتے ہیں تو درحقیقت کرپشن کے مرتکب ہوتے ہیں۔

روحانیت کی کرپشن

بہت سوں کی تعداد ایسی ہے جنھوں نے روحانیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے، لیکن روحانیت کے ذائقے سے قطعاً نا آشنا ہیں۔ یہ لوگ دوسروں کو اداسی میں مبتلا کرتے ہیں۔ آوازِ حق بلند کرنے کے خلاف بات کرتے ہیں۔ غلط کو غلط نہیں کہتے۔ ایسے لوگ فکری کرپشن کرتے ہیں، یعنی ایسی کرپشن کہ سچ جانتے ہوئے بھی سچ نہ کہنا۔ جبکہ اصل روحانیت تو یہ ہے کہ حضرت اقبالؒ کے نزدیک ''جھپٹنا، پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا'' شاہینی ہے۔ کرپشن کی ایک قسم یہ بھی ہے کہ افسر ماتحت کو کرپشن کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ماتحت کو چاہیے کہ اس حدیث مبارک کو سامنے رکھے کہ اگر جرم کو ہاتھ سے نہیں روک سکتے تو زبان سے روکو۔ اگر زبان سے نہیں روک سکتے تو دل سے اسے برا جانو۔ برا جاننا تو ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ جب ایمان ہوگا تو برائی کے سامنے کھڑا ہونے میں مدد ملے گی۔

بچوں کی تربیت میں کرپشن

کرپشن کی ابتدا گھر سے ہوتی ہے۔ مثلاً گھر میں اگر بچے سے کوئی برتن ٹوٹ جائے تو اس کو سزا ملتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو شاید اس برتن کی قیمت اتنی زیادہ نہ ہو، لیکن اسے جو سزا ملی اور اس سزا کے نتیجے میں ساری زندگی اس کے اندر جو منفیت بس گئی، اس قیمت کا اندازہ ہی نہیں لگایا جاسکتا۔ اگر پھر کبھی اس سے کوئی چیز ٹوٹے گی تو وہ فوراً سوچے گا کہ سزا سے بچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جھوٹ بول دیا جائے۔ یوں وہ بچہ جھوٹ بولنا شروع کر دیتا ہے۔

بعض مرتبہ گھر میں ایسا دباؤ پیدا کر دیا جاتا ہے کہ بچہ مجبوراً کرپٹ ہو جاتا ہے۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں، ''بلی کو مارنے لگے ہو تو روشن دان کھلا چھوڑ دینا، ورنہ بلی مجبور ہو کر تمہاری آنکھوں کو پڑ جائے گی۔'' ہم بچے کیلئے ہر راستہ بند کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے پاس کرپشن کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ بچے کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ بچہ گیلی مٹی کی طرح ہوتا ہے۔ اس کی کوئی صورت نہیں

ہوتی۔ اس نے جسے اچھا سمجھ لیا، اس نے وہی کرنا ہے۔ اگر اس نے جھوٹ کو اچھا سمجھ لیا تو پھر اسے جھوٹ بولتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوگی۔ اگر اس نے کرپشن کو اچھا سمجھ لیا تو پھر وہ کرپشن کو برا نہیں سمجھے گا۔

اگر خاوند اپنی ذمہ داری پوری نہیں کر رہا اور اس کی وجہ سے گھر کا ماحول خراب ہو رہا ہے تو یہ بھی کرپشن ہے۔ استاد بچوں کو صحیح نہیں پڑھا رہا، وہ صرف وقت پورا کر رہا ہے تو یہ بھی کرپشن ہے۔ اپنی ذمے داری پوری نہ کرنا سب سے بڑی کرپشن ہے۔ جس دن ہر شخص نے اپنی سطح پر یہ عہد کر لیا کہ مجھے اپنی ذمے داری پوری کرنی ہے، اسی دن کرپشن ختم ہونا شروع ہو جائے گی۔

کرپٹ انسان خوف زدہ رہتا ہے

کرپشن کا لازمہ "خوف" ہے۔ جو انسان کرپشن میں مبتلا ہوتا ہے، اس کے اندر دوسرے لوگوں کی نسبت زیادہ خوف ہوتا ہے۔ وہ سوچتا رہتا ہے کہ میرا کیا بنے گا۔ وہ جیسے ہی اس خوف کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہ خوف اتنا ہی زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ جب یہ خوف زیادہ ہوتا ہے تو اس میں عدم تحفظ بڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر وہی عدم تحفظ اسے کرپشن کرنے پر مجبور کرتا ہے، کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ کرپشن کے ذریعے میں عدم تحفظ سے تحفظ میں جا سکتا ہوں۔

جب وہ ان مسائل میں گھر جاتا ہے تو پھر یہی مسائل اس کی عادات، دل اور روح پر اثر کرتے ہیں اور اس کا ایمان جاتا رہتا ہے۔ پھر اس کا ایمان اپنے عہدے اور محکمے پر ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اس سیٹ پر کمانے کیلئے بیٹھا ہوں۔ اگر میں نے دیانت داری برتی تو میری کمائی غارت ہوگی۔ وہ خدا کو رازق سمجھنے کی بجائے اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ سیٹ، یہ عہدہ اس کا رازق ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اس چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا جس نے مجبوری کی وجہ سے چوری کی ہوتی تھی۔ ہمیں طے کرنا پڑے گا کہ کیا ہمارا موجودہ نظام یہاں کے باسی کو اس کی بنیادی ضروریات فراہم کر رہا ہے؟ یقیناً، ایسا نہیں ہے۔

ہمارا سسٹم بھی ایسا ہے کہ بعض جگہوں پر لوگ اپنا جائز کام کرانے کیلئے بھی رشوت دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ایمان مضبوط ہوگا تو برائی کے سامنے ڈٹ جانا آسان ہوگا۔ کسی بھی صورت میں برائی کیلئے راستہ نہیں کھلا چھوڑنا چاہیے، کیونکہ برائی کو روکا جائے گا تو برائی رکے گی، ورنہ نہیں۔

وہ تمام سماجی برائیاں جو کرپشن پر جلتی کا کام کر رہی ہیں، وہ چاہے سماجی معیارات کی شکل میں ہوں، پارٹی کی شکل میں ہوں، جہیز کی شکل میں ہوں یا دکھاوے کی شکل میں ہوں، انھیں ختم کرنا پڑے گا۔ حکومت نے جس طرح شادی پر ون ڈش پر عمل درآمد کرا کر ایک اچھا کام کیا، اسی طرح حکومت کو چاہیے کہ جہیز جیسی لعنت کو بھی ختم کرنے کیلئے کوئی ایسا ہی اقدام کرے۔ اگر حکومت یہ کام کر لیتی ہے تو پھر قوم بھی ٹھیک ہونا شروع ہو جائے گی اور کرپشن کے خاتمے میں بھی مدد ملے گی۔

اجتماعی اور انفرادی ذمے داری

جس طرح حکومت کو اپنی سطح پر کرپشن ختم کرنے کیلئے اقدامات کی ضرورت ہے، اسی طرح فردِ واحد کو بھی کرپشن کے خاتمے کیلئے کام کرنا پڑے گا۔ کرپشن کے خلاف آگہی صرف ایک جز ہے، اور ایک جز سے تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ آگہی سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ تربیت ہے۔ تربیت کا کمال یہ ہوتا ہے کہ آدمی غلط قدم اٹھانے سے پہلے سوچتا ہے۔ ہمارے تعلیمی نظام میں تربیت کیلئے سچ کی برکات، دیانت داری میں برکت اور وقت کی پابندی جیسے مضامین ہوا کرتے تھے، لیکن اب سسٹم ایسا بن چکا ہے کہ اس نے تمام مضامین بشمول اخلاقی اقدار کو نمبر لینے تک محدود کر دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دیانت داری کے مضمون میں نمبر تو پورے آجاتے ہیں مگر دیانت داری نہیں آتی۔

تربیت کا ایک موثر طریقہ یہ ہے کہ تمام ہیروز کو پروموٹ کیا جائے۔ ضروری نہیں کہ وہ قومی سطح کے ہی ہیرو ہوں۔ وہ کلاس کا ہیرو بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اسکول کا ہیرو بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کالج کا ہیرو بھی ہو سکتا ہے۔ جس معاشرے میں اچھے لوگوں کو نمایاں کیا

جاتا ہے، اُن کو شاباشی دی جاتی ہے، ان کی تعریف کی جاتی ہے، ان کو عزت دی جاتی ہے، ان کا احترام کیا جاتا ہے تو جب دوسرے لوگ یہ دیکھتے ہیں تو وہ بھی اُن جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہمارے معاشرے کا ستم یہ ہے کہ جو جتنا زیادہ کرپٹ ہے اس کا اتنا ہی زیادہ نام ہے۔ اس کی اتنی ہی شہرت ہے۔ جب کرپٹ لوگوں کو پروموٹ کیا جائے گا تو کرپشن ہی میں اضافہ ہوگا۔ ہم نے نوٹ پر قائداعظمؒ کی تصویر تو لگا دی، لیکن ان کے کردار کو نہیں اپنایا۔

نیکی اور بدی واضح ہیں

غلط کیا ہے اور صحیح کیا ہے، یہ بنیادی معیار ہونا چاہیے۔ جب آدمی لالچ کی سطح پر چلا جاتا ہے تو اس وقت اس کی مت ماری جاچکی ہوتی ہے۔ اس وقت وہ اپنی عقل استعمال کرنے کے قابل نہیں رہتا، بلکہ اپنے لیے اچھائی اور برائی کے معنی خود ہی گھڑ لیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میرے مطابق یہ نیکی ہے، وہ برائی ہے۔ پھر وہ اس نئے قاعدہ اور کلیہ کی بنیاد پر اپنے آپ کو مطمئن کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نیکی وہی ہے جسے میں نیکی سمجھتا ہوں اور برائی وہی ہے جسے میں برائی سمجھتا ہوں۔

نیکی اور برائی کا معیار تو طے شدہ ہے اور وہ یہ کہ نیکی اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے کا نام ہے اور برائی اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کرنا ہے۔ نیکی اور بدی کی من گھڑت تاویلات کے تحت جب وہ کام شروع کرتا ہے تو دراصل وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا اور اسی کے مطابق اپنی زندگی گزارتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھ لیجیے، جتنے لوگ رشوت لیتے ہیں، جتنے لوگ جھوٹ بولتے ہیں، جتنے لوگ ذخیرہ اندوزی کرتے یا مہنگائی کرتے ہیں، ان سب کے پاس اپنی اپنی کرپشن کے بہت ہی مضبوط جواز ہوتے ہیں۔ اگر آپ انھیں اُن کے کرپشن پر ٹوکیں تو وہ ثابت کردیں گے کہ وہ درست کر رہے ہیں۔

آج بوئیے، کل پائیے

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں دیانت داری سے کیا ملے گا۔ بھلا، اندھیرے میں ایک چراغ جلا کر کیا کیا جا سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ پر یقین اور نیک گمان کرنا چاہیے کہ ایک ایک چراغ جلتا ہے تو پورا علاقہ روشن ہوتا ہے۔ باغ میں ہر ہر پھول اپنے تیئں رعنائی بکھیرتا ہے تو باغ مہکتا ہے۔ فی الوقت اگرچہ انھیں دیانت داری کا صلہ ملتا ہوا نظر نہیں آتا تو کوئی بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کی محنت اور خلوص کو ضائع نہیں کرتا۔ نیز، قدرت کے کارخانے میں ہر شے کا ایک وقت ہے۔ نتیجہ فوری نہیں آتا، کچھ وقت لیتا ہے۔ آپ آج جو پھل کھا رہے ہیں، وہ درخت آپ کے دادا یا والد نے لگایا تھا۔ آپ آج دیانت کا جو بیج بوئیں گے، وہ آپ کی نسلوں کو سنوارنے کا کام کرے گا۔ آج کا نیک عمل اگر آپ کو فائدہ نہیں دے رہا تو کوئی بات نہیں، وہ آپ کیلئے صدقہ جاریہ بن جائے گا۔ پھر وہی صدقہ جاریہ آخرت میں نجات کا باعث ہوگا۔

ووٹ کی کرپشن

ہمارے معاشرے میں زیادہ کرپشن کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے حکمران... اگر ان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ڈیڑھ دو سو سال پہلے اُن کے بڑے انگریز کے وفادار تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا تو انعام میں انگریز نے انھیں جائیدادیں عطا کیں۔ آج انھی کی اولادیں ہم پر حکمران ہیں۔ برصغیر کے لوگوں کے مزاج میں حریت نہیں ہے۔ ان میں غلامی کا عنصر پایا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کی اکثریت انھی حکمرانوں کو منتخب کرنے کے بعد انھی کو کرپٹ کہہ رہی ہوتی ہے۔ عوام کو یہ پتا ہونا چاہیے کہ منتخب کرنے کا اختیار ہمارے پاس ہے۔ ہم انھیں ووٹ دیں گے تو یہ منتخب ہوں گے۔ جب تک ان میں یہ شعور نہیں ہوگا کہ ہماری نسلوں کی تقدیر ہمارے ہاتھ میں ہے، وہ اپنے ووٹ کے ذریعے کرپٹ لوگوں ہی کو منتخب کرتے رہیں گے۔ یہ بھی بہت بری کرپشن ہے جو عوام کرتے ہیں۔ اگر یہ کرپشن جاری رہی تو کیا ہماری نسلوں کی تقدیر سنورے گی؟ اس طرح تو جتنے بھی آپریشن ہوتے

رہیں، جتنے بھی اصلاح کے پروجیکٹ بنتے رہیں، ہم اپنے ہاتھوں اپنی نسلوں کی تقدیر کو تباہ کرتے رہیں گے۔



تبدیلی

''تبدیلی قانونِ حیات ہے، اور جو لوگ صرف ماضی اور حال کو دیکھتے رہتے ہیں، وہ یقیناً مستقبل سے محروم رہتے ہیں!''

جان ایف کینیڈی

آج ہر طرف تبدیلی کے نعرے ہیں، معاشرے کو بدلنے کا شور وغوغا ہے۔ لیکن، یہاں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ قدرت کے نظام میں تبدیلی کا طریقہ کار کیا ہے؟ کیوں کہ اگر تبدیلی قوانین فطرت کے مطابق ہوگی تو اس میں قوم اور ملک کا فائدہ ہے، ورنہ نقصان کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔

سوال یہ ہے کہ تبدیلی کی ضرورت کیوں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ تبدیلی نظام فطرت کا خاصہ ہے۔ کائنات میں کسی شے کو قرار نہیں، ہر شے بدل رہی ہے۔ حتیٰ کہ خود انسان جو تبدیل ہو رہا ہے۔ آج سے آٹھ سال پہلے آپ جس گوشت پوست سے بنے تھے، آج آپ کے اندر وہ خلیات نہیں ہیں۔ آج سے آٹھ دس سال بعد آپ کے موجودہ خلیات آپ کے ساتھ نہیں ہوں گے۔

بدلتی دنیا کے تقاضے اور بڑھتے مسائل

ضروریات بدل رہی ہیں تو دنیا بھر کے نظام بھی تبدیل ہو رہے ہیں۔ آج سے سو سال پہلے کی دنیا آج کی دنیا سے یکسر مختلف تھی۔ آج سے سو سال بعد کی دنیا آج کی دنیا سے یکسر مختلف ہوگی۔ لیکن ہم نے فطری تبدیلی کے ساتھ ساتھ خود کو تبدیل نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں وہ مسائل جنم لے چکے ہیں جو اگر درست منصوبہ

بندی کی جاتی تو پیدا ہی نہ ہوتے۔

نوجوانوں میں کنفیوژن

آج کا نوجوان کنفیوژ ہے اور وہ اپنی ذمے داریاں پوری نہیں کر رہا۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک تعلیمی خلا ہے جو کنفیوژن پیدا کر رہا ہے۔ طالب علم سمجھتا ہے کہ رٹا لگانے سے زندگی کامیاب ہوجائے گی اور استاد بھی یقین دلاتا ہے کہ اگر نمبر اچھے آجائیں تو زندگی سنور جائے گی۔ جبکہ عملی زندگی میں نمبروں کا کردار کم اور صلاحیتوں کا کردار بہت زیادہ ہے۔ عملی زندگی میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ صلاحیتیں کتنی منجھی ہوئی ہیں۔ آپ کے اندر سماجی ذہانت (سوشل جینئس) کتنی ہے۔ آپ کو بات چیت کرنے میں کتنی مہارت ہے۔ انٹراپرسنل اسکلز کتنی اچھی ہیں۔ سوفٹ اسکلز کتنی اچھی ہیں۔ جن اساتذہ نے اسٹوڈنٹ کی تربیت کرنی تھی، ان کی بھرتی ہی غلط ہوئی۔ ہزاروں ایسے ٹیچرز بھرتی ہوئے جو تعلیم یافتہ تو ہیں، لیکن تربیت یافتہ نہیں ہیں۔ جو تھوڑے بہت تربیت یافتہ ہیں ان کا مزاج اور میلان تدریس والا نہیں ہے۔ اساتذہ کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو رٹا لگانے کی ترغیب دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں پڑھانا ہی نہیں آتا۔ طریق تدریس جانے بغیر بھی ممکن ہی نہیں کہ پڑھایا جاسکے۔

جارحانہ مزاج

معاشرے میں اس وقت جارحانہ رجحان بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ یہ علامت معاشرے کے بگاڑ کو ظاہر کرتی ہے۔ جب انسان بیمار ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ یہ قوت مدافعت کی کمی کی وجہ سے بیمار ہوا ہے۔ اسی طرح آج معاشرے میں جارحانہ رجحان کی وجہ قوت مدافعت کا کم ہونا ہے۔ اس پر مستزاد، لوگوں کو اپنی بیماری کا شعور ہی نہیں ہے۔ یہ ایک دن میں نہیں ہوا بلکہ اس میں ایک عرصہ لگا ہے۔ اس کی اصلاح بھی چند روزہ پلان کے ذریعے ممکن نہیں، طویل مدتی لائحہ عمل بنا کر اس پر مستقلاً عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

عدم برداشت کا یہ حال ہے کہ اگر اپنی رائے کے خلاف کسی کی رائے سننے کو مل

جائے تو آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ پاکستان دہشت گردی کا شکار ہے۔ لیکن ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں جو لاوے پک رہے ہیں، کیا کبھی اسے ٹھنڈا کرنے کے بارے میں بھی سوچا گیا۔ ہمیں پاکستان کو بچانا ہے اور گہری بنیادوں پر یہ تبھی ممکن ہوگا کہ پاکستان میں ذہنی اور فکری بہتری لائی جائے۔ آج پوری قوم تنقید پر لگی ہوئی ہے۔ کوئی سانحہ ہو، کوئی واقعہ ہو، حتیٰ کہ اگر کوئی ہیرو بھی انتقال کر جائے، وہ چاہے ایدھی صاحب ہوں، امجد صابری ہوں یا وہ جنید جمشید ہوں... فوراً دو طبقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک طبقہ تعریف کرنا شروع کر دیتا ہے تو دوسرا تنقید۔ جس شخص کو معاملات کا قطعی علم نہیں ہوتا وہ بھی اپنی رائے دینا شروع کر دیتا ہے۔

ہمیں اول تو خود اس قسم کی بحثوں سے گریز کرنا چاہیے اور پھر ایسے ''فیس بکی'' دانش وروں سے محفوظ رہنے کی سعی کرنی چاہیے جو کچھ نہیں جانتے، مگر طرم خاں بنے پھرتے ہیں۔ لوگوں نے حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کے ہاتھ میں ہمیشہ سوئی دھاگا دیکھا، قینچی نہیں دیکھی تھی۔ آپؒ سے کسی نے پوچھ لیا کہ باباجی، ہم نے آپ کے ہاتھ میں کبھی قینچی نہیں دیکھی، صرف سوئی دھاگا دیکھا ہے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپؒ نے فرمایا، میں کاٹنے کو پسند نہیں کرتا، میں جوڑنے کو پسند کرتا ہوں۔ آج ہمیں جوڑنے والے لوگ چاہئیں۔

بیج بدلنا پڑے گا

آج ہم اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ بنیادی عقلی قوانین کے بھی قریب نہیں رہے۔ راستہ بدلے بغیر، جڑ تبدیل کیے بغیر، بیج بدلے بغیر... کبھی نتیجہ نہیں بدلا جا سکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ گندم کا بیج بویا جائے اور چاول کی فصل کاٹی جائے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ امرود کا بیج لگایا جائے، لیکن کیلے اتاریں جائیں۔ جو بویا ہے، وہی کاٹنا ہے۔ دنیا اس نتیجے پر پہنچ گئی ہے کہ جس معاشرے میں رول ماڈلز کو پروموٹ کیا جاتا ہے، ہیروز کو پروموٹ کیا جاتا ہے، وہ معاشرہ ترقی بھی کرتا ہے اور کامیاب بھی ہوتا ہے۔ لیکن جس معاشرے میں ہیروز کو پروموٹ نہیں کیا جاتا، وہ بے مہار جانور کی طرف چلنا شروع

کر دیتا ہے۔ پھر اس کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔ پھر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرے میں افراتفری پیدا ہو جاتی ہے جس کا جس طرح منہ ہوتا ہے، وہ اسی طرف چلنا شروع کر دیتا ہے۔

بہترین قوم کا حتمی فارمولا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا، آپ دنیا کی بہترین قوم کیسے بنے؟ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا، ''ایک رسولؐ ہم میں آئے۔ انھوں نے ہم سے محبت کرنا شروع کر دی اور پھر ہمیں بھی ان سے محبت ہوگئی۔ نتیجتاً ایک دن ہم نے مڑ کر دیکھا تو ہمارا شمار دنیا کی بہترین قوموں میں ہونے لگا۔'' وہ محبت جس میں برداشت تھی، جس میں معافی تھی، وہ اصل میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق تھا۔ ہم نے آج اسے بھلا دیا۔ آج عشقِ مصطفیٰؐ صرف نام کا رہ گیا۔ اس کی روح سے ہم محروم ہیں۔ آج قوم آپس میں اتنی تقسیم ہو چکی ہے کہ ہر ایک کی سمتیں بدل گئی ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ ہمارا لیڈر جناحؒ ایک ہے، شاعر ایک ہے، کلمہ ایک ہے، قرآن ایک ہے اور اللہ اور اس کا رسولؐ ایک ہے... پھر تقسیم کا ہے کی؟ ہم نے طے کرنا ہے کہ ہمیں کدھر جانا ہے اور کدھر نہیں جانا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یہ بات واضح کر دی ہے کہ میں نے اس قوم کی حالت نہیں بدلی جس کو اپنی حالت کے بدلنے کی فکر نہیں ہوتی۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''ہدایت میرے اللہ کا بہترین خزانہ ہے۔'' اللہ تعالیٰ اس کو ضرور دیتا ہے جو ہدایت لینا چاہتا ہے۔ اگر تمنا ہی نہیں ہوگی، اگر ترجیح ہی نہیں ہوگی کہ ہم نے اپنے آپ کو اور قوم کو بدلنا ہے تو اس وقت تک اللہ سے رحمت کی امید بھی نہیں رکھی جا سکتی۔

حب الوطنی کی سب سے بڑی دشمن لسانیت، صوبائیت، اور قومیت کی بنیاد پر تقسیم ہے۔ ہمیں پاکستان سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی ہونے کی وجہ سے نہیں ملا تھا بلکہ ہمیں پاکستان مسلمان ہونے کی وجہ سے ملا تھا۔ ہمیں اس تعصب کو اپنی جڑوں سے نکالنا ہے اور جو لوگ اس بنیاد پر ووٹ لے رہے ہیں، انھیں لگام دینی ہے۔

ہمیں خود کو بدلنا ہوگا، کیوں کہ کائنات کی ہر شے بدل رہی ہے۔ لیکن، خدارا، یہ تبدیلی جذباتی وابستگی کی بجائے قوانین فطرت سے ہم آہنگ ہوگی تو ثمر آور ہوگی، ورنہ...

تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی، داستانوں میں



قاسم علی شاہ ۔ ایک تعارف

قاسم علی شاہ بنیادی طور پر ایک استاد ہیں۔ آپ 1998 سے شعبۂ تدریس سے وابستہ ہیں۔ آپ نے 2001 میں قاسم علی شاہ اکیڈمی کی بنیاد رکھی [illegible] تعلیم [illegible] میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ قاسم علی شاہ اکیڈمی کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات کی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی اخلاقی تربیت اور تعمیرِ شخصیت پر بھی خاص توجہ دی جاتی ہے۔ آپ [illegible] کے طور پر [illegible] دے چکے ہیں۔

شاہ صاحب کا اگلا پڑاؤ ٹریننگ اور تربیت ہے کیونکہ ان کا ماننا ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد تربیت ہے اور تربیت کے بغیر تعلیم اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ 2008 سے [illegible] آپ [illegible] ٹریننگ اور موٹیویشن کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ اس ضمن میں آپ ملازمین کی موٹیویشن، [illegible] مینجمنٹ، [illegible] پر قابو، ٹائم مینجمنٹ، لیڈرشپ، اخلاقی اقدار، اہداف حاصل کرنے کی مہارت، [illegible] کارکردگی میں اضافہ، فنی مہارتیں، شخصیت کی تعمیر، [illegible] آگاہی کا حصول جیسے انتہائی اہم موضوعات پر لیکچرز، ورکشاپس، سیمینارز اور سمپوزیم کا باقاعدہ انعقاد کرتے ہیں۔

ملک کے نمایاں تعلیمی ادارے (اسکول، کالج اور یونیورسٹی) جو قاسم علی شاہ صاحب سے استفادہ کر چکے ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور، یونیورسٹی آف دی پنجاب لاہور، یونیورسٹی آف [illegible]، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور، لاہور اسکول آف مینجمنٹ، [illegible] انسٹیٹیوٹ آف [illegible] لاہور، فارمن کرسچن کالج لاہور، نیشنل ٹیکسٹائل یونیورسٹی فیصل آباد، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور، یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب لاہور، پروجیکٹ مینجمنٹ انسٹیٹیوٹ لاہور، اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور، یونیورسٹی آف [illegible] فیصل آباد، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی خضدار بلوچستان، [illegible] کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی [illegible] ل سسٹم لاہور، فاؤنڈیشن یونیورسٹی راولپنڈی، لاہور کالج فار وومن یونیورسٹی لاہور، [illegible] اسکول لاہور، [illegible] سرگودھا، ڈی ایم جی اسکول آف لیڈرشپ کراچی، [illegible] اسکول سسٹم فیصل آباد، یونیورسٹی آف گجرات، [illegible] گجرات، [illegible] کالج مریدوالا، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ٹیکسلا۔

سرکاری اور کارپوریٹ اداروں میں آپ کی ٹریننگ کو وقت کی اہم ترین ضرورت سمجھا جاتا ہے۔ قاسم علی شاہ صاحب ملک کے درج ذیل اداروں سے وابستہ اسٹاف کو ٹریننگ کرا چکے ہیں: اسکول آف [illegible] اسٹاف ڈویلپمنٹ لاہور، مینجمنٹ پروفیشنل ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ لاہور، [illegible] ٹریننگ کالج، پولیس ٹریننگ کالج چوہنگ، پنجاب جوڈیشل اکیڈمی لاہور، [illegible] کالج [illegible] لاہور، [illegible] پاکستان، [illegible] (SIMENS) [illegible] پاکستان [illegible] فاؤنڈیشن [illegible] آزاد کشمیر۔

اپنی مہارت اور تجربے کے باعث آپ عصرِ حاضر کے مقبول ترین ٹرینر ہیں۔ ملک کے مرکزی شہروں کے علاوہ دور دراز علاقوں سے پاکستانی جوق در جوق شاہ صاحب کے [illegible] پروگراموں میں شرکت کرتے ہیں۔ [illegible] عوامی دلچسپی کے باعث شرکا کو بعض اوقات ایڈوانس بکنگ [illegible] انکار کرنا پڑتا ہے۔ اندرونِ ملک کے ساتھ ساتھ بیرونِ ملک بھی آپ کے پروگراموں کی طلب روز بروز بڑھ رہی ہے۔ [illegible] سیشن کر کے لوٹے ہیں۔

ورکشاپس کے علاوہ ایف ایم ریڈیوز اور قومی سطح کے ٹی وی چینلز سے بھی اپنے [illegible] پروگراموں کے ذریعے تشنگانِ علم کی پیاس بجھا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سوشل میڈیا پر آپ اس وقت پاکستان کے سب سے زیادہ [illegible] ہونے والے موٹیویشنل اسپیکر ہیں جہاں روزانہ کی بنیاد پر دنیا بھر سے لاکھوں لوگ آپ [illegible] سے مستفید ہو رہے ہیں۔ اب تک آپ کو پی ٹی وی، [illegible] ٹی وی، [illegible] ٹی وی، [illegible] نیوز، 42 [illegible] نیوز، [illegible] ٹی وی، پیغام ٹی وی، [illegible] ٹی وی اور FM 100، FM 98.6، FM 95، FM 101 پر [illegible] جا چکا ہے۔ یہ سلسلہ جاری ہے۔

قاسم علی شاہ صاحب کی زیرِ سرپرستی اپریل 2017 میں قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس فاؤنڈیشن کے ذریعے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے کامیاب [illegible] ایک [illegible] کے تحت اپنے تجربات اور مہارتیں نوجوان نسل کو منتقل کر سکیں گے۔

[illegible] آپ کی [illegible] کتاب ہے۔ اس سے قبل قاسم علی شاہ [illegible] کے ساتھ ساتھ آپ کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

[illegible]

قاسم علی شاہ صاحب کے بارے میں مزید [illegible] کیجیے

www.QasimAliShah.com

www.facebook.com/qasim.ali.shah

Cell: 0321-8831424

دار الشعور
042-37239138 [illegible]
info@[illegible]
www.[illegible]
[illegible]